Scanned by CamScanner

سوفی کی دنیا

مصنف:
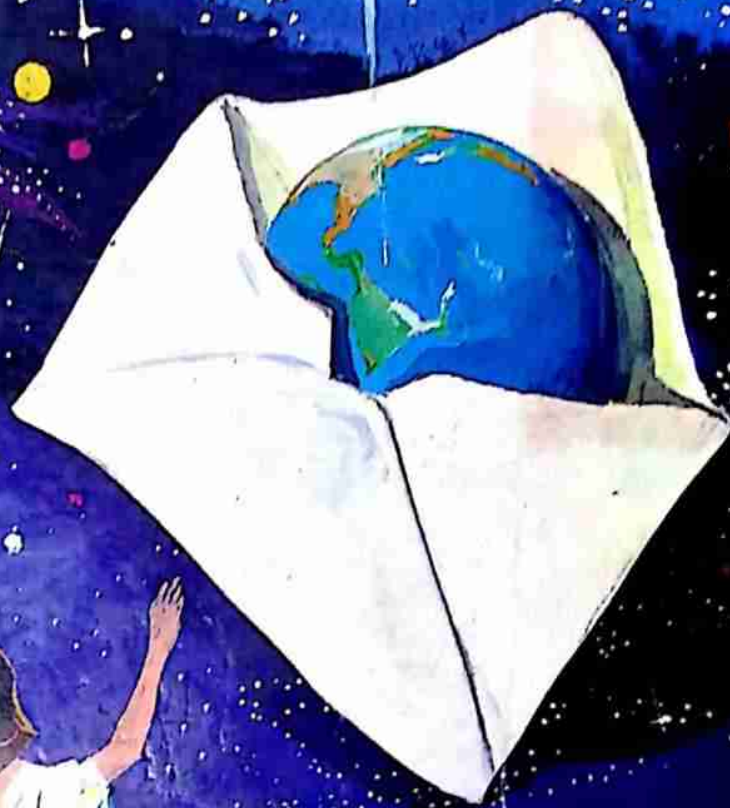
جوسٹین گارڈر

ترجمہ:

شاہد حمید

اردو سائنس بورڈ

299 - اپر مال، لاہور

The translator and the publisher are extremely thankful to Jostein Gaarder and his literary editor/agent Mia Bull-Gundersen for granting permission to publish this translation.

"Knowledge Comes but wisdom lingers."

پیش لفظ

دو بچے تھے، بلا کے شریر۔ پڑھنے لکھنے سے جان جاتی تھی۔ ہر وقت کھیل کود میں مست۔ والدین الگ تنگ تھے، استادوں کا ناطقہ الگ بند تھا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ ان کا کیا کیا جائے۔ آخر ایک آدمی نے ان کے والدین سے کہا: "یہ کام میرے سپرد کیجیے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ان جیسے کھلنڈروں کو کیسے تعلیم دی جاتی ہے۔"

والدین کے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا؟ جھٹ پٹ اپنے بچے اس شخص کے سپرد کیے اور خود فارغ ہو گئے۔ نئے اتالیق نے کتابیں کھلوانے کے بجائے گپ شپ شروع کر دی، کوئی بات آسمان کی، کوئی زمین کی۔ بیچ بیچ میں چالاکی سے کوئی نکتہ بھی بیان کر جاتا۔ بچے بھی اتنے بھولے نہیں تھے۔ دو تین دن گزرنے کے بعد ایک نے دوسرے کے کان میں کہا: "خبردار، یہ بڑا استاد ہے۔ کہیں کھیل کھیل میں ہمیں کچھ پڑھا نہ دے۔"

سو یہ کتاب جو آپ کی نظر سے گزرے گی، اسے بھی ایک طرح کا کھیل ہی سمجھیں۔ بڑی ہنرمندی سے کھیلا گیا کھیل۔ اول تا آخر کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی اور جو کچھ اس کے مطالعے سے حاصل ہوگا، وہ بیش بہا ہوگا۔ دریا کوزے میں بند کرنا سنتے آئے تھے۔ یہی عالم یہاں ہے اور مزہ یہ ہے کہ کوزہ بھی

مصری کا ہے۔

اس کتاب کا مصنف جوسٹین گارڈر ناروے کا رہنے والا ہے۔ ناول نگاری کے کوچے میں قدم رکھنے سے پہلے وہ گیارہ سال تک ایک ہائی سکول میں فلسفہ پڑھاتا رہا تھا۔ فلسفہ پڑھانا اور وہ بھی ہائی سکول کے طلبہ کو۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ایک تو خود پڑھانے والے کو فلسفے سے دلی لگاؤ ہونا چاہیے تاکہ موضوع کی غرض و غایت اور تمام باریکیاں اس کی نظر میں ہوں۔ دوسرے اپنے علم کو دوسروں تک اس طرح منتقل کرنے پر قادر ہو کہ یہ نکتے ان کی سمجھ میں آجائیں۔ یہ بہت دشوار ہے۔ اس کے لیے بیان کی شگفتگی ضروری ہے۔ فلسفہ اگر ٹھیک طرح اور دل چسپ انداز میں نہ پڑھایا جائے تو طالب علم بیزار اور متنفر ہوجائیں گے۔ گارڈر نے جس آسان اور عام فہم پیرائے میں دقیق فلسفیانہ مباحث کو عام قارئین تک پہنچایا ہے، اس سے ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ بہت اچھا استاد رہا ہوگا۔

بہرحال، "سوفی کی دنیا" (Sophie's World) کے نام سے جو ناول اس نے تحریر کیا، وہ ناروے میں بہت مقبول ہوا۔ ابھی اس کا ترجمہ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا چرچا دنیا بھر میں ہونے لگا (ناروی زبان میں یہ پہلی بار 1991 میں شائع ہوا اور اسی سال میں نے لندن کے سنڈے ٹائمز میں اس پر تبصرہ پڑھا تھا)۔ اندازہ ہے کہ اب تک درجنوں زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ (ان میں چینی، ترکی، کوریائی اور تھائی زبانیں بھی شامل ہیں۔ تھائی ترجمے کی افتتاحی تقریب میں تو پچھلے سال ناروے کی وزیراعظم بنفس نفیس شریک ہوئی تھیں)۔ یہی نہیں، اکثر ملکوں میں اس کا ترجمہ بہترین فروخت ہونے والی کتابوں کی فہرست میں شامل ہے۔ (انگریزی ترجمہ پہلے 1994 میں امریکا میں اور پھر 1995 میں

انگلستان میں شائع ہوا ۔ صرف انگلستان میں جنوری 1995 سے جولائی 1995 تک مجلد صورت میں اس کے بارہ ایڈیشن چھپ چکے تھے ۔ 1996 میں سستا ایڈیشن منظر عام پر آیا اور ابھی تک بہترین بکنے والی کتابوں کی فہرست میں شامل ہے) ۔ ایسی سعادت کسی کتاب کے حصے میں بلاوجہ نہیں آتی ۔

فلسفے نے روز اول سے بنیادی سوالات سے سروکار رکھا ہے ۔ ہم کون ہیں ؟ جس دنیا یا کائنات میں ہم رہتے ہیں ، کیسے بنی ؟ اسے کس نے بنایا ؟ خیروشر اور جبر و اختیار کے معنی کیا ہیں ؟ ہم اپنی ذات کو ، دوسروں کو ، کون و مکاں کو کس طرح بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں ؟ یا سمجھ بھی سکتے ہیں یا نہیں ؟ یہ تمام اور اس قسم کے متعدد دیگر سوالات فلسفے میں بار بار نئے نئے زاویوں سے سر اٹھاتے رہتے ہیں اور ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں ۔

"سوفی کی دنیا" میں افسانوی انداز میں مغربی فلسفے کے تمام ادوار کا کامیابی سے احاطہ کیا گیا ہے ۔ ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جہاں اسطورہ ، فلسفہ ، تاریخ ، سائنس ، سب آپس میں گھلے ملے ہوئے تھے ۔ رفتہ رفتہ فلسفے اور سائنس کے خدوخال واضح ہونا شروع ہوگئے ۔ کتاب کا دوسرا سرا ہمیں بیسویں صدی تک لے آتا ہے جہاں تان اس "بڑے دھماکے" یا "انفجار عظیم" (Big Bang) پر ٹوٹتی ہے جس کے ساتھ خیال ہے ہماری کائنات کا آغاز ہوا ۔ درمیان میں ان تمام فلسفیوں (بشمول سائنس دانوں) اور فلسفیانہ دبستانوں کا ذکر ہے جو اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان صفحات میں آپ کی ملاقات بڑے دلچسپ اور انوکھے انداز سے دیموکری تیس ، سقراط ، افلاطون ، ارسطو ، دیکارت ، سپینوزا ، گلیلیو ، نیوٹن ، لوک ، بارکلی ، ہیوم ، کانٹ ، ہیگل ، کیرکیگارڈ ، مارکس ، ڈارون ، مارکس اور سارتر جیسی شخصیات سے ہوگی ۔ فلسفے اور سائنس کے علاوہ ادب

کے بے شمار دلچسپ گوشوں تک رسائی کا موقع بھی ملے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک بنیادی سوالات پوچھے نہ جائیں اور صدق دلی سے ان کا جواب دینے کی کوشش نہ کی جائے، ہم آگے نہیں بڑھ سکتے ۔ (راقم الحروف کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ مسلمان ترقی کی دوڑ میں اس لیے پیچھے رہ گئے ہیں کیونکہ انہوں نے فلسفہ پڑھنا چھوڑ دیا ہے ۔ آخر فلسفہ ہی تو ہمیں بتاتا ہے کہ سوچنا کیوں ضروری ہے اور سوچا کس طرح جاتا ہے ۔) اگر یہ کتاب آپ کو فلسفے کے مطالعے کی طرف مائل کر سکے تو بڑی بات ہو گی ۔ اس کتاب کے لکھنے اور ترجمہ کرنے کا مقصد آپ پر دوسروں کے نظریات تھوپنا نہیں بلکہ آپ کو یہ تحریک دینا ہے کہ آپ کے گردوپیش جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے متعلق خود غور و فکر کریں اور خود اپنے نتائج اخذ کریں ۔ اگر یہ صورت حال پیدا ہو جائے، تو شاید ہم نہ صرف خود اپنی زندگی بہتر بنا سکیں گے بلکہ بہتر زندگی گزارنے کے لیے دوسروں کی بھی مدد کر سکیں گے ۔

ویسے اگر آپ کو فلسفے سے چڑ ہو تو آپ اس کتاب کو محض ناول کے طور پر بھی پڑھ اور اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔ اس میں صرف فلسفہ ہی انوکھے اور دلچسپ انداز میں سمجھایا نہیں گیا، بلکہ واقعات کا تانا بانا کچھ انداز سے بنا گیا ہے کہ اس میں اونچے درجے کی سراغ رسانی کی کہانی کا لطف بھی شامل ہو گیا ہے ۔ کہانی ایک پندرہ سالہ لڑکی کے گرد گھومتی ہے ۔ لڑکی کا نام سوفی ہے ۔ (مصنف نے یہ نام ارادتاً منتخب کیا ہے ۔ یونانی زبان میں sophie کے معنی عقل و خرد ہیں) ۔ ایک روز جب وہ سکول سے گھر لوٹتی ہے، اسے اپنے ڈاک ڈبے میں ایک لفافہ ملتا ہے ۔ اس کا اجنبی طرز تحریر اسے چکرا دیتا ہے ۔ وہ جھٹ پٹ لفافہ چاک کرتی ہے اور کاغذ باہر نکالتی ہے ۔ اس پر دو سوال درج ہیں:

تم کون ہو ؟ یہ دنیا کہاں سے آئی ہے ؟

یہیں سے سوفی کا دنیائے فلسفہ کا سفر شروع ہو جاتا ہے اور اس سفر میں اس کی رہنمائی کا فریضہ ایک پراسرار معلم سرانجام دیتا ہے ۔ یہ معلم کون ہے ، لاکھ کوشش کے باوجود سوفی اس کا اتا پتا معلوم کرنے میں ناکام رہتی ہے اور معلم خود بھی اپنی شناخت چھپانے پر مصر ہے ۔ لیکن معلم کی شناخت ہی سوفی کا واحد مسئلہ نہیں ۔ اسے آئے روز پوسٹ کارڈ موصول ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کارڈوں کی مخاطب وہ خود نہیں ، بلکہ ہلڈے نام کی کوئی لڑکی ہے ۔ پھر یہ اسے کیوں بھیجے جا رہے ہیں ؟ انہیں کون بھیج رہا ہے ؟ کیوں بھیج رہا ہے ؟ یہی نہیں ، کسی پراسرار طریقے سے اس ہلڈے کی اشیا اس کی اپنی اشیا میں خلط ملط ہوتی رہتی ہیں ، کیوں ؟ کیسے ؟ بے چاری سوفی سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی رہتی ہے ۔ اسے تو یہ تک معلوم نہیں کہ ہلڈے کون ہے ۔ ہلڈے کو تو چھوڑیں ، وہ تو یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ خود کون ہے ۔ ان تمام سوالوں کو حل کرنے کے لیے سوفی اپنا فلسفے کا نیا علم استعمال کرتی ہے لیکن اس پر جو حقیقت منکشف ہوتی ہے ، وہ اتنی عجیب و غریب ہے کہ اس نے شاید اس کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا ۔ اور یہاں حقیقی اور خیالی دونوں دنیائیں آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں ۔

اس کتاب کے ترجمے کے دوران میں مجھے جن دوستوں اور کرم فرماؤں کا تعاون حاصل رہا ، ان میں حسب معمول محمد سلیم الرحمن سرفہرست ہیں ۔ یونانی ناموں کے تلفظ سے لے کر مختلف شاعروں کی نظموں کے ترجموں ، بعض اصطلاحوں اور عبارتوں کی تفہیم اور پیش لفظ کی ترتیب تک وہ بڑے خلوص اور محبت سے میری رہنمائی کرتے رہے ۔ میں محترمہ عطیہ سید کا ، جو

افسانے ہی نہیں لکھتیں بلکہ لاہور کالج فار ویمن میں فلسفہ بھی پڑھاتی ہیں ، ممنون ہوں کہ انہوں نے مسودے کے کافی حصے کا مطالعہ کیا اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا ۔ انتظار حسین ، ڈاکٹر سہیل احمد خاں ، خالد احمد (مدیر " آج کل ") ، زاہد ڈار ، مسعود اشعر ، اکرام اللہ اور ڈاکٹر احسن اختر نے بھی بعض باتیں سمجھائیں ۔ ان سب کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے ۔

اردو میں اصطلاحات کی منتقلی خاصا مشکل کام ہے ۔ کسی مرکزی ادارے کے نہ ہونے کے سبب ہر شخص اپنے ہی ترجمے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں ایک ایک اصطلاح کے کئی کئی ترجمے وجود میں آگئے ہیں ۔ میں نے بیشتر اصطلاحات کے تراجم کے لیے اردو سائنس بورڈ لاہور کی شائع کردہ " فرہنگ اصطلاحات " پر انحصار کیا ہے ۔ جہاں مجھے اختلاف ہوا یا جن اصطلاحات کے ترجمے مل نہیں سکے ، میں نے خود بھی گھڑنے کی جسارت کی ہے ۔ تاہم قارئین کی سہولت کے لیے میں نے تقریباً تمام اصطلاحات کے انگریزی مترادفات بھی ساتھ ساتھ درج کر دیے ہیں تاکہ ابہام کی کوئی گنجائش نہ رہے ۔

آخر میں مجھے اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل جناب امجد اسلام امجد اور محمد اکرام چغتائی اور فضل قادر فضلی کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ ان اصحاب کی تحریک اور تعاون سے میں یہ ترجمہ مکمل کر سکا اور اسے چھپوا سکا ۔

اب اسے کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے ۔

مترجم

ترتیب

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

1۔ باغ عدن

* * *

... کسی نہ کسی مقام پر پہنچ کر عدم سے کچھ نہ کچھ تو وجود میں آیا ہو گا ...

سوفی امنڈسین سکول سے گھر آرہی تھی ۔ اس نے اپنی مسافت کا پہلا حصہ جوآنا کی معیت میں طے کیا تھا ۔ وہ مشینی آدمیوں (Robots) کے متعلق بحث کرتی آرہی تھیں ۔ جوآنا کا خیال تھا کہ انسانی دماغ ترقی یافتہ کمپیوٹر کی مانند ہے ۔سوفی کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اس سے متفق ہے ۔یقیناً انسان فولادی اوزار سے بڑھ کر چیز ہو گا؟

جب وہ سپر مارکیٹ پہنچیں ' وہ اپنی اپنی راہ ہولیں ۔سوفی قصبے کی ایک نواحی بستی کے بالکل آخری سرے پر رہتی تھی اور اس کا گھر جوآنا کی نسبت سکول سے دگنا دور تھا ۔ اس کے باغ کے آگے مزید کوئی مکان نہیں تھا ۔یوں لگتا تھا جیسے اس کا گھر دنیا کے آخری کونے پر واقع ہو ۔یہاں سے آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا ۔

وہ موڑ مڑی اور کلوور کلوز (Clover Close) (1) میں داخل ہوگئی ۔ اختتام پر سڑک اچانک گھوم جاتی تھی ۔ اسے کپتان کا موڑ (Captain's Bend) کہتے تھے ۔ ہفتے اتوار کے ماسوا ادھر لوگ شاذ ہی آیا کرتے تھے ۔

شروع مئی کے دن تھے ۔بعض باغوں میں پھلوں کے درختوں کے ارد گرد ڈیفوڈل (daffodil) کے پھولوں کے جھنڈوں نے حصار بنا رکھا تھا ۔ برچ (birch) کے

درختوں پر پہلے ہی زردی مائل سبز پتیاں اگنا شروع ہو گئی تھیں۔

یہ کتنی غیر معمولی بات ہے کہ سال کے اس حصے میں ہر چیز پر پرزے نکالنا شروع کر دیتی ہے۔ آخر وہ کیا چیز ہے کہ جونہی موسم قدرے گرم ہونے لگتا ہے اور برف کے آخری آثار معدوم ہونے لگتے ہیں، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اگا دیتی ہے؟

سوفی نے اپنے باغ کا گیٹ کھولا اور ڈاک ڈبے میں جھانک کر دیکھا۔ حسب معمول اس میں غیر مطلوب اشتہاری مواد کی بھرمار تھی۔ چند بڑے سائز کے لفافے اس کی امی کے نام تھے۔ اس نے اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں سکول کا کام کرنے سے پہلے ان اشیا کو باورچی خانے کی میز پر پھینکنا تھا۔

کبھی کبھار بینک سے اس کے باپ کے نام چند خطوط آجاتے تھے، لیکن وہ کوئی عام قسم کا باپ تو تھا نہیں۔ سوفی کا باپ ایک بہت بڑے آئل ٹینکر کا کپتان تھا اور وہ سال کا بیشتر حصہ گھر سے غیر حاضر رہتا تھا۔ جب کبھی وہ چند ہفتوں کے لیے واپس آتا، وہ ادھر ادھر تبدیلیوں میں مصروف ہو جاتا اور گھر کو سوفی اور اس کی امی کے لیے مزید آرام دہ اور نفیس بنا دیتا۔ لیکن جب وہ سمندر پر ہوتا، یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کہیں دور، بہت دور، چلا گیا ہے۔

ڈاک ڈبے میں صرف ایک خط تھا ـــــ اور یہ سوفی کے نام تھا۔ سفید لفافے پر بس "سوفی امنڈسین، نمبر 3 کلوور کلوز" تحریر تھا۔ اس سے قطعاً یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ اس پر ڈاک کی ٹکٹ بھی نہیں تھی۔

جونہی سوفی نے اپنے پیچھے گیٹ بند کیا، اس نے لفافہ کھول لیا۔ اس میں کاغذ کا صرف ایک پرزہ تھا اور وہ لفافے سے بڑا نہیں تھا۔ اس پر تحریر تھا: تم کون ہو؟

ہاتھ سے لکھے ہوئے ان تین الفاظ کے ماسوا، جن کے آخر میں بڑا سا سوالیہ نشان لگا ہوا تھا، اور کچھ نہیں تھا۔

اس نے دوبارہ لفافے کو غور سے دیکھا۔ خط صریحاً اسی کے نام تھا۔ یہ ڈاک ڈبے میں کس نے ڈالا ہو گا؟

سوفی عجلت سے سرخ اینٹوں کے مکان میں داخل ہو گئی۔ حسب معمول اس کی بلی چھتی چھپاتی جھاڑیوں سے برآمد ہوئی، سیڑھیوں پر کودی اور اس کے دروازہ بند کرنے سے پہلے اندر گھس آئی۔

جب کبھی سوفی کی ماں کا مزاج برہم ہوتا ' وہ کہتی : "یہ مکان تھوڑے ہی ہے ' جنگلی جانوروں کا باڑا ہے ۔ "باڑے جانوروں کے لیے بنائے جاتے ہیں ۔یقیناً سوفی نے بھی ایک باڑا بنا لیا تھا اور اپنی اس کارکردگی پر بہت خوش تھی ۔ اس نے اپنے اس باڑے کا آغاز تین سنہری مچھلیوں ـــــ گولڈ ٹوپ 'ریڈ رائڈنگ ہڈ اور بلیک جیک سے کیا تھا ۔ اس کے بعد اسے دو آسٹریلوی طوطے ' جن کے نام سمٹ (Smitt) اور سمول (Smule) تھے ' پھر ایک کچھوا ' گوبند ' اور آخر میں ایک بلی مل گئی ۔بلی کے سفید جسم پر نارنجی دھاریاں تھیں اور اس کا نام شیری کان (Sherikan) تھا ۔

سوفی نے اپنا بستہ فرش کے اوپر لٹکا دیا اور شیری کان کے سامنے بلیوں کو غذا کھلانے کا پیالہ رکھ دیا ۔ پھر وہ باورچی خانے کے سٹول پر بیٹھ گئی ۔پراسرار خط اس کے ہاتھ میں تھا ۔

تم کون ہو ؟

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا ۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ سوفی امنڈسین ہے ' لیکن وہ کون ہے ؟اس نے واقعی ابھی تک یہ معلوم کرنے کا تکلف نہیں کیا تھا ۔

اگر اس کا کوئی اور نام ' مثلاً این کنٹسن (Knutsen) ' ہوتا ' پھر کیا فرق پڑتا؟ کیا وہ کوئی اور شخص ہوتی ؟

اسے اچانک یاد آیا کہ اس کا باپ پہلے اس کا نام للے مور رکھنا چاہتا تھا ۔سوفی نے تصور کرنے کی کوشش کی کہ وہ للے مور کی حیثیت سے لوگوں سے ہاتھ ملا رہی اور اپنا تعارف کرانے کی کوشش کر رہی ہے ' لیکن بات جچی نہیں بلکہ غلط معلوم ہو رہی تھی ۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنا نہیں ' کسی اور کا تعارف کرا رہی ہو ۔

وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی اور عجیب و غریب خط پکڑے غسل خانے کی طرف چل پڑی ۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی اور ٹکٹکی باندھ کر اپنی ہی آنکھوں میں جھانکنے لگی ۔

"میں سوفی امنڈسین ہوں ۔ "اس نے کہا ۔

آئینے میں جو لڑکی تھی ' اس نے ردعمل کے طور پر اتنا بھی نہ کیا کہ پلک ہی جھپکا دیتی ۔ وہ تو عین مین وہی کر رہی تھی جو سوفی کر رہی تھی ۔سوفی نے برق رفتاری سے گھوم کر اپنے عکس کو مات دینے کی کوشش کی ' لیکن دوسری لڑکی نے کوئی ڈھیل نہ دکھائی ' وہ بھی اتنی ہی تیز تھی جتنی کہ خود سوفی ۔

"تم کون ہو؟" سوفی نے پوچھا۔
اسے اس کا بھی کوئی جواب نہ ملا بلکہ وقتی طور پر وہ اتنا بوکھلا گئی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سوال اس نے پوچھا تھا یا اس کے عکس نے۔
سوفی نے آئینے میں نظر آنے والی ناک اپنی انگشت شہادت سے دبائی اور کہا:
"تم میں ہو۔"
سوفی کو اپنی بات کا کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے جملہ الٹا کر دیا اور کہا: "میں تم ہوں۔"
سوفی اکثر اپنی صورت پر غیر مطمئن رہتی تھی۔ اسے بار بار بتایا جاتا تھا کہ اس کی آنکھیں بادام کی شکل کی ہیں اور خوبصورت ہیں، لیکن لوگ غالباً یہ بات اس لیے کہتے تھے کیونکہ اس کی ناک بے حد چھوٹی اور اس کا دہانہ کچھ زیادہ ہی بڑا تھا۔ اور اس کے کان اس کی آنکھوں کے بے حد قریب تھے۔ بدترین بات یہ تھی کہ اس کے بال گھنگریالے نہیں بلکہ سیدھے تھے۔ انہیں سنبھالنا بے حد مشکل کام تھا۔ بعض اوقات اس کا باپ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا، انہیں سہلاتا اور کلاد دبوسی (2) کی ایک دھن کی نقل میں اسے "زرد زلفوں والی دوشیزہ" کہتا۔ لیکن اس کے باپ کو کیا فرق پڑتا تھا کیونکہ سیدھے سیاہ بالوں کے ساتھ رہنے کی سزا اسے تو نہیں ملی تھی۔ اس نے بالوں میں تبدیلی کے لیے بہتیرے پاپڑ بیلے، طرح طرح کے gel (3) اور mousse (4) استعمال کئے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، بال سیدھے تھے اور سیدھے ہی رہے۔ بعض اوقات اس کے دل میں خیال آتا کہ وہ شاید اس لیے اتنی بدصورت ہے کہ غالباً پیدائش کے وقت اس کی شکل مسخ تھی۔ اس کی ماں ہمیشہ یہی کہتی رہتی تھی کہ جب اس کا دردِ زہ شروع ہوا تھا، اسے سخت تکلیف اٹھانا پڑی تھی۔ لیکن آپ کی شکل کیسی ہے، کیا اس کا واقعی دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ کی پیدائش پر آپ کی ماں کو کتنی تکلیف اٹھانا پڑی تھی؟

اور کیا یہ بات عجیب نہیں کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ کون ہے؟ اور کیا یہ بات نامعقول نہیں کہ اسے یہ اختیار ہی نہ دیا گیا کہ وہ یہ خود فیصلہ کرسکتی کہ وہ کس قسم کی شکل پسند کرے گی؟ اس کی شکل تو بس اس پر ٹھونس دی گئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کا انتخاب تو خود کرسکتی ہے لیکن اس نے اپنا انتخاب یقیناً خود نہیں کیا تھا۔ اس نے تو انسان بننا بھی خود منتخب نہیں کیا تھا۔
انسان کیا ہے؟

سوفی نے آئینے میں لڑکی کو دوبارہ غور سے دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے اوپر جانا اور سکول سے حیاتیات کا جو کام ملا ہے، اسے کرنا چاہیے۔" اس نے تقریباً معذرت خواہانہ انداز سے کہا۔ جب وہ غلام گردش میں پہنچی، اس نے سوچا۔ "نہیں، میرا خیال ہے کہ میں باغ میں جانا پسند کروں گی۔"

"مانو! مانو! مانو!"

سوفی نے بلی کو باہر بھگا دیا اور اس کے نکل جانے پر باہر کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر دیا۔

جب وہ پراسرار خط ہاتھ میں پکڑے بجری بچھی روش پر کھڑی تھی، عجیب ترین احساس اس پر غالب آگیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ کوئی گڑیا ہے جس میں جادو کی چھڑی ہلا کر روح پھونک دی گئی ہو۔

کیا یہ امر غیر معمولی نہیں ہے کہ وہ اس وقت دنیا میں موجود ہے اور حیرت انگیز مہم جوئی کے سلسلے میں ادھر ادھر بے مقصد گھوم رہی ہے؟

شیری کان ہلکے پھلکے انداز سے بجری کے اوپر چھلانگ لگاتی اور پھسلتی پھسلتی گھنی پھل دار جھاڑیوں میں غائب ہوگئی۔ وہ ایک جیتی جاگتی بلی تھی جس کے ہموار، چکنے اور چمکتے دمکتے جسم میں مونچھوں سے لے کر لہراتی بل کھاتی دم کے آخری سرے تک اتنی قوت بھری ہوئی تھی کہ اس سے نچلا بیٹھا ہی نہیں جاتا تھا۔ یہ بھی یہاں باغ میں موجود تھی لیکن اسے اپنی ذات کا اس طرح کا کوئی شعور نہیں تھا جس طرح کہ سوفی کو تھا۔

جب سوفی یہ سوچنے لگی کہ وہ زندہ ہے، اسے احساس ہونے لگا کہ وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہے گی۔ "میں آج یہاں دنیا میں موجود ہوں" اس نے سوچا "لیکن ایک دن آئے گا جب میں یہاں نہیں ہوں گی۔"

"کیا موت کے بعد کوئی زندگی ہے؟" یہ ایک اور سوال تھا جس کے متعلق بلی خوش قسمتی سے آگاہ نہیں تھی۔

سوفی کی دادی کو انتقال کئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ پہلے چھ ماہ تو سوفی کو ہر روز اس کی یاد شدت سے ستاتی رہی۔ یہ کتنی ناانصافی تھی کہ زندگی کو ختم ہونا پڑا! سوفی بجری کی روش پر کھڑی سوچتی رہی۔ اس نے زندہ ہونے کے متعلق کچھ

زیادہ ہی شدت کے ساتھ سوچنے کی کوشش کی تاکہ وہ یہ بھول سکے کہ وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہے گی ۔ لیکن یہ ناممکن تھا ۔ جونہی وہ اب زندہ ہونے کے تصور پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ' مرنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں وارد ہو جاتا ۔ معکوس طریقے سے سوچنے کا نتیجہ بھی یہی برآمد ہوا : صرف پوری شدت سے یہ محسوس کرنے کے بعد کہ اس نے ایک روز مرجانا ہے ' وہ اس حقیقت کی ستائش کر سکے گی کہ زندہ ہونا کتنی بڑی نعمت ہے ۔ یہ بالکل سکے کے دو رخوں کی مانند تھا جنہیں وہ بار بار الٹ پلٹ رہی تھی ۔ اور سکے کا ایک رخ جتنا زیادہ بڑا اور واضح تر نظر آتا ' دوسرا رخ بھی اتنا ہی زیادہ بڑا اور واضح تر دکھائی دینے لگتا ۔

" آدمی کو اس بات کا تجربہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ زندہ ہے جب تک اسے یہ احساس نہ ہو کہ اسے مرنا بھی ہے ۔ " اس نے سوچا ۔ " لیکن جب تک آدمی یہ نہ سوچے کہ زندہ ہونا کتنا ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز امر ہے ' اس کے لیے یہ محسوس کرنا ناممکن ہے کہ اسے ایک دن مرنا ہے ۔ "

سوفی کو یاد آیا کہ دادی اماں نے ایک روز کچھ اسی قسم کی بات کہی تھی جب ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ وہ بیمار ہے ۔ " مجھے آج تک احساس ہی نہ ہو سکا کہ زندگی کتنی پرلطف اور بیش بہا ہے ۔ " اس نے کہا تھا ۔

کیا یہ المیہ نہیں کہ لوگوں کو یہ سمجھنے کے لیے کہ زندہ رہنا کتنا بڑا عطیہ ہے ' بیمار ہونا پڑتا ہے ؟ یا پھر انہیں ڈاک ڈبے میں کوئی پراسرار خط موصول کرنا پڑتا ہے !

شاید اسے جانا اور معلوم کرنا چاہیے کہ کہیں مزید خطوط تو نہیں آ گئے ۔ سوفی بھاگم بھاگ گیٹ کی طرف گئی اور ڈاک ڈبے کے اندر جھانکنے لگی ۔ وہ یہ دیکھ کر سناٹے میں آ گئی کہ وہاں ایک اور سفید لفافہ پڑا تھا جو پہلے لفافے کے عین مشابہ تھا ۔ لیکن اسے پختہ یقین تھا کہ جب اس نے پہلا لفافہ نکالا تھا ڈاک ڈبا بالکل خالی تھا ! اس لفافے پر بھی اس کا نام تحریر تھا ۔ اس نے لفافہ پھاڑا اور ایک رقعہ باہر نکالا جو جسامت میں پہلے رقعے کے برابر تھا ۔

دنیا کہاں سے آتی ہے ؟ اس پر لکھا ہوا تھا ۔

" مجھے معلوم نہیں ۔ " سوفی نے سوچا ۔ " یقیناً کسی کو بھی درحقیقت معلوم نہیں ۔ اور پھر بھی ـــــ " اس کا خیال تھا کہ یہ مناسب سوال ہے ۔ اپنی زندگی میں پہلی بار سوفی کو احساس ہوا کہ آدمی کو کم از کم اتنا دریافت تو کرنا چاہیے کہ دنیا آئی

کہاں سے ہے ورنہ پھر اس میں رہنا درست نہیں ہے۔

پراسرار خطوط نے سوفی کو چکرا دیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا سر لٹو کی طرح گھوم رہا ہو۔ اس نے اپنے خفیہ ٹھکانے میں جانے اور وہاں بیٹھنے کا فیصلہ کرلیا۔

سوفی کا یہ ٹھکانا چھپنے کی انتہائی خفیہ جگہ تھی۔ یہاں وہ تب آتی تھی جب یا تو غصہ اس کے سر پر بھوت کی طرح سوار ہوجاتا تھا' یا پھر وہ بے حد غمگین و ملول ہوتی تھی یا پھر خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹنے لگتی تھی۔ لیکن آج؛ آج وہ محض الجھن کا شکار تھی۔

سرخ اینٹوں کا مکان وسیع و عریض باغ میں محصور تھا۔ باغ میں بے شمار پھولوں کی کیاریاں تھیں' طرح طرح کی پھل دار جھاڑیاں اور پھل دار درخت تھے اور ایک لمبا چوڑا لان (lawn) تھا۔ لان میں ایک طرف ایک گلائیڈر (glider) رکھا ہوا تھا اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ اس بارہ دری میں بیٹھ کر چاروں طرف کے مناظر سے لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا۔ اسے دادا ابا نے اپنی پہلی بچی کے انتقال پر' جو صرف چند ہی ہفتے زندہ رہی تھی' دادی اماں کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ بچی کا نام ماری تھا اور اس کی لوح مزار پر یہ الفاظ کندہ تھے: "ننھی منی ماری آئی' اس نے ہمارے ساتھ علیک سلیک کی اور پھر رخصت ہوگئی۔"

باغ کی نچلی جانب رس بھری کے پودوں کے پیچھے ایک کونے میں گھنا جھنڈ تھا۔ یہ جھنڈ نہ پھولوں اور نہ سٹرا بیری' رس بھری اور بلیک بیری جیسے پودوں کا تھا۔ یہ دراصل پرانی باڑ تھی جو کسی زمانے میں باغ اور جنگل کے مابین حد بندی کا کام دیتی تھی۔ لیکن چونکہ گزشتہ بیس سالوں کے دوران میں کسی نے تراش خراش نہیں کی تھی' پودے اتنے گھنے ہوچکے اور آپس میں اس قدر الجھ چکے تھے کہ اس میں سے گزرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ دادی اماں کہا کرتی تھی کہ جنگ کے دنوں میں جب مرغیوں کو باغ میں اپنی مرضی سے ادھر ادھر گھومنے کی چھٹی تھی' اس باڑ کے طفیل لومڑوں کے لیے مرغیوں کو اچکنا بے حد دشوار ہوگیا تھا۔

جس طرح باغ کی دوسری جانب خرگوشوں کے دڑبے بیکار ہوگئے تھے' اسی طرح اب سوفی کے سوا کسی کو اس کہنہ باڑ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن

اس کی وجہ محض یہ تھی کہ انھوں نے سوفی کا راز دریافت نہیں کیا تھا۔

باڑ میں ایک چھوٹا سا شگاف تھا۔ سوفی کو اس کا تب سے علم تھا جہاں تک اس کا حافظہ کام کرتا تھا۔ جب وہ اس میں سے پیٹ کے بل رینگتی آگے بڑھتی، وہ جھاڑیوں کے بیچ ایک چھوٹی سی خالی جگہ پہنچ جاتی۔ اس جگہ کے ارد گرد جھاڑیاں اور درخت کچھ اس طور کھڑے تھے کہ یہ چھوٹا سا کمرا معلوم ہوتی۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں اسے کوئی نہیں ڈھونڈ سکے گا۔

دونوں لفافوں کو مضبوطی سے ہاتھوں میں تھامے سوفی نے بھاگتے دوڑتے باغ عبور کیا، دبک کر نیچے لیٹی اور چاروں ہاتھوں پاؤں کو استعمال کرتے گھسٹتی گھسٹاتی آگے بڑھنے لگی۔ اس کا مخفیہ ٹھکانا تقریباً اتنا اونچا ضرور تھا کہ وہ اس میں سیدھی کھڑی ہو سکتی تھی، لیکن آج وہ کھردری اور پیچ دار جڑوں کے گچھے کے اوپر بیٹھ گئی۔ وہاں سے وہ شاخوں اور پتوں کے بیچ چھوٹے چھوٹے روزنوں میں سے باہر جھانک سکتی تھی۔ اگرچہ کوئی بھی روزن کسی چھوٹے سکے سے بڑا نہیں تھا، اسے سارے باغ کا منظر پوری طرح نظر آجاتا تھا۔ جب وہ ننھی منی بچی تھی وہ سوچا کرتی تھی کہ وہ یہاں چھپی بیٹھی ہے اور اس کے ماں باپ اسے درختوں کے بیچ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، کتنے مزے کی بات ہے!

سوفی کا ہمیشہ یہی خیال رہا تھا کہ باغ اپنی دنیا آپ ہے۔ جب کبھی وہ انجیل میں باغ عدن کا حوالہ سنتی، اسے اپنا مخفیہ ٹھکانا یاد آجاتا جہاں وہ مزے سے بیٹھی اپنی ننھی منی جنت کا جائزہ لے رہی ہوتی۔

دنیا کہاں سے آئی ہے؟

اسے ذرا بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ اتنا ضرور جانتی تھی دنیا خلا میں محض چھوٹا سا سیارہ ہے۔ لیکن خلا کہاں سے آیا تھا؟ عین ممکن ہے کہ خلا ہمیشہ سے موجود رہا ہو، اور اگر یہ بات درست ہے، پھر اسے یہ مسئلہ سلجھانے کی ضرورت نہیں رہے گی کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے: کیا کوئی چیز ہمیشہ سے موجود ہو سکتی ہے؟ لیکن اس کے باطن کی گہرائیوں میں کوئی چیز اس تصور کے خلاف احتجاج کر رہی تھی۔ یقیناً ہر اس چیز کی، جو موجود ہے، کوئی نہ کوئی ابتدا ہوگی؟ چنانچہ خلا کسی زمانے میں کسی دوسری چیز سے تخلیق کیا گیا ہوگا۔

لیکن اگر خلا کسی دوسری چیز سے وجود میں آیا ہے، پھر یہ دوسری چیز بھی

کسی اور چیز سے بنی ہوگی ۔ سوفی کو محسوس ہوا کہ وہ مسئلے کو محض ٹال رہی ہے ۔ کسی نہ کسی وقت کوئی نہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آئی ہوگی ۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا یہ بات اتنی ہی ناممکن نہیں جتنی کہ یہ کہ دنیا ہمیشہ سے موجود ہے؟

انہوں نے سکول میں پڑھا تھا کہ دنیا خدا نے تخلیق کی ہے ۔ سوفی نے اس خیال سے اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ غالباً اس سارے مسئلے کا یہی بہترین حل ہے ۔ لیکن پھر اس نے دوبارہ سوچنا شروع کردیا ۔ وہ یہ تو مان سکتی تھی کہ خلا خدا نے تخلیق کیا ہے ' لیکن خود خدا کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ کیا اس نے عدم سے اپنے آپ کو خود تخلیق کیا تھا؟ ایک بار پھر اس کے باطن کی گہرائیوں میں کوئی چیز صدائے احتجاج بلند کرنے لگی ۔ اگرچہ خدا اشیا کی تمام انواع تخلیق کرسکتا تھا لیکن جب تک تخلیق کرنے کے لیے خود اس کی اپنی کوئی "ذات" (self) نہ ہوتی ' وہ اپنے آپ کو بمشکل تخلیق کرسکتا تھا ۔ چنانچہ صرف ایک امکان باقی رہ جاتا تھا : خدا ہمیشہ سے موجود ہے ۔ لیکن وہ اس امکان کو پہلے ہی مسترد کرچکی تھی! ہر وہ چیز موجود ہے ' اس کی کوئی نہ کوئی ابتدا تو ہوگی ۔

اف ' کیا مصیبت ہے!

اس نے دونوں لفافے دوبارہ کھولے ۔

تم کون ہو؟

دنیا کہاں سے آئی ہے؟

کیا گڑبڑ گھوٹالا سوال ہیں! ناک میں دم آگیا! اور بہرحال یہ خطوط آنے کہاں سے آئے ہیں؟

یہ بھی تقریباً اتنی ہی پراسرار بات ہے ۔

یہ کون ہے جس نے سوفی کی معمول کی زندگی میں بھونچال پیدا کردیا ہے اور اسے کائنات کے عظیم معموں کے روبرو کھڑا کردیا ہے؟

سوفی تیسری مرتبہ ڈاک ڈبے کی طرف گئی ۔ ڈاکیا ابھی ابھی اس شام کی ڈاک ڈال کر گیا تھا ۔ سوفی نے اندر ہاتھ ڈالا اور ڈھیروں ڈاک باہر نکال لی ۔ اس میں زیادہ تر بیکار اشتہاری مواد تھا ۔ چند رسائل تھے اور دو خطوط اس کی ماں کے نام تھے ۔ ایک پوسٹ کارڈ بھی تھا جس پر کسی استوائی ساحلی تفریح گاہ کی تصویر تھی ۔ اس نے کارڈ الٹا کر دیکھا ۔ اس پر ناروے کی ٹکٹ چسپاں تھی اور "یو این بٹالین" (U N Battalion)

کی مہر لگی ہوئی تھی ۔ یہ ابا نے بھیجا ہے ؟ لیکن وہ تو کسی بالکل ہی مختلف جگہ پر نہیں ؛ پھر یہ لکھائی بھی تو ان کی نہیں ۔

لیکن جب اس نے کارڈ پر یہ پتا پڑھا : " ہلڈے مولر کنیگ معرفت سوفی امنڈسین ، نمبر 3 کلوورکلوز . . . " تو اس کی نبض کی رفتار کچھ تیز ہوگئی ۔ باقی پتا درست تھا ۔ کارڈ پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی :

ڈیر ہلڈے ، پندرھویں سال گرہ مبارک ! چونکہ مجھے یقین ہے کہ تم میری بات سمجھ جاؤ گی ، میں تمہیں ایک ایسا تحفہ دینا چاہتا ہوں جو تمہیں ذہنی طور پر بالغ ہونے میں مدد دے گا ۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ میں یہ کارڈ سوفی کی معرفت بھیج رہا ہوں ۔ آسان ترین طریقہ یہی تھا ۔ ابا کی طرف سے پیار ۔

سوفی دوبارہ گھر کی طرف بھاگ پڑی اور اس نے باورچی خانے میں ہی پہنچ کر دم لیا ۔ اس کے دماغ میں ہلچل بپا تھی ۔ یہ "ہلڈے " کون ہے جس کی پندرھویں سال گرہ اس کی اپنی پندرھویں سال گرہ سے صرف ایک ماہ پہلے آتی ہے ؟

سوفی نے ٹیلی فون ڈائرکٹری اٹھائی ۔ مولر نام کے بے شمار لوگ تھے ، چند ایک کنیگ بھی تھے ۔ لیکن پوری ڈائرکٹری میں مولرکنیگ نام کا کوئی شخص نہیں تھا ۔

اس نے پراسرار کارڈ کا دوبارہ جائزہ لیا ۔ دیکھنے میں تو یقیناً اصلی معلوم ہوتا تھا ۔ اس پر ٹکٹ بھی تھی اور ڈاک کی مہر بھی ۔

کوئی باپ سال گرہ کا کارڈ سوفی کے پتے پر کیوں بھیجے گا جب کہ صاف ظاہر ہے کہ اسے بھیجا کہیں اور جانا مقصود تھا ؟ وہ کس قسم کا باپ ہوگا جو جان بوجھ کر سال گرہ کا کارڈ غلط پتے پر بھیج کر اپنی بیٹی کو اس سے محروم کردے ؟ یہ آسان ترین طریقہ کیسے ہوسکتا ہے ؟ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے متعلق یہ کیسے فرض کرلیا گیا ہے کہ وہ اس ہلڈے نام کی لڑکی کا کھوج لگائے گی ؟

چنانچہ اب سوفی کے لیے ایک اور پریشان کن مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس نے اپنے خیالات کو ذرا مربوط بنانے کی کوشش کی ۔

آج سہ پہر دو گھنٹوں کی مختصر مدت کے دوران میں اسے تین مسئلوں کا سامنا

کرنا پڑا تھا ۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ اس کے ڈاک ڈبے میں دو سفید لفافے کس نے ڈالے تھے ؟ دوسرے کا تعلق ان مشکل سوالوں سے تھا جو ان خطوط میں مندرج تھے ۔ تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ یہ ہلڈے مولرکنیگ کون ہے اور اس کا سال گرہ کا کارڈ سوفی کو کیوں بھیجا گیا ہے ۔ اسے یقین تھا کہ تینوں مسائل باہمی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ انہیں ہونا ہی تھا کیونکہ وہ آج تک بالکل عام قسم کی زندگی بسر کرتی چلی آئی تھی ۔

2۔ ٹاپ ہیٹ

* * *

...اچھے فلسفی بننے کے لیے ہمیں جو واحد شے درکار ہے وہ تحیر کی صلاحیت ہے...

سوفی کو یقین تھا کہ اسے گمنام خطوط نویس کا خط دوبارہ ملے گا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ فی الحال ان خطوط کے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔

سکول میں اساتذہ جو کچھ پڑھا رہے تھے ، اسے اس پر توجہ مرکوز کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اسے کچھ یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ غیر اہم سی باتیں کر رہے ہوں۔ آخر وہ اس قسم کے موضوعات پر گفتگو کیوں نہیں کر سکتے کہ انسان کیا ہے —— یا یہ کہ یہ دنیا کیا ہے اور یہ کیسے وجود میں آئی؟

اسے پہلی مرتبہ محسوس ہونے لگا کہ سکول میں بھی اور دوسرے تمام مقامات پر بھی لوگوں کو صرف معمولی اور ادنیٰ چیزوں کی فکر رہتی ہے۔ حالانکہ بڑے بڑے مسائل پڑے ہیں جنہیں حل کرنے کی ضرورت ہے۔

کیا کسی شخص کے پاس ان سوالوں کے جواب ہیں؟ سوفی کو محسوس ہو رہا تھا کہ بے قاعدہ افعال (Irregular verbs) کا رٹا لگانے سے ان (سوالوں) کے متعلق سوچنا کہیں زیادہ اہم ہے۔

جب آخری پیریڈ کے اختتام پر گھنٹی بجی ، وہ سکول سے اتنی تیزی سے باہر نکلی کہ جوآنا کو اس کا ساتھ دینے کے لیے دوڑ لگانا پڑی۔

کچھ دیر بعد جو آننا نے پوچھا: "آج شام تاش کھیلنا چاہو گی؟"
سوفی نے کندھے اچکا دیے۔
"مجھے اب تاش میں اتنی دلچسپی نہیں رہی۔"
معلوم ہوتا تھا کہ جو آننا اس کا جواب سن کر چکرا گئی ہے۔
"واقعی؟ پھر بیڈمنٹن کھیل لیتے ہیں۔"
سوفی نے پہلے فٹ پاتھ کی طرف گھور کر دیکھا ـــــ پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر اپنی سہیلی کی طرف دیکھا۔
"میرا خیال ہے کہ مجھے بیڈمنٹن میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔"
"مذاق کر رہی ہو!"
سوفی کو جو آننا کے لہجے میں تلخی کی جھلک نظر آئی۔
"برا نہ مناؤ تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آخر اتنی اہم مصروفیت کیا آپڑی ہے؟"
سوفی نے انکار میں سر ہلا دیا اور کہا: "یہ . . . یہ راز کی بات ہے۔"
"فضول! شاید تمہیں محبت ہو گئی ہے!"
دونوں لڑکیاں کچھ کہے بغیر کچھ دور ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ جب وہ فٹ بال کے میدان کے قریب پہنچیں، جو آننا نے کہا: "میں اس گراؤنڈ میں سے جا رہی ہوں۔"
گراؤنڈ میں سے جو آننا کے لیے گھر پہنچنے کے لیے یہ مختصر ترین راستہ تھا، لیکن وہ ادھر کا رخ تبھی کیا کرتی تھی جب اسے مہمانوں کا استقبال کرنے یا دانتوں کے ڈاکٹر کے ہاں جانے کے لیے جلدی گھر پہنچنا ہوتا تھا۔
سوفی کو پچھتاوا ہونے لگا کہ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ کمینگی سے پیش آئی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ کیا وہ ایکا ایکی ان سوالوں میں کہ وہ کون ہے اور دنیا کہاں سے آئی ہے، اتنا کھو گئی ہے کہ اس کے پاس بیڈمنٹن کھیلنے کے لیے بھی وقت نہیں رہا؟ کیا جو آننا اس کی مجبوری سمجھ جاتی؟
کسی انتہائی اہم اور ایک لحاظ سے انتہائی فطری سوال میں کھو جانا کیوں اتنا مشکل ہے؟
جب اس نے ڈاک ڈبا کھولا، اسے محسوس ہوا کہ اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی ہے۔ جو پہلے خطوط اس کے ہاتھ میں آئے، ان میں سے ایک بینک سے آیا تھا

اور چند بڑے حجم کے لفافے اس کی ماں کے نام تھے۔ لعنت! وہ تو یہ توقع لے کر آئی تھی کہ اسے گمنام فرستندہ کا کوئی اور خط ملے گا۔

جب اس نے اپنے پیچھے گیٹ بند کیا، اس نے دیکھا کہ ایک بڑے لفافے پر اس کا اپنا نام تحریر ہے۔ جب اس نے اسے اٹھا کر دیکھا، وہاں لکھا تھا: "فلسفے کا نصاب۔ احتیاط سے کھولو۔"

سوفی نے بجری کی پگڈنڈی پر دوڑ لگا دی اور اپنا بستہ باہر سیڑھیوں پر ہی پھینک دیا۔ اس نے باقی خطوط تو دروازے کے نیچے اندر گھسیڑ دیے اور خود پناہ کی تلاش میں باغ میں سے بھاگتی اپنے خفیہ ٹھکانے پہنچ گئی۔ یہ واحد جگہ تھی جہاں خط کھولا جا سکتا تھا۔

شیری کان بھی چھلانگیں بھرتی اس کے پیچھے آ گئی لیکن سوفی کو اس کا وجود برداشت کرنا ہی پڑا۔ تاہم اسے معلوم تھا کہ وہ اس کا راز کسی پر منکشف نہیں کرے گی۔

لفافے کے اندر تین ٹائپ شدہ صفحات تھے۔ انہیں پیپر کلپ (clip) سے نتھی کر دیا گیا تھا۔ سوفی پڑھنے لگی۔

فلسفہ کیا ہے

ڈی سوفی،

بے شمار لوگوں کو کسی نہ کسی چیز کا شوق ہوتا ہے۔ بعض لوگ پرانے سکے یا غیر ملکی ٹکٹیں جمع کرتے ہیں، بعض کشیدہ کاری سے دل بہلاتے ہیں اور بعض اپنے فالتو وقت کا بیشتر حصہ کسی خاص کھیل پر صرف کرتے ہیں۔

ایسے لوگ بھی تعداد میں کم نہیں جو مطالعے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن پڑھا کیا جائے، یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ بعض لوگ صرف اخبار یا کامکس (Comics) پڑھتے ہیں، بعض کو ناولوں کا مطالعہ پسند ہے اور بعض فلکیات، جنگلی حیات یا ٹیکنالوجی دریافتوں سے متعلق کتابوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

اگر اتفاق سے مجھے گھوڑوں یا قیمتی پتھروں میں دلچسپی پیدا ہوجائے ' میں یہ توقع نہیں کرسکتا کہ دوسرے لوگ بھی میرے اس جوش و خروش میں ساجھے دار بن جائیں گے ۔ اگر میں ٹیلی وژن پر کھیلوں کے تمام پروگرام بڑے شوق سے دیکھتا ہوں اور ان سے خوب لطف اندوز ہوتا ہوں تو مجھے اس حقیقت سے سمجھوتا کرنا ہی ہوگا کہ دوسرے لوگوں کو کھیلوں سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔

کیا کوئی ایسی چیز نہیں جس میں ہم سب دلچسپی لے سکیں ؟ کیا کوئی ایسی چیز نہیں جس کا تعلق سب سے بنتا ہو —— اس بات سے قطع نظر کہ وہ کون ہیں یا دنیا میں کہاں رہتے ہیں ؟ ہاں ' ڈیر سوفی ' ایسے سوال یقیناً ہیں جن میں سب کو دلچسپی ہوسکتی ہے ۔ صحیح معنوں میں یہ بالکل یہی سوال ہیں جن کے متعلق یہ نصاب شروع کیا جارہا ہے۔

زندگی میں اہم ترین چیز کیا ہے ؟ اگر ہم یہ سوال کسی ایسے شخص سے کریں جس کا حال اتنا پتلا ہو کہ نوبت فاقہ کشی تک پہنچ گئی ہو ' اس کا جواب ہوگا ' روٹی ۔ اگر ہم یہ سوال کسی ایسے شخص سے کریں جس کا سردی نے حلیہ بگاڑ دیا ہو ' اس کا جواب ہوگا ' حرارت ۔ اگر ہم یہ سوال کسی ایسے شخص سے کریں جو اپنے آپ کو اکیلا اور دوسروں سے کٹا ہوا محسوس کرتا ہے ' اس کا غالباً جواب ہوگا ' لوگوں کی صحبت۔

لیکن جب یہ بنیادی ضرورتیں پوری ہوجائیں —— کیا پھر بھی کوئی ایسی چیز رہ جاتی ہے جس کی ہر شخص کو ضرورت ہو ؟ فلسفیوں کا خیال ہے کہ ہاں ۔ وہ باور کرتے ہیں کہ انسان محض روٹی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا ۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے ' اور ہر شخص کو محبت اور دیکھ بھال کی ضرورت بھی پیش آتی ہے ۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جس کی ہر شخص کو ضرورت ہوتی ہے اور وہ ضرورت یہ معلوم کرنا ہے کہ ہم کون ہیں اور ہم یہاں کیوں ہیں۔

"ہم یہاں کیوں ہیں ؟" اس سوال میں دلچسپی رکھیں جمع

کرنے کی دلچسپی کی طرح کی چیز نہیں کہ فرصت ملی یا جی چاہا، ٹکٹیں جمع کرنے لگے اور پھر سب کچھ بھول بھال اپنے کام کاج میں مصروف ہو گئے۔ جو لوگ اس قسم کے سوال پوچھتے ہیں وہ ایک ایسی بحث میں شریک ہوتے ہیں جو تب سے جاری ہے جب انسان نے اس سیارے پہ رہنا شروع کیا تھا۔ کائنات، زمین اور زندگی کیسے وجود میں آئے، یہ سوال اس سوال سے کہیں بڑا اور کہیں زیادہ اہم ہے کہ گزشتہ اولمپک مقابلوں میں سب سے زیادہ طلائی تمغے کس نے جیتے تھے۔

فلسفے تک رسائی حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ چند فلسفیانہ سوال پوچھے جائیں:

دنیا کی تخلیق کیسے ہوئی؟ جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے کیا اس کے پیچھے کوئی منشا یا مطلب کارفرما ہے؟ کیا موت کے بعد حیات ہے؟ ہم ان سوالوں کے جواب کیسے دے سکتے ہیں؟ اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ ہمیں زندگی کس نہج سے گزارنا چاہیے؟ لوگ قرن ہا قرن سے یہ سوال پوچھتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں کسی ایسے تمدن یا کلچر کا علم نہیں جس نے کبھی یہ نہ پوچھا ہو کہ انسان کیا ہے اور دنیا کہاں سے آئی ہے۔

جو فلسفیانہ سوال اٹھائے جا سکتے ہیں، بنیادی طور پہ ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ جو اہم ترین ہیں، ان میں سے چند ایک ہم پہلے ہی پوچھ چکے ہیں۔ لیکن تاریخ ہمیں ہر سوال کے متعدد اور مختلف جواب فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ فلسفیانہ سوال پوچھنا ان کے جواب دینے سے کہیں زیادہ آسان کام ہے۔

آج بھی ہر فرد کو ان سوالوں کے جواب خود دریافت کرنا ہیں۔ تم کوئی انسائیکلوپیڈیا دیکھ کر معلوم نہیں کر سکتیں کہ کوئی خدا ہے یا نہیں یا یہ کہ موت کے بعد حیات ہے یا نہیں۔ انسائیکلوپیڈیا ہمیں یہ بھی نہیں بتاتا کہ ہمیں کس طرح کی زندگی گزارنا چاہیے۔ تاہم دوسرے لوگوں کے کیا عقائد رہے ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد ہمیں زندگی کے متعلق اپنا نقطہ نظر بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔

فلسفیوں کی صداقت کی جستجو کسی سراغ رسانی کی کہانی سے ملتی جلتی ہے ۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ قاتل اینڈرسن تھا جب کہ دوسروں کے خیال میں قتل کا ارتکاب نیلسین یا جینسین نے کیا تھا ۔ بعض اوقات پولیس کسی اصل جرم کا حل ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاتی ہے ۔ لیکن مساوی طور پر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کبھی اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے حالانکہ حل کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے ۔ چنانچہ اگر کسی سوال کا جواب دینا مشکل نظر آئے ، پھر بھی یہ امکان اپنی جگہ موجود رہتا ہے کہ کہیں نہ کہیں صحیح ـــــ اور واحد صحیح ـــــ جواب لازماً ہوگا ۔ یا تو موت کے بعد کسی قسم کی حیات ہے ـــــ یا پھر نہیں ہے ۔

اب سائنس نے بے شمار مدتوں پرانے معمے حل کردیے ہیں ۔ چاند کا تاریک رخ کیسا نظر آتا ہے ، ایک زمانے میں اس پر اسرار کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے ۔ یہ اس طرح کی چیز نہیں تھا کہ اسے بحث مباحثے سے حل کرلیا جاتا ، اسے ہر شخص کے تخیل پر چھوڑ دیا جاتا تھا ۔ آج ہمیں ٹھیک معلوم ہے کہ چاند کا تاریک رخ کیسا نظر آتا ہے اور اب کوئی شخص چاند کے انسان پر "یقین" کرنے کے لیے تیار نہیں اور نہ وہ یہ "مان" سکتا ہے کہ چاند پنیر کا بنا ہوا ہے ۔

ایک یونانی فلسفی کا ، جسے انتقال کئے دو ہزار سے اوپر سال گزر چکے ہیں ، اعتقاد تھا کہ فلسفے کا ماخذ انسان کا احساس تحیر ہے ۔ انسان سمجھتا تھا کہ زندہ رہنا اتنا تعجب انگیز امر ہے کہ فلسفیانہ خیالات اپنے آپ اٹھنے لگے ۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے آدمی جادو کا تماشا دیکھ رہا ہو ۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جادوگر یہ سب کچھ کیسے کر رہا ہے ۔ چنانچہ ہم پوچھتے ہیں : جادوگر نے دو سفید ریشمی رومالوں کو خرگوش میں کیسے تبدیل کردیا؟

بے شمار لوگوں کو دنیا میں جو تجربے ہوتے ہیں ، ان پر وہ اسی قسم کی بے اعتقادی کا اظہار کرتے ہیں جس طرح کی بے اعتقادی تب ان کی زبانوں پر آتی ہے جب جادوگر یک لخت ٹوپی میں سے خرگوش نکال کر ان کی نظروں کے سامنے کردیتا ہے

حالانکہ ابھی ابھی انہیں دکھایا گیا تھا کہ ٹوپی بالکل خالی ہے۔

خرگوش کے معاملے میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جادوگر نے ہمارے ساتھ ہاتھ کیا ہے۔ ہم جاننا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس نے یہ کرتب کیا کیسے۔ جب معاملہ دنیا کا ہوتا ہے، یہ ذرا مختلف صورت اختیار کرلیتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ دنیا ہاتھ کی صفائی یا کسی دھوکے فریب کا نتیجہ نہیں کیونکہ ہم اس میں موجود ہیں، اس کا جزو ہیں۔ درحقیقت ہم ہی وہ خرگوش ہیں جسے ٹوپی سے نکالا جارہا ہے۔ ہمارے اور سفید خرگوش کے مابین فرق صرف یہ ہے کہ خرگوش کو اندازہ نہیں ہو پاتا کہ وہ جادو کے کھیل میں شریک ہے۔ اس کے برعکس ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی پراسرار چیز کے جزو ہیں اور ہم جاننا چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے۔

پس نوشت: جہاں تک سفید خرگوش کا تعلق ہے، بہتر یہی ہوگا کہ اس کا موازنہ ساری کائنات سے کیا جائے۔ ہم جو یہاں رہتے ہیں، خوردبین سے نظر آنے والے کیڑے مکوڑے ہیں جو خرگوش کی پوستین میں کہیں بہت اندر موجود ہیں۔ لیکن فلسفی پوستین کے مہین بالوں پر چڑھنے کی کوشش کرتے آرہے ہیں تاکہ وہ سیدھے جادوگر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ سکیں۔
سوفی، تم ابھی تک وہیں ہو نا؟ (جاری ہے۔)

سوفی بالکل تھک چکی تھی۔ ابھی تک وہیں؟ اسے تو اتنا بھی یاد نہ آسکا کہ پڑھنے کے دوران میں اسے سانس لینے کا موقع بھی ملا تھا یا نہیں۔
یہ خط کون لایا تھا؟ یہ وہی شخص تو نہیں ہوسکتا تھا جس نے ہلڈے مولر کنیگ کے نام سال گرہ کا کارڈ بھیجا تھا کیونکہ کارڈ پر ٹکٹ چسپاں تھی اور اس پر مہر کا نشان بھی تھا۔ یہ خاکی لفافہ بھی کسی نے بالکل دونوں سفید لفافوں کی طرح ہاتھ سے ڈاک ڈبے میں ڈالا ہوگا۔

سوفی نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ پونے تین بجے تھے۔ اس کی امی دو گھنٹوں سے پہلے اپنے کام سے واپس گھر نہیں آئے گی۔

سوفی دوبارہ پیٹ کے بل رینگتی باغ میں نکل آئی اور سیدھی ڈاک ڈبے کی طرف بھاگ پڑی۔ شاید کوئی اور خط آگیا ہو۔

اسے ایک اور خاکی لفافہ مل گیا۔ اس پر اس کا نام تحریر تھا۔ اس مرتبہ اس نے چاروں طرف نگاہیں گھما کر دیکھا لیکن کوئی شخص نظر نہ آیا۔ وہ دوڑتے دوڑتے جنگل کے کنارے تک پہنچی اور نگاہیں گاڑ کر پگڈنڈی کی طرف دیکھنے لگی۔

وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اسے کہیں دور جنگل کے عین درمیان میں کسی شاخ کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی ہے۔ لیکن وہ پوری طرح یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اور ویسے بھی کسی ایسے شخص کا تعاقب بیکار تھا جو کھسکنے پر تلا ہوا تھا۔

سوفی اپنے گھر کے اندر چلی گئی۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتی اپنے کمرے میں پہنچی اور بسکٹوں کا خاصا بڑا ٹین کا ڈبا، جو خوبصورت اور دل آویز سنگ ریزوں سے بھرا ہوا تھا، باہر نکالا۔ اس نے سنگ ریزے فرش پر انڈیل دیے اور دونوں لفافے ڈبے میں رکھ دیے۔ پھر وہ ڈبے کو دونوں ہاتھوں میں سنبھالے تیزی سے باغ کی طرف چل دی۔ جانے سے پہلے اس نے شیری کان کا کھانا باہر رکھ دیا۔

"مانو! مانو! مانو!"

جب وہ دوبارہ اپنے خفیہ ٹھکانے پہنچ گئی، اس نے دوسرا خاکی لفافہ کھولا اور ٹائپ شدہ کاغذات باہر نکال لیے۔ وہ پڑھنے لگی۔

عجیب و غریب مخلوق

ایک بار پھر آداب! جیسا کہ تم نے بھانپ لیا ہوگا فلسفے کا یہ مختصر نصاب تمہیں چھوٹی چھوٹی اقساط میں موصول ہوگا تاکہ تم انہیں آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکو۔ یہاں چند مزید تعارفی کلمات تحریر کیے جا رہے ہیں۔

کیا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اچھا فلسفی بننے کے لیے جو واحد چیز درکار ہے، وہ تحیر کی صلاحیت ہے۔ اگر میں نے پہلے یہ بات نہیں کہی تو اب کہے دیتا ہوں: ہمیں اچھے فلسفی بننے

کے لیے جس واحد چیز کی ضرورت ھے ، وہ تحیر
کی صلاحیت ھے۔

نومولود اور دودھ پیتے بچوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے ۔ اور
یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ۔ رحم میں چند مہینے گزارنے کے بعد
وہ نئی نکور حقیقت میں داخل ہوتے ہیں لیکن جوں جوں وہ بڑے
ہوجاتے ہیں ، ان کی تحیر کی صلاحیت میں تخفیف آنے لگتی ہے ۔
ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تمہیں معلوم ہے؟

اگر نومولود بچہ بات کرسکتا تو غالباً وہ کچھ اس قسم کی
بات کہتا : " واہ واہ ! میں کتنی غیر معمولی دنیا میں آگیا ہوں ۔ " ہم
جانتے ہیں کہ وہ کس طرح چاروں طرف اپنی نظریں گھماتا ہے اور
جو چیز بھی اسے دکھائی دیتی ہے ، تجسس سے اس کی طرف ہاتھ
بڑھاتا ہے۔

جب بچہ دھیرے دھیرے الفاظ سیکھنا شروع کردیتا
ہے ، وہ نگاہیں اٹھا کر اوپر نیچے دیکھنے لگتا ہے اور جب کبھی اس
کی نظر کسی کتے پر پڑتی ہے ، وہ " بھوں بھوں ! بھوں بھوں ! "
کی آوازیں نکالتا ہے ۔ وہ بچہ گاڑی میں دائیں بائیں ، اوپر نیچے
اچھلتا ہے اور بازو لہرا لہرا کر منہ سے آواز برآمد کرتا ہے : " بھوں
بھوں ! بھوں بھوں ! " ہم جوکہ اس سے عمر میں بڑے اور زیادہ سمجھ
دار ہیں ، اس کے جوش و خروش سے اکتا چکے ہیں " ۔ ٹھیک ہے ،
ٹھیک ہے ۔ یہ بھوں بھوں ہی ہے ۔ " ہم متاثر ہونے بغیر کہتے
ہیں ۔ " بس اب چپ چاپ بیٹھ جاؤ ۔ " کتے کو دیکھ کر مسحور بچہ ہوتا
ہے ، ہم نہیں ۔ ہمارے لیے کتا نئی چیز نہیں ، ہم نے اسے پہلے ہی
دیکھا بھالا ہوتا ہے۔

اس قسم کا مسرت افزا اور وجد آفریں مظاہرہ سینکڑوں
مرتبہ دہرایا جاسکتا ہے ۔ تب کہیں بچہ ہوش و حواس کھونے بغیر
کتے ، ہاتھی یا دریائی گھوڑے کو نظرانداز کرنا سیکھتا ہے ۔ لیکن
اسی بچے نے ڈھنگ سے بات کرنا نہیں سیکھا ہوتا ــــ فلسفیانہ
انداز سے کیسے سوچا جاتا ہے ، اس کے سیکھنے میں تو اسے بہت
عرصہ لگے گا ــــ کردنیا اس کی عادت بن جاتی ہے۔

اگر تم میری رائے پوچھو تو میں کہوں گا : " جیف ، صد

حیف!"

سوفی ڈیر ، مجھے تشویش اس بات کی ہے کہ بڑی ہوکر کہیں تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو سوچتے وہ چیز تو کچھ نہیں ، دنیا کو یوں لیتے ہیں جیسے اس نے تو موجود ہونا ہی تھا ، پھر حیرت کیسی ! چنانچہ یہ امر یقینی بنانے کے لیے کہ ایسا نہیں ہوگا ہم نصاب شروع کرنے سے پہلے فکر (Thought) کے دو تجربے کریں گے۔

فرض کرو کہ تم ایک دن سیر کے لیے جنگل میں چلی جاتی ہو ۔ اچانک تمہیں اپنے سامنے پگڈنڈی پر ایک چھوٹا سا خلائی جہاز نظر آتا ہے ۔ مریخ کا ایک کوتاہ قامت باشندہ جہاز سے باہر نکلتا ہے ۔ وہ زمین پر کھڑا ہو جاتا ہے اور تمہیں تکنے لگتا ہے . . .

تم کیا سوچو گی ؟ خیر ، چھوڑو ، یہ کوئی اہم بات نہیں ۔ لیکن کیا تم نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ تم خود کوئی مریخ جیسے سیارے کی مخلوق ہو؟

بظاہر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ تمہارا یوں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق سے اچانک واسطہ پڑجائے ۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ دوسرے سیاروں پر زندگی ہے بھی یا نہیں ۔ لیکن یہ عین ممکن ہے کہ کسی روز تمہاری خود اپنے آپ سے مڈبھیڑ ہو جائے ۔ پھر کیا ہوگا ؟ ہوسکتا ہے کہ تم چلتے چلتے یک لخت رک جاؤ اور اپنے آپ کو بالکل نئی روشنی میں دیکھنے لگو ۔ جنگل میں اس طرح کی سیر کے دوران میں ایسا واقعہ رونما ہوسکتا ہے۔

"میں غیر محسوس ہستی ہوں۔" تم سوچتی ہو ۔ "میں پراسرار مخلوق ہوں۔"

تمہیں محسوس ہوتا ہے کہ تم اچانک کسی طلسمی خواب سے بیدار ہو رہی ہو ۔ "میں کون ہوں ؟" تم پوچھتی ہو ۔ تم جانتی ہو تم کائنات میں کسی سیارے پر ڈگمگاتی پھر رہی ہو ۔ لیکن کائنات کیا ہے ؟

اگر تم اس طریقے سے اپنے آپ کو دریافت کرو تم کوئی اتنی ہی پراسرار چیز دریافت کر چکی ہوگی جتنی کہ وہ مریخی مخلوق تھی جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے ۔ تم نہ صرف بیرونی خلا کی

کوئی مخلوق دیکھ چکی ہوگی بلکہ تمہیں اپنے باطن کی گہرائیوں میں محسوس ہوگا کہ تم خود کوئی غیر معمولی ہستی ہو۔

سوئی، تم میری بات سمجھ گئی ہو نا؟ آؤ، ہم فکر کا ایک اور تجربہ کرتے ہیں۔

ایک صبح ابا، امی اور دو تین سال ننھا ٹامس باورچی خانے میں ناشتہ کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد امی اٹھتی ہیں اور باورچی خانے کے سنک (Sink) کی طرف چل پڑتی ہیں۔ کچھ دیر بعد ابا ـــــ ہاں، ابا ـــــ اٹھتے ہیں، اوپر اڑتے ہیں اور چھت کے نیچے خلا میں پھرنے لگتے ہیں اور رہا ٹامس، وہ بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا ہے۔ تمہارے خیال میں ٹامس کیا کہتا ہے؟ شاید وہ اپنے باپ کی طرف انگلی لہراتا اور کہتا ہے: "ابا اڑ رہے ہیں!" ٹامس یقیناً متعجب ہو رہا ہوگا لیکن متعجب ہونا اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں، وہ متعجب تو اکثر ہی ہوتا رہتا ہے۔ ابا اکثر اتنے عجیب و غریب کام کرتے رہتے ہیں کہ ننھے ٹامس کے لیے ان کی اس مختصر پرواز کے مظاہرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر روز ابا کسی مضحک مشین سے شیو بناتے ہیں، کبھی کبھار وہ چھت پر چڑھ جاتے ہیں اور ٹیلی ویژن کا ایریل ادھر ادھر گھمانے لگتے ہیں ـــــ یا پھر وہ کار کے بونٹ (Bonnet) کے نیچے سے اپنا سر باہر نکالتے ہیں اور ان کے چہرے پر کالک لگی ہوتی ہے۔

اب باری امی کی ہے۔ جو کچھ ٹامس کہتا ہے، وہ سن لیتی ہیں اور اچانک مڑ کر اوپر دیکھتی ہیں۔ جب وہ ابا کو باورچی خانے کی میز کے اوپر، لا ابالی انداز سے پرواز کرتے دیکھتی ہیں، تمہارے خیال میں وہ کس قسم کے ردعمل کا اظہار کریں گی؟

ان کے ہاتھ سے جام کا برتن نیچے فرش پر گر پڑتا ہے اور خوف کے عالم میں ان کی چیخ نکل جاتی ہے۔ جب ابا طمطراق سے نیچے اتر آتے ہیں اور بن سنور کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں، امی کی حالت اتنی پتلی ہو چکی ہوتی ہے کہ انہیں شاید طبی امداد فراہم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ (ابا کو ایسی حرکت نہیں کرنا چاہیے تھی، انہیں اب تک دسترخوان کے بہتر آداب سیکھ لینا چاہئیں تھے۔) تمہارے خیال میں ٹامس اور اس کی ماں کا ردعمل

اتنا مختلف کیوں ہے؟

سارا معاملہ عادت کا ہے۔ (اس بات کو ذہن نشین کرلو!) امی سیکھ چکی ہیں کہ انسان اڑ نہیں سکتے۔ ٹامس نے ابھی یہ بات نہیں سیکھی۔ وہ ابھی تک وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ انسان اس دنیا میں یہ کرسکتا ہے اور وہ نہیں کرسکتا۔

لیکن سوفی، خود دنیا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہارے خیال میں یہ جو کرتی ہے، کیا اسے کرسکتی ہے؟ دنیا بھی تو خلا میں پیر رہی ہے۔

رونا اس بات کا ہے کہ جب ہم بڑے ہوجاتے ہیں، ہم صرف کشش ثقل ہی کے عادی نہیں ہوجاتے بلکہ قلیل مدت میں خود دنیا بھی ہماری عادت بن جاتی ہے۔ نظر کچھ یوں آتا ہے جیسے بڑھنے کے عمل کے دوران میں ہم دنیا کے بارے میں متحیر ہونے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ اور جب ہم یہ کرتے ہیں ہم کوئی مرکزی چیز بھی کھو بیٹھتے ہیں ــــ وہ چیز جسے فلسفی واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے باطن میں کہیں کوئی چیز ہے جو ہمیں بتاتی رہتی ہے کہ زندگی عظیم راز ہے۔ اس چیز کا ہمیں پہلے کبھی تجربہ ہوا تھا ــــ لیکن یہ تب کی بات ہے جب ہمیں ابھی فکر (Thought) سوچنا نہیں آیا تھا۔

صحیح تر بات یہ ہے: اگرچہ فلسفیانہ سوالوں کا تعلق ہم سب سے ہے، ہم سب فلسفی بن نہیں پاتے۔ مختلف وجوہ کی بنا پر لوگ روزمرہ کے دھندوں میں اتنا پھنس جاتے ہیں کہ دنیا کے بارے میں ان کا تحیر پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ (وہ رینگتے رینگتے خرگوش کی پوستین میں کہیں بہت دور گھس جاتے ہیں، وہاں آرام سے لیٹ جاتے ہیں اور باقی زندگی وہیں پڑے پڑے گزار دیتے ہیں۔)

بچوں کے لیے دنیا اور اس کی ہر چیز نئی ہوتی ہے، ایک ایسی چیز جو تحیر ابھارتی ہے۔ لیکن بالغوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا ہوتا۔ بیشتر بالغ دنیا کو بس روزمرہ کی چیز سمجھ بیٹھتے ہیں (جس میں حیرت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔)

یہی وہ عین مین مقام ہے جہاں فلسفی قابل توجہ استثنا
بن جاتے ہیں ۔ فلسفی دنیا سے کبھی پوری طرح مانوس نہیں
ہو پاتا ۔ اسے دنیا ہمیشہ غیر منطقی ـــــ الجھاؤ میں ڈالنے والی ،
سمجھنے کی نہ سمجھانے کی ، پہیلی نما ـــــ نظر آتی رہتی ہے ۔ یوں
فلسفیوں اور چھوٹے بچوں کے مابین ایک اہم صلاحیت مشترک
ہے ۔ تم کہہ سکتی ہو کہ فلسفی اپنی پوری زندگی کے دوران میں
اسی طرح ضرورت سے زیادہ حساس ہوتا ہے جس طرح کہ بچہ۔

سوفی ، اب انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے ۔ کیا تم وہ بچی ہو
جس کا دنیا کے بارے میں جوش و خروش ابھی تک ماند نہیں پڑا ؟
کیا تم وہ فلسفی ہو جو قسم کھاتا ہے کہ بچے کی طرح وہ اس جوش و
خروش کو کبھی ماند نہیں پڑنے دے گا؟

اگر تم نے اس سوال کے جواب میں محض سر ہلانے پر
اکتفا کر لیا اور اپنے اندر کی بچی یا فلسفی کو نہ پہچانا ، تو اس کا
مطلب یہ ہوگا کہ تم دنیا سے اس قدر مانوس ہو چکی ہو کہ تمہیں اب
اس میں تحیر کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا ۔ ذرا سنبھل کر ! تم برف
کی مہین تہ پر کھڑی ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں فلسفے کا یہ نصاب
موصول ہو رہا ہے کہ کہیں تم نیچے نہ لڑھک جاؤ ۔ اس بھری پری
دنیا میں کم از کم تمہیں میں اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم
بھی اس ہجوم میں شامل ہو جاؤ جو ہر چیز کے بارے میں بے حسی ،
بے نیازی اور بے تعلقی کا رویہ اپنائے رکھتا ہے ۔ میں چاہتا ہوں
کہ تم تفتیشی ذہن کی مالک بن جاؤ ۔

تمہیں یہ سارا نصاب مفت پیش کیا جا رہا ہے ، چنانچہ اگر
تم اسے مکمل نہ کر سکیں تو تمہیں کوئی بقایا رقم واپس نہیں ملے
گی ۔ اگر تم اس نصاب کو ادھورا چھوڑنا چاہو ، تمہیں پوری پوری
اجازت ہوگی ۔ اس صورت میں تمہیں صرف ایک کام کرنا ہوگا اور
وہ یہ کہ ڈاک ڈبے میں میرے نام اپنا پیغام چھوڑ دینا ۔ زندہ
مینڈک نہایت ہی موزوں رہے گا ۔ یا پھر کم از کم کوئی سبز چیز ،
ورنہ ڈاکیا ڈر جائے گا۔

مختصر خلاصہ یہ ہے : ٹاپ ہیٹ (Top hat) یا ٹوپی سے
سفید خرگوش برآمد کیا جاتا ہے لیکن یہ خرگوش بے حد جسیم ہے

اور یوں اس کرتب کے منظر عام پر نمودار ہوتے ہیں اربوں سال کا عرصہ لگتا ہے ۔ تمام قابل انسان لوگوں کے باریک بالوں کے بالکل آخری سروں پر پیدا ہوتے ہیں جہاں وہ اس مقام پر ہوتے ہیں کہ کرتب کی ناممکنیت پر حیرت کا اظہار کرسکیں ۔ لیکن جوں جوں ان کی عمریں بڑھنے لگتی ہیں ، وہ پوستین کے اندر ، مزید اندر گھسنے کا سامان پیدا کرلیتے ہیں اور وہیں پڑے رہتے ہیں ۔ وہاں انہیں اتنی آسائش اور سکون مل جاتا ہے کہ وہ دوبارہ نازک بالوں کے اوپر چڑھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے ۔ صرف فلسفی زبان (Language) اور وجود (Existence) کے بعید ترین مقام تک پہنچنے کی پر خطر مہم پر روانہ ہوتے ہیں ۔ ان میں سے بعض کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ نیچے گر پڑتے ہیں ، لیکن دوسرے جان کی پروا کیے بغیر چمٹے رہتے ہیں اور چیخ چیخ کر لوگوں کو پکارتے رہتے ہیں جو کہیں نیچے عمیق وسعتوں کی نیم گرم ملائمت میں آرام سے لیٹے ہوئے ہیں اور اپنے معدوں میں لذیذ ماکولات و مشروبات اتار رہے ہیں۔

"خواتین و حضرات ،" وہ (فلسفی) گلا پھاڑ کر کہتے ہیں ، "ہم خلائے بسیط میں تیر رہے ہیں !" لیکن جو لوگ نیچے لیٹے ہوئے ہیں ، وہ رتی برابر پروا نہیں کرتے۔

"کیا فضول لوگوں کی ٹولی ہے ، خواہ مخواہ دوسروں کے لیے مصیبت کھڑی کیے رکھتے ہیں !" وہ کہتے ہیں اور دوبارہ اپنی بک بک شروع کردیتے ہیں : "یہ مکھن ذرا ادھر سرکا دو ۔ تو ہاں بھائی ، سٹاک مارکیٹ کا کیا حال ہے ، ہمارے حصوں کی قیمت کتنی بڑھی ؟ ٹماٹروں کا کیا بھاؤ ہے ؟ سنا کچھ ، پرنس ڈی (Di) (ڈیانا) پھر امید سے ہے؟"

جب اس سہ پہر بعد ازاں سوفی کی ماں گھر پہنچی ، سوفی کی عملاً کیفیت یہ تھی جیسے اسے کسی چیز سے سخت دھچکا پہنچا ہو ۔ جس ٹین کے ڈبے میں پراسرار فلسفی کے خطوط تھے ، اسے مخفیہ ٹھکانے میں احتیاط سے چھپا دیا گیا تھا اور وہاں وہ بالکل محفوظ تھا ۔ سوفی نے اپنا سکول کا کام نمٹانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے دماغ میں وہی کچھ

گھوم رہا تھا جو اس نے پڑھا تھا۔

اس نے پہلے اتنی شدت سے سوچ بچار کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ اب بھی نہیں تھی ـــــ لیکن حقیقتاً وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بالغ بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ پہلے ہی خرگوش کی ـــــ وہی خرگوش جسے کائنات کی اونچی ٹوپی سے برآمد کیا گیا تھا ـــــ نرم و گداز، نیم گرم اور تسکین بخش پوستین میں رینگنے لگی تھی۔ لیکن فلسفی اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے ـــــ وہ مرد ہے یا عورت؟ ـــــ اسے گردن سے دبوچ لیا ہے اور اسے کھینچ کر اوپر پوستین کی نوک پر کھڑا کردیا ہے جہاں وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی۔ اب وہ وہاں مہین بالوں کے انتہائی آخری سروں پر کھڑی ہے اور دنیا کا یوں مشاہدہ کر رہی ہے جیسے اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔

فلسفی نے اسے (گڑھے میں گرنے سے) بچا لیا تھا۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ گمنام خط نویس نے اسے روزمرہ کی زندگی کی فضولیات سے نجات دلا دی تھی۔

جب پانچ بجے امی گھر پہنچی، سوفی اسے گھسیٹ کر نشست گاہ میں لے گئی اور اسے بازوؤں والی کرسی میں دھکیل دیا۔

"امی ـــــ آپ کو یہ بات حیرت انگیز نہیں معلوم ہوتی کہ آپ زندہ ہیں؟"

"ہاں، میرا خیال ہے کہ ہوتی ہے ـــــ کبھی کبھی۔"

"کبھی کبھی؟ ہاں۔ لیکن ـــــ آپ کو یہ بات حیرت انگیز نہیں معلوم ہوتی کہ دنیا بہرحال موجود تو ہے؟"

"دیکھو سوفی، اس قسم کی گفتگو مت کرو۔"

"کیوں؟ آپ کے خیال میں دنیا بالکل نارمل ہے؟"

"خیر، تمہارے خیال میں نہیں ہے؟ بابا ہے، کم و بیش، بہرحال۔"

سوفی سمجھ گئی کہ فلسفی نے ٹھیک کہا تھا۔ بالغوں کے نزدیک دنیا ایک ایسی جگہ ہے جسے بہرحال موجود ہونا ہی تھا، پھر اس میں حیرانی کی کیا بات ہے! ان کے اس رویے کے بارے میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو لوریاں سنوانے اور اپنے اوپر بے رنگ اور پھیکی زندگی کی طلسمی نیند طاری کرانے کی اجازت دے دی ہے۔

"آپ دنیا سے اس قدر مانوس ہوچکی ہیں کہ آپ کو کسی چیز پر حیرت نہیں

ہوتی؟"

"یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو؟"

"میں آپ کے ہر چیز سے مانوس ہونے کی بات کر رہی تھی - یوں کہیں کہ آپ کے دماغ کے دیے بجھنے لگے ہیں -"

"سوفی، میں اس قسم کی باتیں سننا پسند نہیں کرتی -"

"بہت اچھا - میں ایک اور ڈھنگ سے اپنی بات کی وضاحت کرتی ہوں - آپ نے سفید خرگوش کی پوستین میں، جسے ابھی ابھی کائنات کی اونچی ٹوپی سے برآمد کیا گیا ہے، نیچے، بہت نیچے، کوئی آرام دہ جگہ ڈھونڈ لی ہے - ایک منٹ میں آپ چولہے پر آلوؤں کی ہانڈی چڑھا دیں گی، پھر آپ اخبار پڑھیں گی، آدھ گھنٹہ بعد قیلولہ فرمائیں گی اور پھر ٹی وی پر خبریں دیکھنے لگیں گی!"

اس کی ماں کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے - وہ واقعی اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی اور اس نے آلو چولہے پر رکھ دیے - کچھ دیر بعد وہ واپس نشست گاہ میں آ گئی اور اس مرتبہ اس نے سوفی کو بازوؤں والی کرسی پر دھکیل دیا۔

"مجھے تم سے لازماً بات کرنا ہوگی -" اس نے کہا - سوفی کو اس کے لہجے سے اندازہ ہو گیا کہ بات واقعی سنجیدہ ہے -

"ڈیر، تم کہیں منشیات کے چکر میں تو پھنس گئیں؟"

سوفی کی ہنسی چھوٹنا چاہتی تھی لیکن وہ سمجھ گئی کہ اس سے یہ سوال اب کیوں پوچھا جا رہا ہے -

"آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا؟" اس نے کہا - "اس قسم کا سوال پوچھ کر آپ نے اپنے آپ کو خبطی ثابت کر دیا ہے!"

اس شام منشیات یا سفید خرگوشوں کے متعلق مزید کوئی بات نہ ہوئی -

3 ۔ اساطیر

* * *

... نیکی اور بدی کی قوتوں کے مابین نازک توازن ...

اگلی صبح سوفی کو کوئی خط موصول نہ ہوا ۔ سکول میں یوں لگتا تھا جیسے آج کا دن ختم ہی نہیں ہوگا اور وہ بے حد بیزار ہو رہی تھی ۔ تفریح کے دوران میں اس نے جوآنا کے ساتھ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی شائستگی کا مظاہرہ کیا ۔ واپسی پر راستے میں انہوں نے طے کیا کہ جونہی جنگل میں نمی کم ہوئی ' وہ وہاں کسی رات کیمپ لگائیں گی ۔

طویل وقت گزرنے کے بعد ' جو لامتناہی معلوم ہوتا تھا ' وہ ایک بار پھر ڈاک ڈبے کے پاس کھڑی تھی ۔ اس نے جو پہلا خط کھولا ' اس پر میکسیکو کی مہر لگی ہوئی تھی ۔ یہ اس کے ابا نے بھیجا تھا ۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے گھر کی یاد بہت ستاتی ہے اور یہ کہ اس نے پہلی مرتبہ شطرنج میں چیف انجینیر کو مات دی ہے ۔ علاوہ ازیں وہ سردیوں کی چھٹیاں گزارنے کے بعد اپنے ساتھ جو ڈھیروں کتابیں لایا تھا ' وہ اس نے تقریباً سب کی سب پڑھ ڈالی ہیں ۔

اور ہاں وہ بھی ـــــ خاکی لفافہ جس پر اس کا نام تحریر تھا ـــــ آ گیا تھا ۔ اس نے اپنا بستہ اور دوسرے خطوط گھر کے اندر رکھے اور بھاگتی دوڑتی اپنے خفیہ ٹھکانے پہنچ گئی ۔ اس نے نئے ٹائپ شدہ کاغذات نکالے اور پڑھنے لگی :

دنیا کی اساطیری تصویر

ہیلو سوفی ، کیسی ہو ؟ ہمیں بہت کچھ کرنا ہے ۔ چنانچہ ہم بلا تاخیر شروع ہو جاتے ہیں۔

فلسفے سے ہماری مراد اس نئے طرزِ فکر سے ہے جو مسیح کی پیدائش سے تقریباً چھ سو سال پہلے بتدریج یونان میں پروان چڑھا تھا ۔ اس سے پہلے لوگ اپنے تمام سوالوں کے جواب مختلف مذاہب میں ڈھونڈتے تھے ۔ یہ مذہبی تشریحات اساطیر (myths) کی شکل میں ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہتی تھیں ۔ اسطورہ (یا متھ) دیوتاؤں کے متعلق کہانی ہوتی ہے ۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ زندگی جیسی کیسی ہے ، کیوں ہے۔

ہزاروں سالوں کے دوران میں فلسفیانہ سوالوں کی اسطوری تفسیروں کے پوری دنیا میں انبار لگ گئے ۔ یونانی فلسفیوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان تفسیروں پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

یہ سمجھنے کے لیے کہ ابتدائی فلسفی کس طرح سوچتے تھے ، ہمیں پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ دنیا کی اساطیری تصویر آخر تھی کیا ۔ مثال کے طور پر ہم چند نورڈیائی (Nordic) (1) اسطورے لیتے ہیں ۔ (بانس بریلی لے جانے کی ضرورت نہیں ۔)

تم نے غالباً تھور (Thor) (2) اور اس کے ہتھوڑے کے متعلق سنا ہوگا ۔ ناروے میں عیسائیت پھیلنے سے پہلے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ تھور رتھ پر سوار ہوکر ، جسے دو بکرے کھینچتے تھے ، آسمان کے آر پار جاتا ہے ۔ ناروی زبان میں Thunder (رعد) کے لیے لفظ Thordon ہے اور اس کا مطلب "رعد کی گرج" ہے ۔ سویڈش زبان میں رعد کے لیے لفظ aska ہے ۔ اس کی ابتدائی صورت as-aka تھی اور اس کا مطلب آسمان پر "دیوتا کا سفر" ہے ۔

جب بادل گرجتا ہے اور بجلی چمکتی ہے ، بارش بھی

برستی ہے جو وائی کنگ (3) کسانوں کے لیے بہت ضروری ہوتی تھی - چنانچہ تھور کی زرخیزی کے دیوتا کی حیثیت سے پرستش ہوتی تھی -

چنانچہ بارش کی اساطیری تشریح یوں کی جاتی تھی کہ تھور اپنا ہتھوڑا گھما رہا ہے - اور جب بارش ہوتی ، کھیتوں میں بیج پھوٹتے اور پودے پروان چڑھنے لگتے -

کھیت میں پودے کیسے پھلتے پھوٹتے اور بار آور ہوتے ہیں ، یہ چیزیں لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن اتنا واضح تھا کہ کسی نہ کسی طرح ان کا تعلق بارش سے بنتا ہے - اور چونکہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ بارش کا کسی نہ کسی طرح تھور سے تعلق ہے ، تھور سکنڈے نیویا کے لوگوں کے اہم ترین دیوتاؤں میں شمار ہونے لگا -

تھور کیوں اہم تھا ، اس کی ایک اور وجہ بھی تھی اور اس وجہ کا تعلق ساری دنیا کے نظم سے تھا -

وائی کنگ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ آباد شدہ دنیا ایک جزیرے پر مشتمل ہے جسے ہمیشہ بیرونی خطرات کا سامنا رہتا ہے - وہ دنیا کے اس حصے کو مڈگارڈ (Midgard) کہتے تھے - اس کا مطلب وسطی سلطنت ہے - اس مڈگارڈ یا وسطی سلطنت کے اندر ایزگارڈ (Asgard) یا "دیوتاؤں کی اقلیم" تھی -

مڈگارڈ کے باہر اٹ گارڈ (Utgard) کی سلطنت یا دغا باز دیووں کی مملکت تھی - یہ دیو دنیا کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور اس مقصد کے لیے ہر قسم کے عیارانہ ہتھکنڈے اور چالیں استعمال کرتے رہتے تھے - اس طرح کے بد فطرت عفریتوں کو اکثر " انتشار اور بد نظمی کی قوتیں " کہا جاتا ہے - نہ صرف نورس (Norse) صنمیات میں بلکہ دنیا کی تقریباً تمام دوسری ثقافتوں میں بھی لوگوں نے دریافت کیا کہ نیکی اور بدی کی قوتوں کے مابین بڑا نازک توازن ہے -

وسطی سلطنت کو عفریت جن مختلف طریقوں سے تباہ کرسکتے تھے ، ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ زرخیزی کی دیوی فریجا (Freyja) (4) کو زبردستی اٹھا کر لے جاتے - اگر انہوں نے یہ

کام کر دکھایا ، پھر نہ کھیتوں میں کچھ اگے گا اور نہ عورتیں بچوں کو جنم دے سکیں گی ۔ چنانچہ یہ انتہائی ضروری تھا کہ کسی نہ کسی کسی طور ان عفریتوں کی روک تھام کی جائے ۔

دیووں کے ساتھ اس کشمکش میں تھور مرکزی کردار تھا ۔ اس کا ہتھوڑا محض بارش ہی نہیں برساتا تھا بلکہ اس سے بڑھ کر کام کرسکتا تھا ۔ یہ بد نظمی اور انتشار کی خطرناک قوتوں کے خلاف جدوجہد میں کلیدی ہتھیار تھا ۔ اس سے وہ تقریباً غیر محدود قوت کا مالک بن جاتا تھا ۔ مثلاً وہ اس سے دیووں کو اپنا نشانہ بناسکتا اور انہیں ہلاک کرسکتا تھا ۔ اور پھر اسے کبھی یہ پریشانی نہیں ہوتی تھی کہ وہ اسے گنوا دے گا کیونکہ بوم رینگ (boomerang)(5) کی طرح یہ ہمیشہ اس کے پاس واپس آجاتا تھا ۔

فطرت کا توازن کیسے قائم رکھا جاتا تھا اور نیکی اور بدی کے مابین مسلسل کشمکش کیوں جاری رہتی تھی ، یہ اس کی اساطیری وضاحت ہے ۔ اور عین مین وضاحت کی یہی وہ قسم ہے جسے فلسفیوں نے (بعد ازاں) مسترد کیا تھا ۔

لیکن سوال محض وضاحتوں کا نہیں تھا ۔

جب خشک سالی اور طاعون جیسی بلائیں سروں پر منڈلا رہی ہوتیں ، یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ فانی انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے اور انتظار کرتے رہتے کہ (غیر فانی) دیوتا کب مداخلت کرتے ہیں ۔ انہیں بدی کی قوتوں کے خلاف جدوجہد میں کچھ نہ کچھ خود بھی کرنا پڑتا تھا ۔ وہ یہ کام مختلف مذہبی رسوم کی ادائیگی یا شعائر کی پابندی سے کرتے ۔

نورس زمانے کی اہم ترین مذہبی رسم چڑھاوا یا نذر نیاز تھی ۔ کسی دیوتا کے حضور نذر پیش کرنے کا نتیجہ اس دیوتا کی قوت بڑھانے کی اصورت میں نکلتا تھا ۔ مثلاً انسانوں پر یہ لازم آتا تھا کہ وہ دیوتاؤں کے حضور نذر پیش کریں تاکہ ان میں انتشار اور بدنظمی کی قوتوں کے خلاف جدوجہد کرنے اور انہیں تسخیر کرنے کی قوت پیدا ہوسکے ۔ اکثر یہ مقصد کسی دیوتا کے نام پر کسی جانور کی قربانی دے کر حاصل کیا جاتا تھا ۔ تھور کو جو بھینٹ دی جاتی تھی ، وہ عام طور پر بکری کی ہوتی تھی ۔ جہاں تک اوڈن

(Odin) (6) کا تعلق ہے ' اس کی بارگاہ میں بعض اوقات انسانوں کی قربانی بھی دی جاتی تھی۔

سکنڈے نیویا کے ممالک کا مشہور ترین اسطورہ (یامتھ) "ایڈک نظم " (7) " تھرانم کا منظوم قصہ " (The Lay of Thr-"ym") میں بیان ہوا ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک روز جب تھور نیند سے بیدار ہوتا ہے ' اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہتھوڑا غائب ہے ۔ اس پر اسے اتنا جلال آتا ہے کہ اس کے ہاتھ کانپنے اور داڑھی لرزنے لگتی ہے ۔ وہ اپنے دست راست لوکی (Loki) کی معیت میں فریجا کے پاس پہنچتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے کہ کیا وہ اپنے پر عاریتاً لوکی کو دے سکتی ہے تاکہ وہ دیووں کی سرزمین جوتون ہائیم جاسکے اور معلوم کرسکے کہ کیا تھور کا ہتھوڑا وہ تو نہیں چرا کرلے گئے۔

جوتون ہائیم میں لوکی کی ملاقات دیووں کے بادشاہ تھرانم سے ہوتی ہے ۔ تھرانم واقعی شیخی بگھارنے لگتا ہے کہ ہتھوڑا وہی چرا کر لایا ہے اور اس نے اسے زمین کے نیچے سات لیگ (اکیس میل) کی گہرائی میں چھپا رکھا ہے ۔ وہ مزید کہتا ہے کہ جب تک فریجا کو اس کی دلہن بنا کر اسے پیش نہیں کیا جاتا ' دیوتاؤں کو ہتھوڑا واپس نہیں ملے گا۔

سوفی ' کیا تم اس معاملے کی اپنے ذہن میں تصویر بناسکتی ہو ؛ دیکھتے ہی دیکھتے نیک دیوتاؤں کو ایک ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑجاتا ہے جس میں کسی کے یرغمال بنائے جانے کی تمام خصوصیات موجود تھیں ۔ دیووں نے دیوتاؤں کے انتہائی اہم دفاعی ہتھیار پر قبضہ کرلیا ہے ۔ یہ سراسر ناقابل قبول صورت حال ہے ۔جب تک تھور کا ہتھوڑا دیووں کے پاس رہتا ہے ' انہیں دیوتاؤں اور انسانوں پر کامل تسلط حاصل رہے گا ۔ ہتھوڑے کے عوض وہ فریجا کا مطالبہ کر رہے ہیں ۔ لیکن یہ مطالبہ بھی اتنا ہی ناقابل قبول ہے ۔ اگر دیوتا اپنی زرخیزی کی دیوی سے ــــــ وہ جو کہ ساری ذی حیات مخلوق کا تحفظ کرتی ہے ــــــ دست بردار ہوجاتے ہیں ' کھیتوں اور میدانوں سے گھاس عنقا ہوجائے گی اور تمام دیوتا اور انسان فنا ہوجائیں گے ۔ مذاکرات میں تعطل آجاتا

ہے۔

اسطورہ آگے چلتا ہے اور بتاتا ہے کہ لوکی دیوتاؤں کے شہر ایزگارڈ واپس آجاتا ہے اور فریجا سے کہتا ہے : " عروسی ملبوسات پہن لو کیونکہ تمہیں (افسوس ، صد افسوس !) دیووں کے بادشاہ کے ساتھ بیاہ کرنا ہے ۔ " فریجا غصے سے پھنکارنے لگتی ہے اور جواب دیتی ہے : " میری جوتی کرانے گی یہ بیاہ ! لوگ کیا کہیں گے ، یہی نا کہ مجھے مردوں کا خبط ہوگیا ہے ۔ اسی لیے اب دیو کے ساتھ شادی کرانے کے لیے تیار ہوگئی ہوں۔"

تب دیوتا ہائیم ڈال (Heimdall) کو ایک انوکھا خیال سوجھتا ہے ۔ وہ تجویز پیش کرتا ہے کہ دلہن کا لباس تھور پہن لے ۔ اگر وہ اپنے بال بڑھا لے اور اپنے بلاؤز کے نیچے دو پتھر باندھ لے ، وہ بالکل عورت معلوم ہوگا ۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ تھور اس تجویز پر کسی خاص جوش و خروش کا اظہار نہیں کرتا ، لیکن آخر اسے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنا ہتھوڑا واپس حاصل کرسکتا ہے۔

چنانچہ تھور عروسی لباس پہنائے جانے پر رضامند ہوجاتا ہے۔لوکی کو "دلہن کی رفیقہ" بنادیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے کی اصطلاح میں تھور اور لوکی " انسداد دہشت گردی کا سکواڈ " ہیں ۔ عورتوں کے بھیس میں ان کا فریضہ دیووں کے گڑھ میں نقب لگانا اور تھور کا ہتھوڑا واپس لانا ہے۔

جب دیوتا جوتون ہائیم پہنچتے ہیں ، دیو دعوت عروسی کی تیاریاں شروع کردیتے ہیں ۔ دعوت کے دوران میں دلہن ـــــ یعنی تھور ـــــ پورا بیل اور آٹھ سامن مچھلیاں کھا " جاتی " ہے ۔ وہ بیئر کے تین مشکیزے بھی پی " جاتی " ہے ۔ اس پر تھرائم حیرت زدہ رہ جاتا ہے ۔ " کمانڈووں " کی صحیح شناخت تقریباً منکشف ہوجاتی ہے لیکن لوکی صورت حال کو سنبھال لیتا ہے ۔ وہ کہتا ہے : " فریجا کو جوتون ہائیم آنے کا اتنا اشتیاق تھا کہ وہ پورا ہفتہ کھانا بھی نہ کھا سکی۔ "اور یوں خطرہ ٹل جاتا ہے۔

جب تھرائم دلہن کا بوسہ لینے کے لیے نقاب سرکاتا ہے ، وہ یہ دیکھ کر سناٹے میں آجاتا ہے کہ وہ تھور کی انگاروں کی مانند

دکھی آنکھوں میں جھانک رہا ہے ۔ ایک بار پھر لوکی اپنا ہاتھ دکھاتا
اور صورت حال سنبھالتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ دلہن شادی کے خیال
پر اتنی دیوانی ہوئی جا رہی تھی کہ وہ پورا ہفتہ ڈھنگ سے سو بھی نہ
سکی ۔ اس پر تھرائم حکم دیتا ہے کہ ہتھوڑا حاضر کیا جائے اور شادی
کی رسم کے دوران میں دلہن کی گود میں رکھ دیا جائے ۔

جب تھور کو ہتھوڑا پیش کیا جاتا ہے ، وہ فلک شگاف
قہقہہ لگاتا ہے ۔ پہلے تو وہ اس سے تھرائم کو ہلاک کرتا ہے اور
اس کے بعد وہ دیووں اور ان کے تمام عزیز و اقارب کو ٹھکانے
لگا دیتا ہے اور یوں یرغمال بنائے جانے کے بھیانک معاملے کا
انجام بخیر ہو جاتا ہے ۔ تھور ــــ جسے دیوتاؤں کا بیٹ مین
(Batman) (9) یا جیمز بونڈ کہنا چاہیے ــــ ایک بار پھر بدی
کی قوتوں پر غالب آجاتا ہے ۔

سو ، جہاں تک اسطورے کا تعلق ہے ، وہ تو ختم ہوا ۔
لیکن اس کے پیچھے مفہوم کیا ہے ؟ یہ محض دل بہلانے کے لیے
نہیں گھڑا گیا تھا ۔ اسطورہ کسی اور چیز کی وضاحت کرنے کی بھی
کوشش کرتا ہے ۔ اس کی ایک امکانی تشریح یہ ہے ۔

جب کسی سال بارش نہ ہوتی ، لوگ توجیہہ کرنے کی
کوشش کرتے کہ آخر مینہ کیوں نہیں برسا ۔ کہیں اس کی وجہ یہ
تو نہیں تھی کہ دیووں نے تھور کا ہتھوڑا چرا لیا تھا؟

سال کے دوران میں موسم جس طرح بدلتے ہیں ،
اسطورے میں شاید ان کی تشریح کرنے کی کوشش کی گئی تھی ۔
سردیوں میں فطرت مر جاتی ہے کیونکہ تھور کا ہتھوڑا جوتون ہائیم
پہنچ چکا ہوتا ہے ۔ لیکن جب وہ اسے واپس لانے میں کامیاب
ہو جاتا ہے ، بہار بھی آجاتی ہے ۔ چنانچہ اسطوروں کے ذریعے
لوگوں کو وہ باتیں سمجھانے کی کوشش کی جاتی تھی جو عام طور پر
ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں ۔

لیکن اسطورہ محض توضیح و تشریح کا کام نہیں دیتا تھا ۔
لوگ اسطورے سے وابستہ رسوم کی ادائیگی بھی کرتے تھے ۔ ہم
تصور کر سکتے ہیں کہ جب خشک سالی آتی تھی یا فصلیں خراب ہوتی
تھیں تو لوگوں کا رد عمل کیا ہوتا ہوگا ۔ یہی نا کہ وہ اسطورے میں

بیان کردہ واقعات ڈرامے کی صورت میں پیش کرتے ہوں گے ۔ شاید گاؤں کا کوئی مرد دلہن کا لباس پہن لیتا ہوگا ۔ چھاتیوں کی جگہ پتھر رکھ لیے جاتے ہوں گے ـــــ تاکہ دیووں سے ہتھوڑا واپس ہتھیایا جاسکے ۔ بارش برسانے کے لیے لوگ اس قسم کی کارروائیوں سے کوئی نہ کوئی اقدام کرتے ہوں گئے تاکہ ان کے کھیت سیراب ہوسکیں اور ان میں فصلیں اگائی جاسکیں۔

لوگ فطرت کے عمل کو تیز کرنے کے لیے کس طرح اپنے اسطوروں کو ڈرامائی شکل میں پیش کرتے تھے ، اس کی لاتعداد مثالیں دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی ملتی ہیں۔

اب تک ہم نے نورس ضمیات پر محض سرسری نظر ڈالی ہے ۔ لیکن تھور اور اوڈن ، فریر (10) اور فریجا ، ہوڈر (Hoder) اور بالڈر (11) (Balder) اور متعدد دیگر دیوتاؤں کے متعلق اتنے اساطیر ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں ۔ اس قسم کے اساطیری تصورات کو دنیا بھر میں فروغ حاصل ہورہا تھا کہ فلسفیوں نے ان میں دخل دینا شروع کردیا۔

جب یونان میں فلسفے کی اولین صورت ارتقا کے منازل طے کر رہی تھی ، وہاں بھی دنیا کی اساطیری تصویر موجود تھی ۔ یونانی دیوتاؤں کی کہانیاں صدیوں سے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہی تھیں ۔ یونان میں بے شمار دیوتاؤں کو مانا جاتا تھا ۔ ان میں سے چند ایک کے نام زیوس (Zeus) (دیوتاؤں کا دیوتا ، افلاک کا حاکم اور متعدد دیوتاؤں اور انسانی سورماؤں کا باپ) ، اپالو (سورج ، مستقبل بینی ، موسیقی ، شاعری اور طب کا دیوتا) ، ایتھینے (Athene) (دانش اور فنون کی دیوی ۔ اسے ایتھینا بھی کہا جاتا تھا) ، ہیرا (زیوس کی بہن اور اہلیہ) ، دیونوسوس (Dionysos یا Bacchus) (شراب و شباب کا دیوتا) ، ایسکلے پیوس (Aschlepios) (اپالو کا بیٹا اور طب کا دیوتا) ، ہیراکلیس (Heracles) یا ہرکولیس (زیوس کا بیٹا اور غیر معمولی طاقت کا مالک) اور ہیفاسٹوس (Hephaestos) (آگ کا لنگڑا دیوتا) تھے۔

یونانی اساطیر کا بیشتر حصہ تقریباً سات سو سال قبل مسیح

کے مشہور زمانہ شاعر ہومر اور ایک دوسرے نظم گو ہیسیوڈ (Hesiod) (12) نے تحریر کیا تھا ۔ اس سے بالکل نئی صورت حال وجود میں آگئی ۔ اب جب کہ اساطیر تحریری شکل میں سامنے تھے، ان پر بحث ممکن ہو گئی۔

ابتدائی یونانی فلسفیوں نے ہومر کی صنمیات کو آڑے ہاتھوں لیا کیونکہ دیوتا فانی انسانوں سے کچھ زیادہ ہی مشابہ تھے اور بالکل انہی کی طرح انا پسند اور دغاباز تھے ۔ پہلی مرتبہ یہ کہا گیا کہ اساطیر محض انسانی تصورات ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اس نقطہ نظر کی ترجمانی کرنے والوں میں ایک فلسفی زینوفانیس (Xenophanes) (13) تھا جو تقریباً پانچ سو ستر سال قبل مسیح پیدا ہوا تھا ۔ وہ کہتا تھا : "انسانوں نے دیوتا اپنی شبیہ (image) کے مطابق تخلیق کر لیے ہیں ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دیوتا بھی ہماری طرح پیدا ہوتے ہیں، اور ہماری ہی طرح ان کے بھی اجسام، لباس اور زبانیں (Languages) ہوتی ہیں ۔ اہل حبشہ کا عقیدہ ہے کہ دیوتا سیاہ فام ہیں اور ان کی ناکیں چپٹی ہیں۔ اہل تھریس (14) کا خیال تھا کہ ان کی آنکھیں نیلی اور بال سرخی مائل ہیں۔ اگر بیل، گھوڑے اور شیر دیوتاؤں کی تصویر کشی کر سکتے، وہ انہیں بیل، گھوڑے اور شیر بنا کر پیش کرتے!"

اس زمانے کے دوران میں خود یونان میں اور جنوبی اٹلی اور ایشیائے کوچک کے یونانی مقبوضات میں متعدد شہری ریاستوں (City - states) کی بنیاد رکھی گئی جہاں تمام جسمانی مشقت کے کام غلام کرتے تھے اور شہریوں کو اپنا وقت سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں میں صرف کرنے کی فرصت مل جاتی تھی۔

اس شہری ماحول میں لوگوں نے بالکل نئے انداز سے سوچنا شروع کر دیا ۔ کاملاً اپنی جانب سے ہر شہری یہ سوال اٹھا سکتا تھا کہ معاشرہ کس طرح منظم کیا جانا چاہیے ۔ یوں افراد قدیم اساطیر کو بیچ میں لائے بغیر فلسفیانہ سوالات پوچھ سکتے تھے۔

اساطیری طرز فکر سے جو یہ نئی صورت ظہور میں آئی، اس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ اس کی اساس تجربے (experience) اور عقل (reason) پر رکھی گئی تھی ۔ فطرت میں جو عمل کاریاں

(processes) کار فرما ہیں ' شروع کے یونانی فلسفیوں کا مقصد ان کی مافوق الفطرت (supernatural) نہیں بلکہ فطری (-natu ral) توضیح دریافت کرنا تھا۔

سوفی اپنے مخفیہ ٹھکانے سے باہر نکلی اور وسیع و عریض باغ میں بے مقصد گھومنے پھرنے لگی ۔ اس نے جو کچھ سکول میں ' بالخصوص سائنس کی کلاسوں میں ' پڑھا تھا ' وہ اسے بھلانے کی کوشش کرنے لگی :

اگر وہ فطرت کے متعلق کچھ بھی جانے بغیر اس باغ میں بڑھی پلی ہوتی ' اس کے موسم بہار کے متعلق کیا احساسات ہوتے ؟

ایک روز جو اچانک مینہ برسنے لگتا ہے ' کیا وہ اس کی کوئی توضیح گھڑنے کی کوشش کرتی ؟ یہ جو برف پڑتی ہے ' وہ کہاں جاتی ہے ' اور سورج صبح کو کیوں طلوع ہوتا ہے ' کیا وہ ان چیزوں کے متعلق کوئی دور از کار مفروضہ گھڑتی ؟

ہاں ' وہ یقیناً یہی کرتی اور ایک خیالی کہانی کا تانا بانا بننے لگی :

سرما نے دھرتی کو اپنی برفیلی گرفت میں جکڑ لیا تھا کیونکہ بد قماش مورنیٹ نے حسین و خوب رو شہزادی سیکینا کو یخ بستہ زندان میں اسیر کردیا تھا ۔ لیکن ایک صبح شجاع شہزادہ براواٹو آیا اور اسے چھڑا کر لے گیا ۔ سیکینا اتنا خوش تھی کہ اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے اور وہ چراگاہوں میں ناچنے اور ایک نغمہ الاپنے لگی ' جو اس نے زندان کے مرطوب اور تاریک تہ خانے میں ترتیب دیا تھا ۔ دھرتی اور درخت اتنا متاثر ہوئے کہ ان پر تمام برف پگھل پگھل کر آنسوؤں میں تبدیل ہوگئی ۔ لیکن پھر سورج نکل آیا اور اس کی تمازت نے تمام آنسو خشک کردیے ۔ پرندے سیکینا کے گیت کی نقالی کر رہے تھے اور جب حسین و جمیل شہزادی نے اپنی سنہری زلفیں پیچھے گرائیں ' اس کے بالوں کے چند لچھے دھرتی پر گر پڑے اور وہ کھیت کے پھول بن گئے . . .

سوفی کو اپنی خوبصورت کہانی پسند آئی ۔ موسم جس طرح بدلتے رہتے ہیں ' اگر اسے اس کی اور کوئی توجیہ معلوم نہ ہوتی ' اسے یقین ہونے لگا کہ وہ بالآخر اپنی ہی کہانی پر ایمان لے آتی ۔

وہ سمجھ گئی کہ لوگوں کو ہمیشہ سے یہ جاننے کی خواہش رہی ہے کہ فطرت کس طرح کام کرتی ہے ۔ اگر ان کے پاس اپنی اپنی توضیحات نہ ہوتیں تو ان کے لیے شاید

جینا دوبھر ہو جاتا ۔ اور انہوں نے یہ تمام اساطیر اس زمانے میں گھڑے جب سائنس نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

4۔ طبعی فلسفی

* * *

. . . عدم سے عدم ھی بر آمد ھو سکتا ھے . . .

جب اس سہ پہر سوفی کی والدہ کام سے واپس آئی ' سوفی گلائیڈر میں بیٹھی فلسفے کے نصاب اور بڑے مولر کنیگ کے مابین ' جسے اپنے باپ کا ارسال کردہ سالگرہ کا کارڈ نہیں مل سکے گا ' امکانی تعلق پر غور کر رہی تھی۔

اس کی ماں نے باغ کے دوسرے سرے سے اسے آواز دی اور کہا: "سوفی ' تمہارا خط!"

سوفی کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔ وہ ڈاک ڈبے سے ساری ڈاک نکال لائی تھی۔ پھر یہ خط؟ ضرور فلسفی کا ہو گا۔ وہ اپنی ماں کو کیا بتائے گی؟

"اس پر ٹکٹ نہیں ہے۔ شاید کوئی محبت نامہ ہے!"

سوفی نے خط پکڑ لیا۔

"کھولو گی نہیں؟"

اسے کوئی عذر ڈھونڈنا پڑا۔

"آپ نے کبھی کسی ایسی لڑکی کے متعلق سنا یا پڑھا ہے کہ وہ محبت نامہ کھول رہی ہو اور اس کی ماں اس کے سر پر کھڑی ہو؟"

ماں کو یہی سمجھنے دو کہ یہ محبت نامہ ہے۔ اگرچہ یہ بذات خود پریشان کن بات تھی لیکن اگر اس کی ماں کو معلوم ہو گیا کہ وہ کسی بالکل اجنبی شخص سے ' جو خیر سے

فلسفی ہے اور اس کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل کھیل رہا ہے، مراسلاتی تعلیم حاصل کر رہی ہے، معاملہ بالکل ہی بگڑ جائے گا۔

یہ چھوٹا سفید لفافہ تھا۔ جب سوفی بالائی منزل پر اپنے کمرے میں پہنچی، اس نے تین نئے سوال پڑھے:

کیا کوئی ایسا بنیادی مادا (1) ہے جس سے باقی تمام اشیا بنی ہوں؟
کیا پانی انگوری شراب میں تبدیل ہو سکتا ہے؟
مٹی اور پانی مل کر کس طرح زندہ مینڈک پیدا کرتے ہیں؟

سوفی کو سوال خاصے احمقانہ معلوم ہوئے، تاہم وہ ساری شام اس کے دماغ میں بھنبھناتے رہے۔ جب وہ اگلے روز سکول گئی تب بھی وہ ایک ایک کرکے انہی کا جائزہ لے رہی تھی۔

کیا کوئی ایسا "بنیادی مادا" ہو سکتا ہے جس سے باقی تمام اشیا بنی ہوں؛ اگر کوئی ایسا مادا ہے، پھر یہ اچانک کسی پھول یا ہاتھی میں کیسے تبدیل ہو سکتا ہے؟

یہی اعتراض اس سوال پر وارد ہوتا تھا کہ کیا پانی مے انگور میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ سوفی نے یہ مذہبی حکایت تو سنی تھی کہ کس طرح مسیح نے پانی کو مے انگور میں تبدیل کر دیا تھا لیکن اس نے کبھی اسے لفظی معنوں میں نہیں لیا تھا اور اگر مسیح نے واقعی پانی کو مے انگور میں تبدیل کر دیا تھا، پھر یہ معجزہ تھا اور معجزہ وہ چیز ہوتا ہے جو عام معمول کے برعکس ہو۔ سوفی کو معلوم تھا کہ صرف مے انگور میں ہی نہیں، بلکہ ہر اس شے میں، جو بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے، پانی کثیر مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن اگر کھیرے میں بچانوے فیصد بھی پانی ہو، پھر بھی اس میں کوئی نہ کوئی دوسری چیز موجود ہو گی کیونکہ کھیرا کھیرا ہے، پانی نہیں۔

پھر ایک سوال مینڈک کے متعلق تھا۔ اس کے فلسفے کے استاد نے مینڈکوں کے متعلق ایسی عجیب و غریب اور انوکھی بات کہی ہے جو کسی نے سنی نہ پڑھی ہو گی۔

سوفی غالباً یہ تو مان سکتی تھی کہ مینڈک پانی اور مٹی پر مشتمل ہوتا ہے لیکن اس صورت میں مٹی ایک سے زیادہ مادے پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اگر مٹی بے شمار مختلف مادوں پر مشتمل ہے، پھر یہ صریحاً ممکن ہے کہ مٹی اور پانی مل کر کوئی مینڈک بنا دیں۔

Scanned by CamScanner

یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ مٹی اور پانی کو پہلے انڈوں اور پھر بچوں کی شکل اختیار کرنا پڑے گی کیونکہ مینڈک کسی گوبھی کے کھیت سے تو نہیں اگ سکتا خواہ آپ اسے کتنا ہی پانی کیوں نہ دیں۔

جب وہ اس روز سکول سے واپس گھر پہنچی 'ڈاک ڈبے میں اس کے لیے خاصا بڑا لفافہ پڑا تھا۔ دوسرے ایام کی طرح وہ آج بھی اپنے خفیہ ٹھکانے میں جا بیٹھی۔

فلسفی کا منصوبہ

تو ہماری پھر ملاقات ہو ہی گئی ! آج ہم سفید خرگوش یا اس قسم کی دوسری چیزوں میں پڑے بغیر اپنا سبق شروع کردیں گے۔

قدیم یونانیوں سے لے کر ہمارے زمانے تک لوگ کس طرح فلسفے کے متعلق سوچ بچار کرتے رہے ہیں ' میں اس کا ذکر پوری تفصیل سے تو نہیں کرسکوں گا تاہم جو خاکہ میں پیش کروں گا وہ جامع ضرور ہوگا ۔ لیکن جن باتوں کو ہم موضوع بحث بنائیں گے ' ان میں زمانی اعتبار سے صحیح ترتیب کا خیال رکھا جائے گا۔

چونکہ بعض فلسفی بالکل مختلف عہد میں ـــ اور غالباً ثقافتی اعتبار سے ہم سے مختلف حالات میں ـــ رہتے تھے ' ہمارے لیے اچھی بات یہ ہوگی کہ ہم کوشش کریں اور دیکھیں کہ ہر فلسفی کا منصوبہ یا پراجیکٹ کیا تھا ۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ صحیح صحیح سمجھنے اور معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کوئی خاص فلسفی خاص طور پر کیا دریافت کرنے کے در پے تھا ۔ شاید ایک فلسفی یہ جاننا چاہتا ہوگا کہ پودے اور جانور کس طرح وجود میں آئے ۔ شاید کوئی دوسرا یہ معلوم کرنا چاہتا ہوگا کہ آیا کوئی خدا ہے یا انسان کے اندر کوئی غیر فانی روح ہے۔

جب ایک مرتبہ ہم نے یہ طے کرلیا کہ کسی خاص فلسفی کا پراجیکٹ کیا ہے ' اس کے انداز فکر کو سمجھنا نسبتاً آسان

ہوجائے گا کیونکہ ایک بھی فلسفی ایسا نہیں جو سارے فلسفے کو اپنا درد سر بنالیتا ہو۔

جب میں نے الفاظ "اس کے انداز فکر" لکھے تھے تو میری مراد مرد فلسفیوں سے تھی ، خاتون فلسفیوں سے نہیں ، کیونکہ فلسفے کی کہانی بھی مردوں کی کہانی ہے ۔ پرانے زمانوں میں عورتوں کو ان کی نسوانی حیثیت سے بھی اور سوچنے سمجھنے والی مخلوق کی حیثیت سے بھی ، دونوں ہی طرح دبا کر رکھا جاتا تھا اور یہ بات بہت قابل افسوس ہے کیونکہ اس رویے کا نتیجہ بہت انتہائی اہم نوعیت کے تجربوں (experiences) سے محرومی کی شکل میں برآمد ہوا ہے ۔ صرف موجودہ صدی میں خواتین نے فلسفے کی تاریخ پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں ، اس سے پہلے انہیں اس کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔

میرا تمہیں ہوم ورک دینے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں ـــــ مثلاً میں تمہیں حساب کا یا اس سے ملتا جلتا کوئی سوال نہیں دوں گا ۔ رہی انگریزی افعال کی گردان ، تو مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ۔ تاہم کبھی کبھی میں تمہیں خامہ فرسائی کے لیے کوئی چھوٹا موٹا موضوع دے دیا کروں گا۔

اگر تمہیں یہ شرطیں منظور ہوں ، پھر ہم شروع ہوجاتے ہیں۔

طبعی فلسفی

یونان کے قدیم ترین فلسفیوں کو بعض اوقات طبعی فلسفی (natural philosophers) کہا جاتا ہے کیونکہ ان کا سروکار زیادہ تر طبعی دنیا یا دنیائے فطرت اور اس کی عمل کاریوں (processes) سے تھا ۔ ہم پہلے ہی اپنے آپ سے پوچھ چکے ہیں کہ ہر چیز کہاں سے آتی ہے ۔ آج کل بے شمار لوگوں کا خیال ہے کہ کسی نہ کسی زمانے میں کوئی نہ کوئی شے عدم سے وجود میں آئی ہوگی ۔ یونانیوں میں یہ خیال عام نہیں تھا ۔ کسی نہ کسی وجہ

سے ان کے ذہنوں میں یہ مفروضہ راسخ ہوچکا تھا کہ "کوئی چیز" ہمیشہ موجود رہی ہے۔

چنانچہ یہ سوال کہ ہر شے عدم سے کیسے وجود میں آسکتی ہے، اتنا اہم سوال نہیں تھا۔ اس کے برعکس یونانیوں کو تعجب اس بات پر ہوتا تھا کہ جیتی جاگتی مچھلیاں پانی سے کیسے وجود میں آتی ہیں اور مردہ زمین سے عظیم الجثہ درخت اور چمکتے دمکتے پھول کیسے پیدا ہوجاتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ بچہ اپنی ماں کے رحم سے کیسے برآمد ہوتا ہے، اس پر انہیں جو حیرت ہوتی ہوگی، اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں!

فلسفیوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ فطرت مسلسل تبدیلی کے عمل میں سے گزرتی رہتی ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ یہ تبدیلی رونما کیسے ہوتی ہے؟

مثلاً ایک چیز جو پہلے مادا (substance) تھی، جیتی جاگتی مخلوق کیسے بن گئی؟

تمام اولین فلسفیوں کا ایقان تھا کہ کوئی نہ کوئی بنیادی مادا ایسا لازماً ہونا چاہیے جو ان تمام تبدیلیوں کا ماخذ ہے۔ وہ اس نتیجے پر کیسے پہنچے، اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ خیال بتدریج عام ہونے لگا کہ کوئی نہ کوئی بنیادی مادا لازماً ہونا چاہیے جو فطرت کی ان تمام تبدیلیوں کا مخفی سبب ہے۔ "کوئی شے" ایسی ہونا چاہیے جس سے باقی تمام اشیا نکلتی ہیں اور پھر اسی میں واپس چلی جاتی ہیں۔

درحقیقت ہمارے لیے دلچسپی کی بات یہ نہیں کہ ان ابتدائی فلسفیوں نے اپنی الجھن کے کیا حل تلاش کئے، بلکہ یہ ہے کہ وہ سوال کس قسم کے پوچھتے تھے اور وہ جوابات کس قسم کے ڈھونڈتے تھے۔ اس بات کی نسبت کہ وہ دراصل سوچتے کیا تھے، ہمیں یہ جاننے میں زیادہ دلچسپی ہے کہ ان کے سوچنے کا انداز کیا تھا۔

ہمیں معلوم ہے کہ دنیائے فطرت میں انہیں جو تبدیلیاں نظر آتی تھیں، وہ ان کے متعلق سوال وضع کرتے تھے۔ وہ فطرت کے ڈھکے چھپے یا بنیادی قوانین دریافت کرنا چاہتے تھے۔

ان کے گرد و پیش جو کچھ وقوع پذیر ہوتا رہتا تھا ' وہ قدیم اساطیر کا سہارا لیے بغیر انہیں سمجھنا چاہتے تھے ۔ اور اہم ترین بات یہ تھی کہ وہ خود فطرت کا مطالعہ کر کے اس کی اصل عمل کاریوں کو سمجھنے کے آرزومند تھے ۔ ان کا یہ رویہ متقدمین کے رویے سے بالکل مختلف تھا جو دیوتاؤں کے متعلق کہانیاں سنا کر بادل ' رعد یا سرما کی توضیح کرتے تھے ۔

چنانچہ فلسفہ بتدریج مذہب سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ طبعی فلسفیوں نے سائنسی استدلال کی جانب پہلا قدم اٹھایا تھا ۔ چنانچہ جس بیج نے سائنس کا روپ دھارنا تھا ' وہ اس کے نقیب بن گئے ۔

طبعی فلسفیوں نے جو کچھ لکھا اور کہا تھا ' ان کے صرف نامکمل اجزا باقی رہ گئے ہیں ۔ جو تھوڑا بہت ہمیں معلوم ہے ' وہ ارسطو کی تحریروں کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے جو ان کے دو سو سال بعد پیدا ہوا تھا ۔ ارسطو صرف ان نتائج کا ذکر کرتا ہے ' جو ان فلسفیوں نے اخذ کیے تھے ۔ چنانچہ ہمیں پوری طرح یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے یہ نتائج اخذ کیسے کئے تھے ۔ لیکن جو کچھ ہمیں معلوم ہے اس سے ہم یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ اولین یونانی فلسفیوں کے پراجیکٹ کا تعلق اس سوال سے تھا کہ وہ بنیادی مادا کیا ہے جس سے دوسری اشیا تشکیل پاتی ہیں اور فطرت میں تبدیلیاں کیسے رونما ہوتی ہیں ۔

میلے توس کے فلسفی

سب سے پہلا فلسفی ' جس سے ہم آشنا ہیں ' وہ تھالیس (Thales) (2) تھا ۔ اس کا تعلق ایشیائے کوچک کی ایک یونانی نو آبادی میلے توس (Miletus) سے تھا ۔ وہ سیلانی آدمی تھا اور ملکوں ملکوں گھومتا پھرتا رہتا تھا ۔ وہ مصر بھی گیا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک ہرم کی بلندی کا حساب اس وقت لگایا جب اس کے اپنے جسم کا سایہ اس کے اپنے قد کے عین برابر تھا ۔ اس کے

متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے 585 قبل مسیح میں سورج گرہن کی بالکل صحیح پیش گوئی کی تھی۔

تھالیس کا خیال تھا کہ تمام اشیا کا ماخذ پانی ہے۔ ہمیں صحیح صحیح یہ تو معلوم نہیں کہ اس سے اس کی مراد کیا تھی، تاہم ممکن ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہو کہ ہر قسم کی زندگی کا آغاز پانی سے ہوتا ہے ـــــ اور جب یہ ختم ہوتی ہے، تو واپس پانی میں لوٹ جاتی ہے۔

مصر میں اپنے سفر کے دوران میں اس نے لازماً دیکھا ہوگا کہ طغیانی کے بعد جونہی دریائے نیل کا پانی اپنے ارد گرد کی زمین سے پیچھے ہٹتا ہے، روئیدگی پھوٹنے اور فصلیں اگنے لگتی ہیں۔ شاید اس نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ جہاں کہیں ابھی ابھی بارش ہوئی ہے، وہاں مینڈک اور حشرات الارض نمودار ہونے لگے ہیں۔

غالباً تھالیس سوچتا ہوگا کہ پانی کس طرح برف یا بخارات کی صورت میں تبدیل ہوجاتا ہے ـــــ اور پھر دوبارہ پانی بن جاتا ہے۔

تھالیس کے متعلق یہ بھی فرض کیا جاتا ہے کہ اس نے کہا تھا: "تمام اشیا دیوتاؤں سے بھری پڑی ہیں۔" اس سے اس کی کیا مراد تھی، ہم صرف قیاس آرائی کرسکتے ہیں۔ غالباً یہ دیکھتے ہوئے کہ کس طرح سیاہ زمین پھولوں اور فصلوں سے لے کر حشرات اور لال بیگوں تک ہر چیز کی ماخذ ہے، اس نے سوچا ہوگا کہ زمین انتہائی چھوٹے چھوٹے نظر نہ آنے والے "زندہ جراثیم" سے بھری ہوئی ہے۔ ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے ـــــ وہ ہومر کے دیوتاؤں کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔

اگلا فلسفی جس کے متعلق ہم سنتے ہیں، اناکسی مانڈر (Anaximander) (تقریباً 611 ق م تا تقریباً 547 ق م) تھا۔ وہ بھی تقریباً اسی زمانے میں میلے توس میں رہتا تھا۔ جب تھالیس وہاں رہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہماری دنیا ان لاتعداد دنیاؤں میں سے ایک ہے جو اس شے میں، جسے وہ بے کراں (boundless) کہتا تھا، بنتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ بے کراں سے اس کا کیا مطلب

تھا ' اس کی تشریح کرنا آسان نہیں لیکن اتنا صاف نظر آتا ہے کہ وہ اس انداز سے کسی معلوم مادے کا نہیں سوچ رہا تھا جس انداز سے تھالیس نے اس کا تصور باندھا تھا کہ وہ حقیقی ہے ۔ شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ مادا (substance) ' جو تمام اشیا کا ماخذ ہے ' ان اشیا سے مختلف ہونا چاہیے ' جو تخلیق کی جاتی ہیں ۔ چونکہ تمام تخلیق شدہ اشیا محدود (limited) ہوتی ہیں ' جو ان سے پہلے اور بعد میں آتا ہے ' لازماً " بے کراں " ہوگا ۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بنیادی مواد (stuff) پانی جیسی معمول چیز نہیں ہوسکتا۔

میلے توس کا تیسرا فلسفی اناکسی مینیس (Anaxime-nes) (تقریباً 570 ق م تا تقریباً 526 ق م) تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ تمام اشیا کا ماخذ "ہوا" (air) یا "بخارہ" (vapour) ہونا چاہیے ۔ اناکسی مینیس بہرحال تھالیس کے پانی کے نظریے سے آگاہ تھا ۔ لیکن پانی کہاں سے آتا ہے ؟ اناکسی مینیس کا خیال تھا کہ پانی مکثف (Condensed) ہوا ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بارش ہوتی ہے ' ہوا پر دباؤ پڑنے سے پانی خارج ہوتا ہے ۔ اس کا خیال تھا کہ جب پانی پر مزید دباؤ پڑتا ہے ' یہ مٹی بن جاتا ہے ۔ اس نے غالباً مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب برف پر دباؤ پڑتا ہے اور وہ پگھلنے لگتی ہے تو اس سے کس طرح مٹی اور ریت خارج ہوتی ہے ۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ آگ ہوائے لطیف (rarefied air) ہے ۔ چنانچہ اناکسی مینیس کے مطابق مٹی پانی اور آگ کا ماخذ ہوا ہے۔

پانی سے زمین کے پھل تک پہنچنے میں کوئی زیادہ عرصہ نہیں درکار ہوتا ۔ شاید اناکسی مینیس کا خیال تھا کہ مٹی ' ہوا اور آگ سبھی زندگی کی تخلیق کے لیے ضروری ہیں لیکن تمام اشیا کا ماخذ ہوا یا بخارہ ہی ہے ۔ چنانچہ تھالیس کی طرح وہ بھی یہ سمجھتا تھا کہ لازماً کوئی ایسا بنیادی مادا ہوگا جو تمام تبدیلیوں کا ماخذ ہے۔

عدم سے عدم ہی بر آمد ہوسکتا ہے

میلے توس کے ان تینوں فلسفیوں کا اعتقاد تھا کہ کوئی

واحد بنیادی مادا موجود ہے جو تمام اشیا کا ماخذ ہے ۔ لیکن کوئی مادا اچانک کسی دوسری چیز میں کیسے تبدیل ہوسکتا ہے ؟ ہم اسے تبدیلی یا تغیر کا مسئلہ قرار دے سکتے ہیں ۔ تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح یونانیوں نے جنوبی اٹلی میں ایک نو آبادی ایلی (Elea) قائم کی تھی ۔ اس زمانے میں یہاں فلسفیوں کا ایک گروہ پیدا ہوا ۔ ایلی کی رعایت سے ان فلسفیوں کو ایلاتی (Eleatics) کہا جاتا ہے ۔ ان ایلاتیوں کو اس سوال میں دلچسپی تھی ۔

ان فلسفیوں میں اہم ترین پارمینی ڈیس (Parmenides) (تقریباً 540 ق م تا 480 ق م) تھا ۔ پارمینی ڈیس کا خیال تھا کہ جو چیز موجود ہے ' ہمیشہ سے موجود چلی آرہی ہے ۔ یونانیوں کے لیے یہ خیال کوئی نیا خیال نہیں تھا ۔ اگرچہ ان کے پاس کوئی واضح ثبوت تو نہیں تھا لیکن وہ اس بات کو کم و بیش صحیح تصور کرتے رہے تھے کہ دنیا میں جو چیز موجود ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ۔ پارمینی ڈیس کا خیال تھا کہ عدم سے صرف عدم ہی وجود میں آسکتا ہے ۔ اور جو چیز موجود ہے ' کبھی عدم نہیں بن سکتی ۔

پارمینی ڈیس نے محض اسی پر اکتفا نہیں کیا ' بلکہ اس نے اس خیال کو آگے بڑھایا ۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جسے فی الواقعی تبدیلی کہا جاسکے ۔ جو چیز جیسی ہے ویسی ہی رہے گی 'اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں ہوسکتی ۔

تاہم پارمینی ڈیس کو اندازہ تھا کہ فطرت مسلسل تبدیلی (flux) کی حالت میں رہتی ہے ۔ اسے اپنے حواس (خمسہ) کے ذریعے ادراک ہوتا تھا کہ اشیا میں تبدیلی آتی رہتی ہے ۔ لیکن جو کچھ اس کی عقل اسے جتاتی تھی ' وہ اس کا حواس کے ذریعے ادراک شدہ کا تسویہ نہیں کرپاتا تھا ۔ جب اسے حواس یا عقل میں سے کسی ایک پر انحصار کرنے کا انتخاب درپیش ہوتا تھا ' وہ عقل منتخب کرلیتا تھا ۔

تم اس جملے سے تو واقف ہی ہو : " میں تب مانوں گا جب اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا ۔ " لیکن پارمینی ڈیس آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی نہیں مانتا تھا ۔ اس کا ایقان تھا کہ ہمارے حواس ہمیں دنیا کی غلط تصویر دکھاتے ہیں ' ایسی تصویر جو ہماری عقل کے

ساتھ میل نہیں کھاتی ۔ فلسفی کی حیثیت سے اس نے اپنا یہ فرض گردانا کہ وہ سمعی ، بصری اور دیگر حواسی التباسات (illusions) کی تمام صورتوں کو بے نقاب کرتا رہے گا۔

انسانی عقل پر اس مستحکم اعتقاد کو " عقلیت پسندی " (rationalism) کہا جاتا ہے ۔ عقلیت پسند وہ شخص ہوتا ہے جس کا یہ ایمان ہو کہ دنیا کے متعلق ہمارے علم کا اہم ترین ماخذ عقل ہے ۔

تمام اشیا بہتی ہیں

پارمینی دیس کا ایک معاصر ہیراکلی توس (Heraclitus) (تقریباً 540 ق م تا 480 ق م) تھا ۔ اس کا تعلق ایشیائے کوچک کے قصبے ایفی سس (3) سے تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ مسلسل تبدیلی یا بہاؤ درحقیقت فطرت کی انتہائی بنیادی خصوصیت ہے ۔ ہم غالباً کہہ سکتے ہیں کہ وہ جس چیز کا ادراک اپنے حواس کے ذریعے کرسکتا تھا ، پارمینی دیس کی نسبت اسے اس پر زیادہ اعتقاد تھا۔

ہیراکلی توس کہتا تھا : " ہر چیز بہتی ہے ۔ " یعنی کسی چیز کو ثبات حاصل نہیں ، ہر چیز مسلسل متحرک رہتی ہے اور اس میں پیہم تغیر و تبدیلی آتی رہتی ہے ۔ چنانچہ ہم " کبھی ایک ہی دریا میں دو مرتبہ قدم نہیں رکھ سکتے " ۔ جب میں دوسری مرتبہ دریا میں پاؤں ڈالتا ہوں نہ میں وہ ہوتا ہوں (جو میں پہلے تھا) اور نہ دریا۔

ہیراکلی توس نے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ دنیا کا نمایاں وصف اس کے تضادات ہیں ۔ اگر ہم بیمار نہ پڑیں ہمیں کبھی معلوم نہ ہوسکے کہ تندرستی کیا ہے ۔ اگر ہمیں بھوک نہ لگے ، ہمیں پیٹ بھر کر کھانا کھانے سے جو تسکین حاصل ہوتی ہے ، وہ کبھی حاصل نہ ہوسکے ۔ اگر جنگ نہ ہو ، ہم کبھی امن کی ستائش نہیں کرسکیں گے ۔ اگر سردیاں نہ آئیں ، پھر بہار ہمارے لیے عنقا ہوجائے گی۔

ہیراکلی توس کا اعتقاد تھا کہ دنیا کا نظام جس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے، اس میں نیکی اور بدی دونوں ناگزیر طور پہ موجود رہیں گی۔ متضاد قوتوں کی باہمی کھینچا تانی کے بغیر یہ دنیا اپنا وجود کھو دے گی۔

وہ کہتا تھا: "دیوتا دن ہے اور رات ہے، سرما ہے اور گرما ہے، جنگ ہے اور امن ہے، اشتہا ہے اور سیری ہے۔" اس نے دیوتا (god) کی اصطلاح استعمال ضرور کی تھی لیکن اتنا واضح ہے کہ اس کا اشارہ صنمیات کے دیوتاؤں کی طرف نہیں تھا۔ ہیراکلی توس کے نزدیک خدا (God) ـــــ یا معبود (Deity) ـــــ وہ ہے جس نے سارے عالم کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ خدا کو بڑے واضح انداز سے فطرت میں رونما ہونے والے تغیرات اور تضادات میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ہیراکلی توس خدا (God) کی اصطلاح استعمال نہیں کرتا، اس کی بجائے وہ اکثر یونانی لفظ logos کو ترجیح دیتا ہے جس کے معنی عقل ہیں۔ اگرچہ ہم انسان ہمیشہ ایک طرف نہیں سوچتے اور نہ ہماری عقل کا معیار ایک جیسا ہوتا ہے، ہیراکلی توس کا اعتقاد تھا کہ کوئی "آفاقی عقل" ضرور ہوگی جو ہر اس چیز کی رہنمائی کرتی ہے جو فطرت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔

یہ "آفاقی عقل" یا "آفاقی قانون" ایک ایسی چیز ہے جو ہم سب میں مشترک ہے، اور ایک ایسی چیز جس سے ہر شخص رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اور ہیراکلی توس کا خیال تھا، اس کے باوجود لوگ اپنی انفرادی عقل کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں۔ عمومی اعتبار سے وہ اپنے ساتھی انسانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ کہتا تھا: "اکثر لوگوں کے خیالات و آرا شیرخوار بچوں کے کھلونوں کی مانند ہیں۔"

چنانچہ فطرت کے مسلسل تغیرات اور تضادات کے مابین ہیراکلی توس کو کوئی ذات یا احدیت نظر آتی تھی۔ یہ "کوئی چیز" ہر چیز کا سرچشمہ ہے۔ اسے وہ خدا (God) یا logos کہتا تھا۔

چار بنیادی عناصر

ایک لحاظ سے پارمینی دیس اور ہیراکلی توس ایک دوسرے کے بالکل متضاد تھے ۔ پارمینی دیس کی عقل نے اسے باور کرا دیا تھا کہ کوئی چیز تبدیل نہیں ہوسکتی ۔ عین اسی طرح ہیراکلی توس کے حواس نے اس پر واضح کردیا تھا کہ فطرت میں مسلسل تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں ۔ سچا کون تھا ؟ کیا ہم عقل کے تابع ہو جائیں یا اپنے حواس پر انحصار کریں؟

پارمینی دیس اور ہیراکلی توس دونوں دو دو باتیں کہتے ہیں :

پارمینی دیس کہتا ہے:

(الف) کوئی چیز تبدیل نہیں ہوسکتی

(ب) چنانچہ ہم جن چیزوں کا ادراک اپنے حواس کے ذریعے کرتے ہیں، وہ ناقابل اعتبار ہیں ۔

اس کے برعکس ہیراکلی توس کہتا ہے:

(الف) ہر چیز تبدیل ہوتی رہتی ہے (" تمام اشیا بہتی ہیں")

(ب) ہمارے حسی ادراکات قابل اعتبار ہیں ۔

فلسفیوں کے مابین ان سے بڑے اختلافات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ! لیکن سچا کون تھا ؟ وہ جس جنجال میں پھنس گئے تھے، اس سے انہیں نکالنے کا فریضہ سسلی کے ایمپے دوکلیس (Empedocles) (تقریباً 490 ق م تا 430 ق م) کے حصے میں آیا ۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں اپنے ایک ایک دعوے میں صحیح ہیں لیکن دوسرے میں غلط ۔

ایمپے دوکلیس کو معلوم ہوا کہ ان کے بنیادی اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں فلسفیوں نے فرض کرلیا تھا کہ عنصر (elem-ment) صرف ایک ہے ۔ اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو پھر ایک طرف جو کچھ ہماری عقل ہمیں بتاتی ہے اور دوسری طرف جو کچھ " ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں "، ان دونوں کے درمیان جو خلیج

حائل ہے' اسے کبھی پر نہیں کیا جا سکے گا۔

صاف ظاہر ہے کہ پانی مچھلی یا تتلی میں تبدیل نہیں ہوسکتا ۔ درحقیقت پانی تبدیل ہو ہی نہیں سکتا ۔ خالص پانی ہمیشہ خالص پانی رہے گا ۔ چنانچہ جب پارمنی ڈیس کہتا تھا : " کوئی چیز تبدیل نہیں ہوسکتی" ' تو ٹھیک کہتا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ایمپے ڈوکلیس ہیراکلی توس کی اس بات سے متفق تھا کہ ہمیں اپنے حواس کی شہادت پر اعتبار کرنا چاہیے ۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں' ہمیں اس پر ایمان لے آنا چاہیے اور جو کچھ ہم دیکھتے ہیں' اگر سچ پوچھا جائے تو پھر وہ یہ ہے کہ فطرت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

ایمپے ڈوکلیس اس نتیجے پر پہنچا کہ فساد کی جڑ واحد بنیادی مادے کا تصور ہے' اسے مسترد کردینا چاہیے ۔ نہ اکیلا پانی اور نہ اکیلی ہوا گلاب کی جھاڑی یا تتلی میں تبدیل ہوسکتی ہے ۔ فطرت کا سرچشمہ امکانی طور پر کوئی واحد "عنصر" نہیں ہوسکتا۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ایمپے ڈوکلیس کو یقین تھا کہ فطرت چار عناصر پر یا جیسا کہ وہ کہتا تھا' چار "جڑوں" (roots) پر مشتمل ہے ۔ یہ چار جڑیں مٹی' ہوا' آگ اور پانی ہیں۔

فطرت میں جتنے بھی عمل رونما ہوتے ہیں' وہ ان چار عناصر کے یکجا یا علیحدہ علیحدہ ہونے کی بنا پر ہوتے ہیں ۔ تمام اشیا مٹی' ہوا' آگ اور پانی کا مرکب ہیں لیکن ہر شے میں ان کی مقدار مختلف ہوتی ہے ۔ وہ کہتا تھا کہ جب کوئی پھول یا جانور مرتا ہے' یہ چاروں پھر علیحدہ علیحدہ ہوجاتے ہیں ۔ ہم ان تبدیلیوں کو ننگی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں ۔ لیکن مٹی اور ہوا' آگ اور پانی ہمیشہ موجود رہتے ہیں اور جن مرکبات کے وہ اجزا ہوتے ہیں' وہ ان پر اپنا کوئی " اثر نہیں چھوڑتے ۔ " چنانچہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ " ہر چیز " تبدیل ہوجاتی ہے ۔ بنیادی طور پر کوئی چیز تبدیل نہیں ہوتی ۔ ہوتا یہ ہے کہ چاروں عناصر یک جا ہوتے ہیں اور علیحدہ ہوتے ہیں ـــــ تاکہ وہ دوبارہ یک جا ہوسکیں۔

جو کچھ ہوتا ہے' ہم اس کا موازنہ تصویر کشی سے کرسکتے ہیں ۔ اگر مصور کے پاس صرف ایک رنگ ـــــ مثلاً

سرخ ـــ ہو ' وہ سبز درختوں کی تصویر نہیں بنا سکے گا ۔ لیکن اگر اس کے پاس زرد ' سرخ ' نیلے اور سیاہ رنگ ہوں ' وہ سینکڑوں مختلف رنگوں میں تصاویر بنا سکے گا کیونکہ وہ مختلف مقداروں میں انہیں ایک دوسرے سے آمیز کر سکتا ہے۔

باورچی خانے کی ایک مثال سے بھی اس کی وضاحت ہوجاتی ہے ۔ اگر میرے پاس صرف آٹا ہو ' تو کیک بنانے کے لیے میرا جادوگر ہونا ضروری ہوگا ۔ لیکن اگر میرے پاس انڈے ' آٹا ' دودھ اور چینی ہے ' پھر میں جتنی قسم کے چاہوں ' کیک بنا سکتا ہوں۔

یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ اس نے مٹی ' ہوا ' آگ اور پانی کو فطرت کی " جزوں " کے طور پر منتخب کیا ۔ اس سے پہلے دوسرے فلسفیوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اولین (primordial) مادہ پانی ' ہوا یا آگ ہونا چاہیے ۔ تھالیس اور اناکسی مینیس نے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ پانی اور ہوا دونوں طبعی دنیا کے لازمی عناصر ہیں ۔ یونانیوں کا اعتقاد تھا کہ آگ بھی ضروری ہے ۔ مثلاً انہوں نے مشاہدہ کیا تھا کہ سورج (دھوپ) تمام جاندار مخلوقات کے لیے اہم ہے ' اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جانوروں اور انسانوں دونوں میں جسمانی حرارت ہوتی ہے ۔

ممکن ہے کہ ایمپے دوکلیس نے جلتی لکڑی کا غور سے مشاہدہ کیا ہو ۔ (جب لکڑی جلتی ہے) کسی چیز کے حصے بکھرے ہونے لگتے ہیں ۔ ہمیں اس کے چٹخنے اور تڑتڑانے کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ یہ " پانی " ہے ۔ کوئی چیز دھوئیں کی شکل میں اوپر اٹھتی ہے ۔ یہ "ہوا" ہے ۔ " آگ " ہم (ویسے ہی) دیکھ سکتے ہیں ۔ جب آگ بجھ جاتی ہے ' کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے ۔ یہ راکھ ـــ یا "مٹی" ہے۔

جب ایمپے دوکلیس نے فطرت کے ان تغیرات کی یہ تشریح کی کہ یہ چار " جزوں " کے امتزاج اور تحلیل کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں ' پھر بھی ایک چیز کی وضاحت باقی رہ گئی ۔ یہ چاروں اجزا اس طرح یک جا کیسے ہوجاتی ہیں کہ ایک نئی زندگی وجود میں آجاتی ہے ؟ پھر اس آمیزے کی ـــ مثلاً پھول کی ـــ

تحلیل کیسے ہوتی ہے یا کون کرتا ہے؟

ایمپے دوکلیس کا عقیدہ تھا کہ فطرت میں دو مختلف قوتیں برسر کار ہیں ۔ وہ انہیں محبت اور جدل کہتا تھا ۔ محبت اشیا کو آپس میں مربوط کردیتی ہے اور جدل انہیں علیحدہ علیحدہ کردیتا ہے۔

وہ " مادے " (substance) اور " قوت " (force) کے مابین امتیاز کرتا ہے یہ بات قابل غور ہے ۔ آج بھی سائنس دان عناصر (elements) اور فطری قوتوں کے مابین فرق کرتے ہیں ۔ جدید سائنس کا دعوئی ہے کہ فطرت میں جو عمل کاریاں جاری و ساری ہیں ، ان کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ مختلف عناصر اور مختلف فطری قوتوں کے ایک دوسرے پر اثرانداز ہونے کا عمل ہے۔

ایمپے دوکلیس نے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ جب ہم کسی چیز کا ادراک اپنے حواس سے کرتے ہیں ، پھر کیا ہوتا ہے ؟ مثلاً میں پھول کیسے "دیکھ" سکتا ہوں ؟ اصل میں ہوتا کیا ہے ؟ سوفی ، تم نے اس بارے میں کبھی غور کیا؟

ایمپے دوکلیس کا اعتقاد تھا کہ آنکھیں مٹی ، ہوا ، آگ اور پانی پر مشتمل ہوتی ہیں ۔ چنانچہ میری آنکھ میں جو "مٹی" ہے ، وہ اس کا ، جو میرے گردوپیش مٹی کا ہے ، ادراک کرلیتی ہے ، اسی طرح (میری آنکھ کی) "ہوا" ہوا ، " آگ " آگ کا اور "پانی" پانی کا ادراک کرلیتا ہے ۔ اگر میری آنکھوں میں ان چاروں مادوں میں سے کسی ایک کا بھی فقدان ہوتا ، میں پوری فطرت کو نہ دیکھ پاتا۔

ہر چیز میں ہر چیز کا کچھ نہ کچھ

اناکس گوراس (Anaxa goras) (500 ق م تا 428 ق م) ایک اور فلسفی تھا جو اس بات سے متفق نہیں تھا کہ کوئی خاص بنیادی مادہ ـــــ مثلاً پانی ـــــ ہر اس چیز میں ، جو ہمیں

دنیائے فطرت میں نظر آتی ہے تبدیل ہوسکتا ہے ۔ وہ یہ بھی نہیں مانتا تھا کہ مٹی ، ہوا ، آگ اور پانی ہڈیوں یا خون میں تبدیل ہوسکتے ہیں۔

اناک گوراس کا خیال تھا کہ فطرت کی تشکیل انتہائی باریک ذرات کی ، جو آنکھ کو نظر نہیں آسکتے ، غیر محدود تعداد سے ہوتی ہے ۔ مزید برآں ہر چیز مزید خورد اجزا میں تقسیم ہوسکتی ہے لیکن باریک ترین اجزا میں بھی تمام دوسری اشیا کے اجزا شامل ہوتے ہیں ۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ اگر جلد اور ہڈی کسی دوسری چیز کی تبدیل شدہ شکل نہیں ہیں ، پھر جو دودھ ہم پیتے ہیں اور جو غذا ہم کھاتے ہیں ان میں بھی جلد اور ہڈی ہونا چاہئیں۔

شاید موجودہ زمانے کی دو مثالیں اناک گوراس کے انداز فکر کی توضیح کرسکتی ہیں ۔ جدید لیزر ٹیکنالوجی (laser techno-logy) نام نہاد ہولوگرام (holograms) پیدا کرسکتی ہے ۔ (ہولوگرام سہ ابعادی تصویر یا شبیہ ہوتی ہے ۔ اسے لیزر شعاعوں کی مدد سے بنایا جاتا ہے ۔) مثلاً اگر کوئی ہولوگرام کسی کار کی شکل بناتا ہے اور اس ہولوگرام کو مختلف حصوں میں تقسیم کردیا جائے ، بے شک ہمارے سامنے کار کا صرف وہی حصہ ہو جس میں محض بمپر (bumber) دکھایا گیا ہے ، ہمیں پھر بھی پوری کار نظر آسکے گی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے جزو میں پوری چیز موجود ہوتی ہے۔

ایک لحاظ سے ہمارے اجسام کی بناوٹ بھی اسی انداز سے ہوئی ہوتی ہے ۔ اگر میں اپنی انگلی کا کوئی خلیہ ڈھیلا کرلوں ، اس کے مرکزے (nucleus) میں نہ صرف میری جلد کی تمام خصوصیات موجود ہوں گی بلکہ اس سے یہ بھی منکشف ہوجائے گا کہ میری آنکھیں کس قسم کی ہیں ، میرے بالوں کا رنگ کیا ہے ، میری انگلیوں کی تعداد کتنی ہے اور وہ کس نوعیت کی ہیں ، علی ہذالقیاس ۔ انسانی جسم کے ہر خلیے میں وہ بنیادی خاکہ موجود ہوتا ہے جس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ باقی خلیوں کی ساخت کیسے ہوئی ہے ۔ چنانچہ ہر واحد خلیے میں " ہر چیز کا کچھ نہ کچھ " ہوتا ہے ۔ یعنی ہر چھوٹے سے چھوٹے جزو میں کل موجود ہوتا ہے۔

اناک گوراس ان مہین ذرات کو ، جن میں ہر چیز کا کچھ نہ کچھ موجود ہوتا ہے ، "بیج" (seeds) کہتا تھا۔

یاد کرو کہ ایمپے دوکلیس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ "محبت" ہے جو مختلف عناصر کو جوڑ کر مکمل اجسام بناتی ہے ۔ اناک گوراس بھی "ترتیب" یا "نظم" کو ایک قسم کی قوت تصور کرتا تھا جو جانوروں اور انسانوں ، پھولوں اور درختوں کو تخلیق کرتی رہتی ہے ۔ وہ اس قوت کو ذہن یا ذہانت (nous) کہتا تھا۔

اناک گوراس اس لیے بھی ہمارے لیے دلچسپی کا باعث ہے کیونکہ وہ پہلا فلسفی ہے جس کا ہم ایتھنز میں ذکر سنتے ہیں ۔ اس کا تعلق ایشیائے کوچک سے تھا لیکن وہ چالیس سال کی عمر میں ایتھنز آ گیا ۔ اس پر بعد ازاں دہریت کا الزام لگایا گیا اور آخرکار اسے شہر سے نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا ۔ دوسری باتوں کے علاوہ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ سورج کوئی دیوتا نہیں ہے بلکہ دہکتا ہوا سرخ پتھر ہے جو پورے پیلیپونیس (Peloponnese) جزیرہ نما (یعنی جنوبی یونان) سے بڑا ہے۔

اناک گوراس کو زیادہ تر فلکیات سے دلچسپی تھی ۔ اسے یقین تھا کہ تمام اجرام فلکی اسی مادے (substance) سے بنے ہیں جس سے زمین کی تشکیل ہوئی ہے ۔ وہ اس نتیجے پر ایک شہاب ثاقب کا مطالعہ کرنے کے بعد پہنچا ۔ اس سے اس کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ دوسرے سیاروں پر بھی زندگی موجود ہو سکتی ہے ۔ اس نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی کہ چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہوتی ـــــ وہ کہتا تھا کہ چاند اپنی روشنی زمین سے حاصل کرتا ہے ۔ سورج گرہن کیوں ہوتے ہیں ، اس نے اس کی بھی وضاحت کی تھی۔

پس تحریر : سوفی ، تمہاری توجہ کا شکریہ ۔ غالباً تمہیں اس باب کو دو تین مرتبہ پڑھنا پڑے گا تب کہیں تم اسے پوری طرح سمجھ پاؤ گی ۔ تاہم اگر آدمی کوئی بات سمجھنا چاہے ، اسے کوشش تو کرنا ہی پڑتی ہے ۔ تمہیں غالباً ایسی سہیلی یا دوست قطعاً پسند نہیں آتا ہو گا جو جانتا تو سب کچھ ہو لیکن جسے مغز بالکل کھپانا نہ پڑتا ہو۔

بنیادی مادے اور فطرت میں رونما ہونے والے تغیرات
کے سوال کا بہترین حل تم کل پڑھو گی جب تمہاری ملاقات
دیموکری توس سے ہو گی۔ فی الحال میں مزید کچھ نہیں کہوں گا

سوفی خفیہ ٹھکانے میں بیٹھی گھنے جھنڈ کے ایک چھوٹے سے شگاف میں سے باغ کی جانب دیکھتی رہی۔ یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد اسے اپنے خیالات کو چھانٹنا اور انہیں نئے سرے سے ترتیب دینے کی کوشش کرنا ہو گی۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ سادہ پانی برف یا بھاپ کے ماسوا کبھی کسی دوسری چیز میں تبدیل نہیں ہوسکتا۔ پانی تو تربوز میں بھی نہیں تبدیل ہوسکتا کیونکہ تربوز بھی محض پانی پر نہیں بلکہ کچھ اور چیزوں پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اسے اس بات کا یقین محض اس لیے تھا کیونکہ اس نے یہی پڑھا تھا۔ اگر اس نے مثلاً یہ نہ پڑھا ہوتا کہ برف صرف پانی ہوتی ہے تو کیا وہ پھر بھی اس بات کا پورے وثوق سے دعویٰ کرسکتی تھی؟ کم از کم اسے اس بات کا بڑے انہماک سے مطالعہ کرنا ہوگا کہ پانی جم کر برف اور پھر پگھل کر دوبارہ پانی کیوں بن جاتا ہے۔

اب کے سوفی کا ارادہ تھا کہ جو کچھ اس نے دوسروں سے سیکھا ہے' اس پر وہ زیادہ مغز نہیں کھپائے گی بلکہ اپنی عقل سلیم (common sense) استعمال کرنے کی کوشش کرے گی۔

پارمینی دیس کسی شکل میں بھی تبدیلی کا تصور قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ جتنا اس بارے میں سوچتی اسے اتنا ہی یقین ہوتا جاتا کہ ایک لحاظ سے وہ ٹھیک تھا۔ اس (پارمینی دیس) کی ذہانت یہ تسلیم نہیں کرسکتی تھی کہ "کوئی چیز" ایکا ایکی "کسی سراسر دوسری مختلف چیز" میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ اپنے خیالات کا کھلے عام اظہار کرنے کے لیے اسے بڑے حوصلے کی ضرورت پیش آئی ہو گی کیونکہ اس کا مطلب ان تمام تبدیلیوں کا' جو فطرت میں رونما ہوتی رہتی ہیں اور جنہیں لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے' انکار کرنا تھا۔ بے شمار لوگوں نے اس کا ٹھٹھا اڑایا ہو گا۔

اور جب ایمپے ڈکلیس نے یہ ثابت کیا کہ دنیا ایک واحد مادے پر نہیں بلکہ زیادہ پر مشتمل ہونا چاہیے' تو اس نے یہ ثبوت بھی فراہم کردیا ہوگا کہ وہ کتنا تیز طرار شخص ہے۔ فطرت میں جتنے تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں' اس کے نظریے کی رو سے وہ ممکن

ہو جاتے ہیں جب کہ حقیقتاً سب کچھ یوں کا توں رہتا ہے ، کہیں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔

قدیم یونانی فلسفی نے جو کچھ دریافت کیا محض استدلال سے کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے فطرت کا مطالعہ کیا تھا لیکن کیمیاوی تجزیے کے لیے اسے وہ ساز و سامان کہاں میسر تھا جو آج کل کے سائنس دانوں کے پاس ہے۔

سوفی کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ یہ مانتی ہے یا نہیں کہ ہر چیز کا سرچشمہ واقعی مٹی ، ہوا ، آگ اور پانی ہیں۔ تاہم اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اصولی اعتبار سے ایمپے ڈکلیس یہ صحیح تھا۔ ہم اپنی آنکھوں سے جو تغیرات رونما ہوتے دیکھتے ہیں ، انہیں ـــــ اپنی عقل کھونے بغیر ـــــ تسلیم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ بنیادی مادا ایک نہیں ، بلکہ ایک سے زیادہ ہیں۔

سوفی کو فلسفہ بے حد پر لطف اور ولولہ انگیز نظر آیا کیونکہ جو کچھ اس نے سکول میں پڑھا تھا وہ سب کچھ یاد کئے بغیر وہ محض اپنی عقل سلیم کی مدد سے خیالات سمجھنے میں کامیاب رہی تھی۔ اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فلسفہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے آپ سیکھ سکتے ہوں؛ غالباً یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ آپ فلسفیانہ انداز سے سوچنا سیکھ جاتے ہیں۔

5۔ ڈیموکری توس

* * *

... دنیا کا انتہائی پر جودت کھلونا ...

سوفی نے گمنام فلسفی کے تمام ٹائپ شدہ کاغذات دوبارہ بسکٹوں کے ڈبے میں رکھ دیے اور ڈھکن بند کر دیا۔ وہ رینگتی رینگتی اپنے خفیہ ٹھکانے سے باہر نکلی اور کچھ دیر کھڑی باغ کے آر پار دیکھتی رہی۔ جو کچھ کل بیتا تھا وہ اس کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کی امی آج صبح بھی ناشتے پر "محبت نامے" کا ذکر کر کے اس سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہی تھی۔ اب سوفی نے تیز تیز قدم اٹھاتے ڈاک ڈبے کا رخ کیا تا کہ جو صورت کل پیش آئی تھی، وہ آج اس کی روک تھام کر سکے۔ دو دنوں میں یکے بعد دیگرے دو "محبت ناموں" کی موصولی دوہری خفت کا باعث بن سکتی تھی۔

لیجیے، ڈاک ڈبے میں ایک اور چھوٹا سفید لفافہ پڑا تھا! سوفی کو ان وصولیوں میں خاص ترتیب (pattern) نظر آنے لگی۔ ہر سہ پہر اسے بڑا خاکی لفافہ موصول ہوتا۔ جب وہ اس کے مندرجات کا مطالعہ کر رہی ہوتی، فلسفی چپکے سے آتا اور ڈاک ڈبے میں ایک اور چھوٹا سفید لفافہ ڈال کر چلتا بنتا۔

چنانچہ اب سوفی معلوم کر سکے گی کہ یہ شخص کون ہے، مرد یا عورت؟ اسے اپنے کمرے سے ڈاک ڈبا صاف دکھائی دیتا تھا۔ اگر وہ دریچے کے قریب کھڑی ہو جائے، وہ پراسرار فلسفی کو دیکھ سکے گی۔ آخر سفید لفافے آسمان سے تو نازل نہیں ہوتے!

سوفی نے تہیہ کر لیا کہ وہ اگلے روز بڑی چوکسی سے نگرانی کرے گی۔ کل

جمعہ ہے اور اس کے پاس ہفتہ وار تعطیل کے پورے دو دن ہوں گے۔
وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس نے سفید لفافہ کھول لیا۔ آج صرف ایک سوال تھا لیکن یہ سابقہ تین سوالوں سے بھی زیادہ احمقانہ اور پریشان کن تھا:

لیگو (Lego) دنیا کا پر جودت ترین کھلونا کیوں ہے؟

پہلی بات تو یہ تھی کہ سوفی قطعاً وثوق سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس سوال میں جو دعویٰ کیا گیا ہے، وہ اس سے پوری طرح متفق ہے۔ ایک وقت تھا جب وہ پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی گوٹوں (blocks) سے کھیلا کرتی تھی لیکن اب تو اس بات کو سالوں گزر چکے تھے۔ مزید برآں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر لیگو کا فلسفے سے کیا تعلق ہے۔

لیکن وہ فرض شناس طالبہ تھی۔ اس نے اپنی الماری کے اوپر کے خانے میں جلدی جلدی تمام اشیا کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اسے وہ بیگ مل گیا جو ہر شکل اور جسامت کی گوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

بہت مدت کے بعد وہ پہلی مرتبہ ان سے کچھ بنانے لگی۔ جب وہ اس کام میں مصروف تھی، اس کے ذہن میں گوٹوں کے متعلق چند خیالات ابھرنے لگے۔

"انہیں جوڑنا اور جوڑ کر اشیا بنانا آسان ہے،" اس نے سوچا۔ "اگرچہ وہ سب مختلف ہیں لیکن وہ ایک دوسری کے ساتھ آسانی سے پیوست ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ ٹوٹتی بھی نہیں۔" اسے قطعاً یاد نہ آسکا کہ اس نے کبھی کوئی شکستہ گوٹ دیکھی ہو۔ اس کی تمام گوٹیں بالکل اسی طرح نئی نکور اور درخشاں تھیں جس طرح وہ اس روز تھیں جب انہیں کئی سال پہلے خریدا گیا تھا۔ ان کا بہترین وصف یہ تھا کہ وہ ان کی مدد سے جو چیز چاہتی بنا سکتی تھی۔ پھر جب چیز بن جاتی، وہ اسے ادھیڑ سکتی اور گوٹوں کو کوئی نئی چیز بنانے کے لیے استعمال کر سکتی تھی۔

آخر آدمی کھلونے سے اور کیا توقع کر سکتا ہے؟ سوفی اس نتیجے پر پہنچی کہ لیگو واقعی دنیا کا پرجودت ترین کھلونا ہے۔ لیکن اس کا فلسفے سے کیا تعلق ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ لیگو کی گونوں سے بڑی گڑیا کا گھر تعمیر کر رہی تھی بلکہ اسے تقریباً مکمل کر چکی تھی۔ اس کام میں اسے جو لطف آرہا تھا، وہ اگرچہ ماننے کو تو تیار نہیں تھی لیکن حقیقت یہی ہے اس نے ایسا لطف مدتوں سے محسوس نہیں کیا تھا۔

جب لوگ بڑے ہو جاتے ہیں وہ کھیلنا کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟

جب اس کی امی گھر آئی اور اس نے دیکھا کہ سوفی کیا کر رہی ہے، جھٹ اس کے منہ سے نکلا: "واہ، کیا مزے ہیں! مجھے خوشی ہے کہ تم ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئیں کہ کھیلنا ہی چھوڑ دو!"

"میں کھیل نہیں رہی!" سوفی نے بھنا کر جواب دیا۔ "میں بڑا پیچیدہ فلسفیانہ تجربہ کر رہی ہوں!"

اس کی ماں نے زور سے آہ بھری۔ وہ غالباً سفید خرگوش اور ٹاپ ہیٹ کے متعلق سوچ رہی تھی۔

جب اگلے روز سوفی سکول سے گھر پہنچی، بڑے خاکی لفافے میں مزید متعدد اوراق اس کے منتظر تھے۔ وہ انہیں اوپر اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہ انہیں پڑھنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے ڈاک ڈبے پر بھی نگاہیں جمائے رکھنا تھیں۔

ایٹم کا نظریہ

سوفی، میں پھر آگیا ہوں۔ آج ہم آخری عظیم فلسفی کا ذکر کریں گے۔ اس کا نام دیموکری توس (Democritus) (تقریباً 460 ق م تا 370 ق م) ہے۔ اس کا تعلق بحیرہ ایگیوس (Aegean Sea) کے ساحل پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے ابدیرا (Abdera) سے تھا۔

اگر تمہیں لیگو کی گونوں کے متعلق سوال کا جواب دینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی، پھر تمہیں یہ سمجھنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آنے گی کہ اس فلسفی کا پراجیکٹ کیا تھا۔

دیمو کری توس اس معاملے میں اپنے پیش روؤں سے

متفق تھا کہ فطرت میں جو تغیرات رونما ہوتے ہیں ' ان کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ واقعی کوئی چیز " تبدیل " ہوجاتی ہے ۔ چنانچہ اس نے یہ مفروضہ بنایا کہ ہر چیز بے انتہا باریک " گونوں " سے ' جو دیکھی نہیں جاسکتیں لیکن جو تمام کی تمام لافانی اور غیر تغیر پذیر ہیں ' بنی ہے ۔ دیموکری توس ان خوردترین اکائیوں کو "ایٹم" کہتا تھا۔

لفظ ایٹم (atom) یونانی لفظ atomos سے مشتق ہے اور اس کے معنی (a - , not + temnein,to cut) " ناقابل تقطیع " یا " ناقابل تقسیم " ہیں ۔ دیموکری توس کے نزدیک اہم ترین بات یہ تھی کہ وہ یہ ثابت کر دکھائے کہ دوسری اشیا جن اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہوتی ہیں انہیں غیر محدود طور پر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرتے چلے جانا ناممکن ہے ۔ اگر یہ ممکن ہوتا ' پھر انہیں گونوں یا اینٹوں (blocks) کے طور پر استعمال نہ کیا جاسکتا ۔ اگر ایٹم دوامی طور پر چھوٹے اور مزید چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوتے رہیں ' پھر شوربے کی طرح فطرت بھی تحلیل ہونے لگے گی جسے دوامی طور پر پتلا اور مزید پتلا بنایا جاتا رہے۔

مزید برآں فطرت کی گونوں کے لیے غیرفناپذیر ہونا ضروری ہے ـــــ کیونکہ عدم سے صرف عدم ہی وجود میں آسکتا ہے ۔ اس معاملے میں وہ پارمینی دیس اور ایلائیوں سے متفق تھا ۔ پھر اسے یہ بھی یقین تھا کہ ایٹم مستحکم اور ٹھوس ہوتے ہیں ۔ لیکن وہ تمام کے تمام ایک جیسے نہیں ہوسکتے ۔ اگر تمام ایٹم متماثل یا بالکل ایک جیسے ہوتے ' پھر اس بات کی کوئی تسلی بخش تشریح نہ کی جاسکتی کہ وہ کس طرح یک جا ہوکر گل لالہ اور زیتون کے درختوں سے لے کر بکریوں کی ہڈیوں اور انسانی بالوں تک کی تشکیل کرسکتے ہیں۔

دیمو کری توس کا عقیدہ تھا کہ فطرت ایٹموں کی لا محدود اور متنوع تعداد پر مشتمل ہے ۔ ان میں سے بعض مدور اور مسطح اور بعض کھردرے اور نوکیلے ہوتے ہیں اور ان کی شکل بھی بے قاعدہ ہوتی ہے ۔ چونکہ وہ صحیح معنوں میں اتنے مختلف ہیں ' وہ

آپس میں یک جا ہوسکتے اور مختلف اجسام تشکیل کرسکتے ہیں ۔ لیکن وہ تعداد اور شکل کے اعتبار سے خواہ کتنے ہی لا محدود کیوں نہ ہوں ، وہ سب کے سب غیرفناپذیر ، غیرتغیرپذیر اور ناقابل تقسیم ہوتے ہیں ۔

جب کوئی جسم ـــ مثلاً انسان یا حیوان کا ـــ مرجاتا اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجاتا ہے ، ایٹم منتشر ہوجاتے ہیں ، انہیں دوبارہ نئے اجسام (کی تشکیل) میں استعمال کیا جاسکتا ہے ۔ ایٹم خلا میں متحرک رہتے ہیں ، لیکن چونکہ ان کے ہک (hooks) اور آنکڑے (barbs) ہوتے ہیں ، وہ آپس میں مل کر وہ تمام اشیا بناسکتے ہیں جو ہمیں اپنے گردوپیش نظر آتی ہیں ۔

چنانچہ اب تم سمجھ گئی ہوگی کہ لیگو کی گوٹوں سے میرا مطلب کیا تھا ۔ ان میں کم و بیش وہی خواص پائے جاتے ہیں جو دیموکری توس نے ایٹموں سے منسوب کئے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے کوئی چیز بنانے میں اتنا لطف آتا ہے ۔ پہلی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ انہیں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ۔ پھر ان کی مختلف شکلیں اور سائز ہوتے ہیں ۔ وہ ٹھوس ہوتی ہیں اور ان میں رطوبت کا گزر نہیں ہوتا ۔ چونکہ ان کی " ہکیں " اور " آنکڑے " بھی ہوتے ہیں ، انہیں نہایت آسانی سے جوڑا اور ہر وہ چیز بنائی جاسکتی ہے جو انسانی ذہن میں آتی ہے ۔ بعد ازاں اس چیز کو ادھیڑا جاسکتا ، اس کے اجزا کو علیحدہ علیحدہ کیا جاسکتا اور انہیں نئی چیز بنانے میں استعمال کیا جاسکتا ہے ۔

لیگو اتنی مقبول اس لیے ہوئی ہے کیونکہ اس کی گوٹوں یا اجزا کو بار بار استعمال کیا جاسکتا ہے ۔ لیگو کی ایک گوٹ کسی روز ٹرک بنانے میں اور اگلے روز کوئی قلعہ تعمیر کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے ۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ لیگو کی گوٹیں " غیر فناپذیر " ہیں ۔ آج کے بچے انہی گوٹوں کے ساتھ کھیل سکتے ہیں جن کے ساتھ کبھی ان کے والدین کھیلا کرتے تھے جب کہ وہ بچے ہوتے تھے ۔

ہم چکنی مٹی سے بھی اشیا بناسکتے ہیں لیکن مٹی بار بار استعمال نہیں کی جاسکتی کیونکہ اسے توڑ کر مہین ، مزید مہین ،

مزید مہین اجزا میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ ان مہین اجزا کو جوڑ کر دوبارہ کسی صورت میں بھی کوئی نئی چیز نہیں بنائی جاسکتی ۔

آج ہم ثابت کرسکتے ہیں کہ دیموکری توس نے جو ایٹم کا نظریہ پیش کیا تھا ، وہ کم و بیش درست تھا ۔ فطرت واقعتاً مختلف " ایٹموں " سے بنی ہے جو یکجا اور علیحدہ ہوتے رہتے ہیں ۔ میری ناک کی نوک کے کسی خلیے کا کوئی ہائیڈروجن ایٹم کسی زمانے میں کسی ہاتھی کی سونڈ کا حصہ رہا ہوگا ۔ میرے دل کے عضلات کا کوئی کاربن ایٹم کسی زمانے میں کسی ڈینوسار (Dinosaur) کی دم میں شامل رہا ہو گا ۔

تاہم ہمارے زمانے میں سائنس دانوں نے دریافت کیا ہے کہ ایٹم کو مہین تر " اساسی ذرات " (elemental parti-cles) میں منقسم کیا جاسکتا ہے ۔ ہم ان اساسی ذرات کو پروٹون (protons) ، نیوٹرون (neutrons) اور الیکٹرون (electrons) کہتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ کسی روز انہیں اور بھی مہین تر ذرات میں منقسم کردیا جائے ۔ تاہم فزکس کے ماہرین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں حد لازماً ہوگی جس سے آگے تقسیم ناممکن ہوگی ۔ کوئی نہ کوئی " قلیل ترین جزو " ہونا چاہیے جس پر فطرت مشتمل ہے ۔

دیمو کری توس کو جدید الیکٹرونی آلات (electronic apparatus) تک رسائی حاصل نہیں تھی ۔ اس کا واحد موزوں آلہ اس کا دماغ تھا ۔ لیکن اس کی عقل نے اسے جو راہ سجھائی تھی ، وہ اس پر چلنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا تھا ۔ اگر ایک مرتبہ یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ کوئی چیز تبدیل نہیں ہوسکتی ، یہ کہ عدم سے صرف عدم ہی برآمد ہوسکتا ہے اور یہ کہ کوئی چیز کبھی ضائع نہیں ہوتی ، پھر (یہ ماننا پڑے گا کہ) فطرت لازماً انتہائی خوردترین اجزا (یا گونوں) پر مشتمل ہوگی جو آپس میں جڑتے اور علیحدہ ہوتے رہتے ہیں ۔

دیمو کری توس کسی ایسی " قوت " یا " روح " کو نہیں مانتا تھا جو فطرت کی عمل کاریوں پر اثرانداز ہوسکتی یا ان میں مداخلت کرسکتی ہو ۔ اس کے خیال کے مطابق جو واحد اشیا موجود

ہیں وہ یا تو ایٹم ہیں یا پھر خلا ۔ چونکہ وہ مادی اشیا کے علاوہ کسی دوسری چیز میں اعتقاد نہیں رکھتا تھا ' اسے ہم "مادیت پرست" (materialist) کہہ سکتے ہیں۔

دیمو کری توس کے مطابق ایٹموں کی حرکت میں کوئی شعوری "نیت" کار فرما نہیں ہوتی ۔ فطرت میں ہر چیز مشینی انداز سے رونما ہوتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سب کچھ اٹکل پچو رونما ہوتا ہے بلکہ ہر چیز تقدیر کے ناگزیر قوانین کے تابع ہے ۔ جو چیز بھی وقوع پذیر ہوتی ہے ' اس کی فطری علت ہوتی ہے اور یہ علت خود اس چیز کا فطری طور پر جزولاینفک ہوتی ہے ۔ دیموکری توس نے ایک مرتبہ کہا تھا : "میں فارس کا بادشاہ بننے کی نسبت فطرت کی کوئی نئی علت دریافت کرنے کو ترجیح دوں گا۔"

دیمو کری توس کا خیال تھا کہ ایٹم کے نظریے سے ہمارے حسی ادراک کی بھی تشریح ہوجاتی ہے ۔ جب ہم اپنے حواس سے کسی چیز کو دریافت کرتے ہیں ' ایسا خلائے بسیط میں ایٹموں کی حرکت کے سبب ہوتا ہے ۔ جب میں چاند کو دیکھتا ہوں تو اس لیے دیکھتا ہوں کیونکہ "قمری ایٹم" میری آنکھ میں دخول کرجاتے ہیں۔

(اگر یہ بات ہے) پھر "روح" کے متعلق کیا خیال ہے ؟ (ہمارے خیال میں) یقیناً روح تو ایٹموں یعنی مادی اشیا پر مشتمل نہیں ہوسکتی ۔ لیکن دیموکری توس کے خیال کے مطابق بالکل ہوسکتی ہے ۔ وہ سمجھتا تھا کہ روح خاص قسم کے مدور اور مسطح "روحی ایٹموں" (soul atoms) سے تشکیل پاتی ہے ۔ جب کسی انسان کا انتقال ہوتا ہے ' اس کے روحی ایٹم چاروں طرف بکھر جاتے ہیں اور پھر وہ کسی نئی روح کی تشکیل میں کام آتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان میں کوئی غیر فانی روح نہیں ہوتی ۔ یہ ایک اور عقیدہ ہے جس سے آج کل بہت سے لوگ متفق ہوں گے ۔ دیموکری توس کی طرح وہ بھی سمجھتے ہیں کہ روح دماغ کے ساتھ منسلک ہے اور یہ کہ اگر ایک مرتبہ دماغ کے اجزا منتشر ہوجائیں ' ہم میں کسی قسم کا شعور باقی نہیں رہ سکتا۔

دیمو کری توس کے ساتھ یونان کے فطری فلسفے کا وقتی

طور پر خاتمہ ہوگیا ۔ وہ ہیراکلی توس کی اس بات سے متفق تھا کہ فطرت میں ہر چیز " بہتی ہے " کیونکہ صورتیں آتی جاتی رہتی ہیں ۔ لیکن ہر چیز جو بہتی ہے ' اس کے عقب میں بعض غیر فنا پذیر اور ناقابل تغیر اشیا موجود ہوتی ہیں جو بہتی نہیں ۔ دیموکری توس انہیں ایٹم کہتا تھا۔

خط کے مطالعے کے دوران میں سوفی نے متعدد مرتبہ کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا ۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کا پراسرار مراسلہ نگار ڈاک ڈبے کے قریب آتا ہے یا نہیں ۔ اب وہ ٹکٹکی باندھ کر سڑک کی جانب دیکھ رہی اور جو کچھ اس نے پڑھا تھا' اس کے متعلق سوچ رہی تھی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دیموکری توس کے خیالات کتنے سادہ اور اس کے ساتھ ہی کتنے پرکارانہ ہیں ۔ اس نے "بنیادی مادے " (basic substance) اور " تغیر کے مسئلے کا صحیح جواب دریافت کرلیا تھا ۔ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ تھا کہ فلسفی نسل درنسل اس پر مغز کھپاتے رہے اور اس کے متعلق پریشان ہوتے رہے ۔ بالآخر دیموکری توس نے اسے محض اپنی عقل سلیم سے حل کر دیا۔

سوفی مسکرائے بنا نہ رہ سکی ۔ یہ بات صحیح ھونا ہی چاہیے تھی کہ فطرت کی تشکیل مہین اجزا سے ہوئی ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتے ۔لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہیراکلی توس یہ کہتا تھا کہ فطرت کی تمام صورتیں " بہتی " ہیں ' بظاہر وہ بھی ٹھیک تھا ' کیونکہ ہر شخص موت سے ہم کنار ہوتا ہے ' حیوان مرتے رہتے ہیں اور تو اور پہاڑی سلسلہ بھی آہستہ آہستہ ٹوٹ پھوٹ اور بکھر جاتا ہے ۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ خود پہاڑی سلسلہ تو بے شک فنا ہوجاتا ہے لیکن وہ جن مہین ناقابل تقسیم اجزا پر مشتمل ہوتا ہے ' وہ کبھی فنا نہیں ہوتے ۔

اس کے ساتھ ہی دیموکری توس نے چند نئے سوال اٹھائے تھے ۔ مثلاً وہ کہتا تھا کہ ہر چیز مشینی انداز سے وقوع پذیر ہوتی ہے ۔ وہ ایمپے ڈکلیس اور اناک گوراس کے برعکس یہ نہیں مانتا تھا کہ زندگی میں کوئی روحانی قوت کارفرما ہے ۔ پھر دیموکری توس کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ انسان کی کوئی غیر فانی روح نہیں ہوتی ۔

کیا وہ خود اس بارے میں یقین سے کچھ کہہ سکتی ہے ؟

اسے اس کا جواب معلوم نہیں تھا۔ لیکن اس نے فلسفے کا نصاب بھی تو ابھی

ابھی شروع کیا تھا۔

6۔ تقدیر

*　　*　　*

... نجومی کسی ایسی چیز کی پیش بینی کی فکر میں ھے جس کی حقیقتاً پیش بینی ناممکن ھے ...

جب سوفی ڈیموکری توس کے بارے میں پڑھ رہی تھی ' وہ اپنی نگاہیں ڈاک ڈبے پر بھی جمائے ہوئے تھی ۔ لیکن یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں اس کے ساتھ فریب تو نہیں ہوگیا ' اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ذرا ٹہلتے ٹہلتے باغ کے گیٹ تک جائے گی اور ڈاک ڈبا چیک کرے گی۔

جب اس نے سڑک کے سامنے کا دروازہ کھولا ' اسے باہر سیڑھی پر چھوٹا لفافہ پڑا دکھائی دیا۔ اور اس پر لاریب سوفی امنڈسین کا نام تحریر تھا۔

تو وہ اسے جل دے گیا ہے ! اور وہ بھی آج کے روز کہ وہ تو اپنی چوکس نگاہیں ڈاک ڈبے پر جمائے ہوئے تھی لیکن پراسرار شخص مختلف زاویے سے دبے پاؤں کھسکتا کھسکا تا آیا اور جنگل میں جانے سے پہلے سیڑھی پر خط رکھ کر چلتا بنا۔ بیڑا غرق !

اسے کیسے معلوم ہوا کہ سوفی ڈاک ڈبے کو بغور دیکھ رہی ہے ؟ کیا اس نے اسے کھڑکی کے قریب بیٹھے دیکھ لیا تھا ؟ بہر حال وہ خوش تھی کہ ماں کے پہنچنے سے پہلے اس نے خط اٹھا لیا تھا۔

سوفی واپس اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ اس نے خط کھولا ۔ سفید لفافے کے کنارے قدرے نم آلود تھے اور اس میں دو ننھے ننھے سوراخ تھے ۔ ایسا کیوں تھا؟ مینہ برسے

تو کئی دن گزر چکے تھے۔
خط کے اندر جو رقعہ تھا' اس پر لکھا ہوا تھا:

کیا تم تقدیر کو مانتی ہو؟
کیا بیماری دیوتاؤں کی طرف سے سزا ہے؟
تاریخ کا راستہ کون سی قوتیں متعین کرتی ہیں؟

کیا وہ تقدیر کو مانتی ہے؟ نہیں ' وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن وہ ایسے متعدد اشخاص کو جانتی تھی جو تقدیر کے قائل تھے۔ اس کی ایک ہم جماعت تھی جو رسالوں میں زائچے پڑھا کرتی تھی۔ لیکن اگر یہ لوگ علم نجوم کو مانتے ہیں ' پھر وہ تقدیر کے بھی قائل ہوں گے کیونکہ نجومیوں کا دعوٰی ہے کہ ستاروں کی چال زمین پر انسانوں کی زندگی پر اثرانداز ہوتی ہے۔
اگر آپ یہ مانتے ہوں کہ اگر کالی بلی آپ کا راستہ کاٹ جائے تو یہ آپ کے لیے نحوست کا پیغام ہوگا ـــــ تو ' خیر ' پھر آپ قسمت کو مانتے ہوں گے ' ٹھیک؟
جب وہ اس بارے میں سوچ رہی تھی اسے تقدیر پرستی کی چند مزید مثالیں یاد آگئیں۔ آخر اتنے زیادہ لوگ لکڑی کو کیوں تھپتھپاتے ہیں؟ تیرہ تاریخ کے جمعے کو منحوس کیوں سمجھا جاتا ہے؟ سوفی نے سنا تھا کہ بے شمار ہوٹلوں میں تیرہ نمبر کا کمرا نہیں ہوتا۔ ایسا ہونا ہی تھا کیونکہ لاتعداد لوگ توہم پرست ہوتے ہیں۔
"توہم پرست۔" کیا عجیب لفظ ہے۔ اگر آپ عیسائیت یا اسلام کے پیروکار ہوں تو اسے "ایمان" کہیں گے۔ لیکن اگر آپ نجوم یا تیرہ تاریخ کے قائل ہوں ' پھر اسے توہم پرستی قرار دیا جائے گا! دوسرے لوگوں کے عقاید کو توہم پرستی قرار دینے کا حق آپ کو کس نے دیا ہے؟
تاہم سوفی کو ایک بات کا یقین تھا۔ ڈیموکری توس تقدیر کو نہیں مانتا تھا۔ وہ مادیت پرست تھا۔ وہ صرف ایٹموں اور خلائے بسیط کا قائل تھا۔
سوفی رقعے پر درج دوسرے سوالوں کے متعلق سوچنے لگی۔
"کیا بیماری دیوتاؤں کی طرف سے سزا ہے؟" یقیناً آج کل کوئی شخص یہ نہیں مانتا ہوگا؛ تاہم اسے خیال گزرا کہ بے شمار لوگ سمجھتے ہیں کہ دعا مانگنے سے انہیں شفا

ملتی ہے ' چنانچہ وہ اتنا تو ضرور مانتے ہوں گے کہ خدا کو لوگوں کی صحت پر کچھ نہ کچھ اختیار ہے۔

آخری سوال کا جواب سب سے مشکل تھا۔ سوفی نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ تاریخ کا رخ کون سی قوتیں متعین کرتی ہیں۔ آخر یہ کام انسان ہی کرتے ہوں گے؟ اگر یہ خدا یا تقدیر کے ہاتھوں میں ہے ' پھر انسانوں کے پاس اپنا اختیار تو کوئی نہ ہوا؟

اپنے اختیار کے تصور نے سوفی کو کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس پراسرار فلسفی کو اپنے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کیوں کھیلنے دے؟ وہ خود اسے خط کیوں نہیں لکھ سکتی؟ وہ غالباً رات کو یا اگلی صبح بڑا لفافہ ڈاک ڈبے میں ڈال جائے گا یا جائے گی۔ وہ اس بات کا اہتمام کرے گی کہ اس شخص کے لیے خط تیار رہے۔

سوفی جھٹ پٹ لکھنے بیٹھ گئی۔ جس شخص کو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا ' اسے کچھ لکھنا خاصا دشوار تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ مرد ہے یا عورت ' نوجوان ہے یا ضعیف العمر۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی ایسا شخص ہو جسے وہ پہلے ہی جانتی ہو۔

اس نے لکھا:

انتہائی واجب الاحترام فلسفی صاحب ' آپ کے فلسفے کے فیاضانہ مراسلاتی نصاب کی ہم یہاں بہت قدر کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں پریشانی یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ آپ کون ہیں۔ اس لیے ہم آپ سے التجا کرتے ہیں کہ آپ اپنا پورا اسم شریف تحریر فرمائیں۔ اس کے عوض ہم آپ کی خاطر مدارات کریں گے بشرطیکہ آپ ہمارے ہاں تشریف لانا اور ہمارے ساتھ کافی نوش کرنا پسند فرمائیں۔ لیکن ہم اتنا عرض کیے دیتے ہیں کہ آپ ترجیحاً تب تشریف لائیں جب ہماری امی گھر پر ہوتی ہیں۔ وہ ملازمت کرتی ہیں اور سوموار سے جمعے تک ہر روز صبح ساڑھے سات بجے سے شام پانچ بجے تک اپنے کام پر جاتی ہیں۔ ویسے کافی بنانے میں ہم بھی بڑے ماہر ہیں۔

آپ کا ہمیشگی شکریہ'
آپ کی سعادت مند طالبہ
سوفی امنڈسین (عمر 14 سال)

اس نے صفحے کے نیچے RSVP (جواب سے مطلع فرمائیں) لکھا۔

سوفی کو محسوس ہو رہا تھا کہ خط کا انداز کچھ زیادہ ہی رسمی ہوگیا ہے۔ تاہم یہ جاننا مشکل تھا کہ آپ نے جس شخص کا چہرہ تک نہ دیکھا ہو، اسے لکھتے وقت کون سے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ اس نے خط گلابی لفافے میں ڈالا اور اس پہ پتا لکھا: "فلسفی کے لیے۔"

اب مسئلہ یہ تھا کہ اسے رکھا کہاں جائے تا کہ یہ اس کی امی کے ہاتھ نہ آسکے۔ وہ اسے ڈاک ڈبے میں ہی ڈالے گی لیکن اس سے پہلے اسے اپنی امی کے گھر پہنچنے کا انتظار کرنا ہوگا اور اسے یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ اگلی صبح اخبار پہنچنے سے پہلے اسے ڈاک ڈبے میں جھانکنا ہوگا۔ اگر آج شام یا رات کے دوران میں کوئی نیا خط نہ آیا، اسے گلابی لفافہ واپس نکالنا ہوگا۔

آخر اس معاملے کو اتنا پیچیدہ کیوں ہونا تھا؟

حالانکہ اس روز جمعہ تھا، سوفی سرِشام ہی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی ماں نے اسے پیزا (pizza) کا لالچ دیا اور یہ بھی بتایا کہ ٹی وی پر بڑی مزے دار مہماتی فلم دکھائی جائے گی لیکن سوفی نے کہا کہ وہ تھک چکی ہے اور جلدی سونا چاہتی ہے۔ جب اس کی ماں ٹی وی دیکھنے میں محو تھی، وہ خط پکڑے دزدیدہ انداز سے ڈاک ڈبے کی طرف چل دی۔

صاف نظر آرہا تھا کہ اس کی ماں پریشانی میں مبتلا ہے۔ جب سے سفید خرگوش اور ٹاپ ہیٹ کا قصہ شروع ہوا تھا، وہ سوفی کے ساتھ مختلف لہجے میں گفتگو کرنے لگی تھی۔ سوفی کو یہ قطعاً پسند نہیں تھا کہ وہ اپنی ماں کے لیے کسی تشویش کا باعث بنے۔ لیکن وہ کرتی بھی کیا، اسے اوپر جانا اور ڈاک ڈبے پر نظر رکھنا تھی۔

جب اس کی ماں تقریباً گیارہ بجے اوپر آئی، سوفی کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی اور ٹکٹکی باندھے سڑک کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"تم ابھی تک وہاں بیٹھی ہو اور ٹکر ٹکر ڈاک ڈبے کو دیکھ رہی ہو!" اس نے کہا۔

"میں جو چاہوں دیکھ سکتی ہوں۔"

"سوفی، میرا واقعی یہ خیال ہے کہ تمہیں محبت ہوگئی ہے۔ لیکن اگر وہ

تمہارے لیے کوئی خط لا بھی رہا ہے، آدھی رات کو تو نہیں لائے گا۔"

اخ تھو! سوفی کو محبت کے متعلق اس قسم کی احمقانہ انداز کی انتہائی جذباتی گفتگو سے گھن آتی تھی۔ لیکن وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی سوائے اس کے کہ اپنی ماں کو یقین کرتے رہنے دے کہ اس کا اندازہ درست ہے۔

"اسی نے تمہیں خرگوش اور ٹاپ ہیٹ کے متعلق بتایا تھا؟" اس کی ماں نے پوچھا۔

سوفی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"اس ــــــ اس کے پاس منشیات تو نہیں ہوتیں؟"

اب سوفی کو اپنی ماں پر ترس آگیا۔ وہ اسے اس طرح پریشان ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی حالانکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی ماں احمقانہ حرکت کر رہی ہے کیونکہ وہ محض اس لیے ایک شخص کے بارے میں یہ رائے قائم کر رہی تھی کہ وہ کوئی ضرور کوئی بری حرکت کر رہا ہے کیونکہ اس کا انداز قدرے عجیب اور انوکھا ہے۔ یہ بالغ لوگ بعض اوقات واقعی بڑی حماقتیں کرتے ہیں۔

سوفی نے کہا: "امی میں آپ سے پکا وعدہ کرتی ہوں کہ میں اس قسم کی چیز کو کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں گی . . . اور نہ وہ لگاتا ہے۔ لیکن اسے فلسفے میں بڑی دلچسپی ہے۔"

"کیا وہ تم سے بڑا ہے؟"

سوفی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہم عمر؟"

سوفی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"خیر، ڈارلنگ، میرا خیال ہے وہ بڑا مزے دار آدمی ہوگا۔ اچھا، اب لیٹ جاؤ اور کچھ دیر سونے کی کوشش کرو۔"

لیکن سوفی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ کھڑکی کے قریب بیٹھی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے وہاں بیٹھے گھنٹوں بیت چکے ہوں۔ آخر اس کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ناممکن ہو گیا۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔

وہ بستر پر لیٹنا ہی چاہتی تھی کہ اسے جنگل کی جانب کوئی سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔

اگرچہ باہر تقریباً تاریکی تھی ' اسے کوئی انسانی شکل دکھائی دینے لگی ۔سوفی کے خیال کے مطابق یہ شکل کسی مرد کی تھی اور وہ خاصا معمرنظر آرہا تھا ۔ وہ یقیناً اس کا ہم عمر نہیں تھا۔ وہ سر پر کسی قسم کی کپڑے کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

وہ قسم کھا کر کہہ سکتی تھی کہ اس شخص نے نگاہ اٹھا کر اوپر مکان کی جانب دیکھا تھا لیکن سوفی کے کمرے میں روشنی نہیں تھی ۔ وہ سیدھا ڈاک ڈبے کی طرف گیا اور اس نے خاصا موٹا لفافہ اس میں ڈال دیا ۔جب وہ لفافہ ڈبے میں گرا رہا تھا ' اسے سوفی کا خط نظر آگیا۔ اس نے ڈبے میں ہاتھ ڈالا اور خط اچک لیا ۔ اگلے لمحے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا جنگل کی طرف چلا گیا ۔ اس نے لپک جھپک جنگل کی پگڈنڈی پکڑی اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سوفی کو محسوس ہوا کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے ۔ اس کا اولین جبلی ردعمل یہ تھا کہ وہ اپنے شب خوابی کے لباس میں ہی اجنبی کا تعاقب کرے لیکن بوقت نیم شب اسے اس کے پیچھے بھاگنے کا حوصلہ نہ ہوا ۔لیکن اسے باہر جانا اور لفافہ لانا تھا۔

ایک دو منٹ بعد وہ دبے پاؤں سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی ' چپکے سے سڑک کے سامنے کا دروازہ کھولا اور ڈاک ڈبے کی طرف بھاگ پڑی ۔ پلک جھپکنے میں وہ ہاتھ میں لفافہ پکڑے واپس اپنے کمرے میں پہنچ گئی ۔ وہ دم سادھے اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی ۔ جب چند منٹ گزر گئے اور مکان پر موت کا سکوت چھا گیا ' اس نے خط کھولا اور پڑھنے لگی ۔

وہ جانتی تھی کہ اس میں اس کے اپنے خط کا جواب نہیں ہوگا ۔ وہ اگلے روز سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا۔

تقدیر

مائی ڈیر سوفی ' ایک بار پھر سلام صبح ۔ اگر تمہارے ذہن میں بھولے سے بھی کوئی خیال آجائے ' پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ تم چوری چھپے کبھی میرا اتا پتا معلوم کرنے کی کوشش نہ کرنا ۔ اور یہ حتمی (انتباہ) ہے ۔تم میرے حکم کی خلاف ورزی تو

نہیں کرو گی؟

خیر ' چھوڑو ' اب ہم دوبارہ فلسفیوں کی طرف پلٹتے ہیں ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے فطرت کے تغیرات میں کیسے فطری وجوہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی ۔ اس سے قبل ان چیزوں کو اساطیر کے حوالے سے بیان کیا جاتا تھا۔

دوسرے شعبوں میں بھی قدیم توہمات کے جالے دور کرنے کی ضرورت تھی ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی فلسفی صحت و بیماری کے معاملات اور سیاسی واقعات میں بھی بڑی دلچسپی لیتے تھے ۔ ان دونوں شعبوں میں عام یونانی تقدیریت (fatalism) کے بڑے قائل تھے۔

تقدیریت وہ عقیدہ ہے جس کے مطابق جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے ' پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے ۔ اس عقیدے کے ماننے والے ساری دنیا میں ہمیشہ موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں ۔ یہاں نارڈیائی ممالک کے باشندے جس طرح "lagnadan" (یا تقدیر) کو سختی سے مانتے تھے ' اس کا ذکر آئس لینڈ میں لکھی گئی منظوم کہانیوں میں ،جنہیں "ایڈا" کہا جاتا ہے ،ملتا ہے۔

قدیم یونان اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی ہمیں یہ عقیدہ ملتا ہے کہ لوگوں کو اپنی تقدیر کا حال کسی نہ کسی قسم کی غیبی آواز (oracle) سے مل سکتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں کسی شخص یا ملک کی تقدیر مختلف طریقوں سے پیشگی معلوم کی جاسکتی تھی۔

آج بھی ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ وہ تاش کے پتے پھینٹ کر ' آدمی کے ہاتھوں کی لکیروں کا مطالعہ کرکے یا ستاروں کی چال دریافت کرکے اس کے مستقبل کی نشان دہی کرسکتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ناروے والوں کا اپنا مخصوص طریقہ ہے ۔ اس کے ذریعے آدمی کی قسمت کا حال کافی کی پیالیوں میں پڑھا جاسکتا ہے ۔ جب کافی کی پیالی خالی ہوجاتی ہے ' تلچھٹ میں لپی ہوئی کافی کے چند نشانات نظر آنے لگتے ہیں ۔ ان نشانات سے ایک خاص قسم کا خاکہ یا پیٹرن (pattern) بن جاتا ہے ——— اگر نہیں بھی بنتا تب بھی آپ اگر کم از

کم اپنے تخیل کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں ، تو آپ یہی سمجھنے لگیں گے کہ یہ خاکہ موجود ہے ۔ اگر یہ نشانات کار کی شکل بناتے ہوں تو سمجھیں کہ جس شخص نے کافی پی ہے ، وہ کار میں کسی لمبے سفر پر روانہ ہو جائے گا۔

چنانچہ " نجومی " کسی ایسی چیز کو پیشگی دیکھنے کی کوشش کرتا ہے جسے درحقیقت پیشگی دیکھنا ناممکن ہوتا ہے ۔ پیش بینیوں اور پیش گوئیوں کا یہی سب سے بڑا وصف ہے ۔ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ چونکہ ان لوگوں کو جو کچھ " نظر " آتا ہے ، وہ اتنا مبہم اور غیرواضح ہوتا ہے کہ ان کے دعووں کو جھٹلانا دشوار ہو جاتا ہے ۔

جب ہم ستاروں کو بہ نگاہ غور دیکھتے ہیں ، جھلملاتے نقطوں کا وسیع و عریض بے ترتیب ہجوم نظر آتا ہے (تم ان سے کیا نتیجہ اخذ کرو گی ؟) ۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر دور میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ستارے زمین پر ہماری زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا سکتے ہیں ۔ آج بھی ایسے سیاسی رہنما موجود ہیں جو اہم فیصلے کرنے سے پہلے نجومیوں سے مشورہ کرنا ضروری تصور کرتے ہیں ۔

ڈیلفی کا ہاتف غیبی

قدیم یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ وہ اپنی قسمت کے معاملے میں ڈیلفی (1) کے مشہور ہاتف غیبی سے مشورہ لے سکتے ہیں ۔ اس غیبی آواز کا دیوتا اپالو تھا اور وہ اپنی پروہتن پوتھیا کے ذریعے ہم کلام ہوتا تھا جو ایک زمینی شگاف کے اوپر سٹول پر بیٹھا کرتی تھی ۔ اس شگاف سے خواب آور بخارات اٹھتے تھے اور پوتھیا پر بے خودی کی کیفیت طاری کردیتے تھے ۔ یوں وہ اپالو کی ترجمانی کرنے کے قابل ہو جاتی تھی ۔

جب لوگ ڈیلفی پہنچتے تھے ، انہیں اپنا سوال غیبی آواز کے پروہتوں کے سامنے پیش کرنا ہوتا تھا جو اسے پوتھیا تک

پہنچاتے تھے ۔ پوتھیا کا جواب اتنا مبہم یا ذو معنی ہوتا کہ اس کی تشریح پروہتوں کو کرنا پڑتی ۔ اس طریقے سے لوگ اپالو کی دانش سے فیض یاب ہونے کی کوشش کرتے اور سمجھنے لگتے کہ وہ سب کچھ، یہاں تک کہ مستقبل کے متعلق بھی، جانتا ہے۔

مختلف مملکتوں کے سربراہ جب تک ڈیلفی کی غیبی آواز سے مشورہ نہ کرلیتے، جنگ چھیڑنے یا کوئی دوسرا فیصلہ کن قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے ۔ چنانچہ اپالو کے پروہت کم و بیش سفارت کاروں یا مشیروں کے فرائض سرانجام دیتے تھے ۔ وہ اتنے ماہر تھے کہ ملک اور لوگوں کی رگ رگ کو پہچانتے تھے۔

ڈیلفی کے معبد کے صدر دروازے پر یہ مشہور عبارت کندہ تھی : اپنے آپ کو پہچان ! اس سے زائرین کو یہ یاد دلایا جاتا کہ وہ کبھی اپنے آپ کو فانی انسانوں سے بڑھ کر کچھ اور نہ سمجھیں اور یہ کہ کوئی شخص بھی اپنے مقدر سے بچ نہیں سکتا۔

یونانیوں کے ہاں ایسے اشخاص کے بے شمار قصے کہانیاں مشہور تھیں جن کا مقدر بالآخر انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا ۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان " الم زدہ " (tragic) اشخاص کے متعلق متعدد ڈرامے ـــــ المیے (tragedies) ـــــ تحریر کئے جانے گئے ۔ ان میں مشہور ترین شاہ اوئی دی پوس (Oedipus) کا المیہ ہے۔

تاریخ اور طب

لیکن تقدیر محض افراد کی زندگیوں پر حاوی نہیں تھی ۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ عالمی تاریخ بھی تقدیر کے تابع ہے اور یہ کہ جنگوں کا فیصلہ بھی دیوتاؤں کی دخل اندازی سے متاثر ہوسکتا ہے ۔ آج بھی بے شمار لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا یا کوئی اور پراسرار قوت تاریخ کا دھارا متعین کررہی ہے۔

لیکن عین اس زمانے میں جب یونانی فلسفی فطرت کی

عمل کاریوں (processes) کی فطری وجوہ کی تلاش میں مصروف تھے ۔ تاریخ کے دھارے کی فطری وجوہ کی تلاش کے خواہش مند مورخین منظر عام پر آنا شروع ہوگئے تھے ۔ اب جب کوئی ملک جنگ ہارتا ، یہ کہنے سے بات نہیں بنتی تھی کہ دیوتاؤں نے اپنا انتقام لیا ہے ۔ یونان کے مشہور ترین مورخ ہیرودوتوس (Herodotus) (484 ق م تا 424 ق م) اور تھوکودیدیس (Thucydidus) (460ق م 400ق م) تھے ۔

یونانیوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ بیماریاں الوہی دخل اندازی کا نتیجہ قرار دی جاسکتی ہیں ۔ اس کے برعکس اگر لوگ مناسب قربانی دیں، دیوتا انہیں دوبارہ صحت یاب کرسکتے ہیں ۔

لیکن یہ تصور محض یونانیوں تک محدود نہیں تھا ۔ جدید طب کی ترقی سے پہلے عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ بیماری کے پیچھے مافوق الفطرت وجوہ کارفرما ہوتی ہیں ۔ لفظ " انفلوانزا " کے اصل معنی "ستاروں کا ضرر رساں اثر" ہیں ۔

آج بھی بے شمار لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بعض بیماریاں ـــــ مثلاً ایڈز ـــــ خدا کا قہر ہیں ۔ بعض لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مریضوں کو فوق الفطرت چیزوں کی مدد سے صحتیاب کیا جاسکتا ہے ۔

جس زمانے میں یونانی فلسفے میں نئی جہتیں کھل رہی تھیں، اسی زمانے میں یونانی طب بھی وجود میں آئی جو امراض اور صحت کی فطری وجوہ کی متلاشی تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ یونانی طب کا بانی بقراط تھا جو تقریباً چار سو ساٹھ سال قبل مسیح جزیرہ کوس (Cos) میں پیدا ہوا تھا ۔

بقراطی طبی روایت کے مطابق بیماری کے خلاف موثر ترین حفاظتی تدابیر اعتدال اور صحت مند طرز حیات ہیں ۔ صحت فطری حالت ہوتی ہے ۔ جب بیماری آتی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ جسمانی یا ذہنی عدم توازن کے باعث فطرت پٹری سے اتر گئی ہے ۔ جو شخص صحت مند رہنا چاہتا ہے ، اسے چاہیے کہ وہ اعتدال ، ہم آہنگی اور " صحت مند جسم میں صحت مند دماغ " کے اصولوں پر عمل کرے ۔

آج کل " طبی اخلاقیات " کا بڑا چرچا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر یا طبیب کو بعض اخلاقی اصولوں کے تحت طبابت کرنا چاہیے ۔ مثلاً ڈاکٹر کو کبھی کسی شخص کو منشیات کا نسخہ نہیں دینا چاہیے ۔ ڈاکٹر کو پیشہ ورانہ احتیاط برتنا چاہیے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مریض نے اپنے مرض کے متعلق ڈاکٹر کو جو کچھ بتایا ہے ، اس کو اسے صیغہ راز میں رکھنا چاہیے ۔ ان تصورات کی ابتدا بقراط سے ہوئی تھی ۔ وہ اپنے شاگردوں سے تقاضا کرتا تھا کہ وہ مندرجہ ذیل حلف اٹھائیں:

میں ان اصولوں یا طریقوں پر کاربند رہوں گا جو میں اپنی قابلیت اور دانست کے مطابق اپنے مریضوں کے لیے سودمند سمجھتا ہوں اور ہر اس چیز سے گریز کروں گا جو ضرر رساں یا تکلیف دہ ہو ۔ کوئی مانگے بھی تب بھی میں اسے کوئی مہلک دوا نہیں دوں گا اور اسی طرح میں کسی عورت کو اسقاط حمل کے ذرائع فراہم نہیں کروں گا ۔ جب میں کسی شخص کے گھر جاؤں گا ، صرف مریض کی بھلائی کی خاطر جاؤں گا اور رضاکارانہ طور پر ہر اس کام سے دور رہوں گا جس سے شرارت یا بدعنوانی ٹپکتی ہو ، اور مزید برآں میں کسی عورت یا مرد کو ، وہ آزاد ہو یا غلام ، بہلا پھسلا کر غلط کاری کی ترغیب نہیں دوں گا ۔ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے دوران میں میں ان تمام باتوں کو ، جنہیں عام نہیں کرنا چاہیے ، جب سنوں یا دیکھوں گا ، پردہ اخفا میں رکھوں گا ۔ میری دعا ہے کہ جب تک میں اس حلف پر پورا اترتا رہوں اور اس کی خلاف ورزی نہ کروں ، میں زندگی اور طبابت سے لطف اندوز ہوتا رہوں اور تمام زمانوں کے تمام لوگ مجھے عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے رہیں ، لیکن اگر میں اس حلف کی خلاف ورزی کروں تو میرا مقدر اس کے برعکس ثابت ہو ۔

ہفتے کی صبح سوفی گھبرا کر بیدار ہوگئی ۔ یہ خواب تھا یا اس کی واقعی فلسفی سے ملاقات ہوئی تھی؟

اس نے ایک ہاتھ سے پلنگ کو نیچے سے ٹٹولا - ہاں ـــــــ رات جو خط آیا تھا، وہیں تھا - یہ محض خواب نہیں تھا -

اس کی واقعی فلسفی سے ملاقات ہوئی تھی - اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اس نے اپنی آنکھوں سے اسے ڈاک ڈبے سے خط نکالتے اور اپنے ساتھ لے جاتے دیکھا تھا!

وہ سمٹ کر فرش پر بیٹھ گئی اور اس نے پلنگ کے نیچے سے تمام ٹائپ شدہ کاغذات نکال لیے - لیکن یہ کیا ہے ؟ دیوار کے بالکل قریب کوئی سرخ چیز پڑی تھی - شاید سکارف ہے ؟

سوفی دھیرے دھیرے پلنگ کے نیچے کھسکنے لگی اور اس نے سرخ ریشمی رومال باہر کھینچ لیا - وہ پورے وثوق سے کہہ سکتی تھی کہ یہ اس کا نہیں -

اس نے سکارف کا بڑے غور سے جائزہ لیا اور اسے سیون کے ساتھ ساتھ سیاہی سے ہلڈے لکھا نظر آیا -

ہلڈے ! لیکن یہ ہلڈے کون ہے ؟ آخر وہ یوں اچانک ایک دوسرے کے سامنے کیسے کھڑی ہو جاتی ہیں ؟

7۔ سقراط

* * *

... عقل مند ترین وہ ہے جو جانتا ہے کہ وہ نہیں جانتا ...

سوفی نے گرمائی لباس پہنا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس کی امی باورچی خانے کی میز کے قریب کھڑی تھی۔ سوفی نے سوچ لیا کہ وہ ریشمی سکارف کے متعلق کوئی بات نہیں کرے گی۔

"آپ اخبار اٹھا لائی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

اس کی ماں اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تم اٹھا لاؤ گی؟"

سوفی پلک جھپکنے میں باہر نکل گئی۔ وہ بجری والے راستے پر پڑ گئی اور ڈاک ڈبے کی طرف چل پڑی۔

وہاں صرف اخبار پڑا تھا۔ اس نے سوچا: "مجھے اتنی جلدی جواب کی توقع نہیں کرنا چاہیے۔" اخبار کے پہلے صفحے پر اس نے اقوام متحدہ کی طرف سے لبنان میں تعینات ناروے کے فوجی دستے کے متعلق کچھ پڑھا۔

اقوام متحدہ کا دستہ... ہلڈے کے باپ کی طرف سے اسے جو کارڈ موصول ہوا تھا، اس پر یہی مہر نہیں لگی ہوئی تھی؛ لیکن ڈاک کی ٹکٹ تو ناروے کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اقوام متحدہ کے ساتھ کام کرنے والے ناروے کے فوجی سپاہیوں کا اپنا ڈاک خانہ ہو۔

"تم اخبار میں بڑی دلچسپی لینے لگی ہو۔" جب سوفی باورچی خانے میں واپس آئی، اس کی ماں نے خشک لہجے سے کہا۔

خوش قسمتی سے اس کی ماں نے اس روز نہ تو ناشتے کے دوران میں اور نہ کسی دوسرے وقت ڈاک ڈبوں اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے متعلق مزید کچھ کہا۔ جب وہ سودا سلف خریدنے بازار چلی گئی، سوفی نے تقدیر کے متعلق خط اٹھایا اور اپنے خفیہ ٹھکانے چلی گئی۔

اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بسکٹوں کے جس ڈبے میں اس نے فلسفی کے دوسرے خطوط رکھے ہوئے تھے، اس کے قریب ایک اور چھوٹا سفید لفافہ پڑا ہے۔ سوفی کو پورا یقین تھا کہ یہ اس نے وہاں نہیں رکھا تھا۔

اس لفافے کے کونے بھی گیلے تھے۔ گزشتہ روز اسے جو خط ملا تھا جس طرح اس میں دو سوراخ تھے اسی طرح اس میں تھے۔

کیا فلسفی یہاں آیا تھا؟ کیا اسے اس کے خفیہ ٹھکانے کا علم ہے؟ لفافہ گیلا کیوں ہے؟

ان تمام سوالوں نے اس کا سر چکرا دیا۔ اس نے لفافہ کھولا اور رقعہ پڑھنے لگی:

ڈیر سوفی - میں نے تمہارا خط بڑی دلچسپی سے پڑھا ___ ویسے مجھے قدرے افسوس ہوا - جہاں تک تمہاری دعوت کا تعلق ہے، مجھے بدقسمتی سے تمہیں مایوس کرنا ہوگا - کسی روز ہماری ملاقات ہوہی جائے گی، لیکن غالباً مجھے تمہارے گھر آنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔

میں تمہیں مزید بتانا چاہتا ہوں کہ آئندہ خط ڈالنے میں خود نہیں آسکوں گا - اگر یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری رہا تو اس میں خطرات پنہاں ہوں گے - اب میرے خطوط میرا ننھا پیام بر تمہیں پہنچایا کرے گا - وہ یہ خطوط ڈاک ڈبے میں نہیں ڈالا کرے گا بلکہ سیدھا باغ میں تمہارے خفیہ ٹھکانے پہنچا دیا کرے گا۔

جب تمہیں ضرورت پیش آئے، تم مجھے خط لکھ سکتی ہو - تاہم جب کبھی تم یہ کرو، تمہیں گلابی لفافے کے قریب ایک

آدھ بسکٹ یا شکر کی ڈلی رکھنا پڑے گی ۔ جب پیام بر کو تمہارا خط ملا کرے گا' وہ سیدھا میرے پاس لے آیا کرے گا۔

پس نوشت : کسی نوجوان خاتون کی کافی کی دعوت ٹھکرانا اچھی بات نہیں ہے لیکن بعض اوقات ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔

پس پس نوشت : اگر تمہیں کہیں کوئی سرخ سکارف ملے ' اسے سنبھال کر رکھنا ' نوازش ہوگی ۔ بعض اوقات ذاتی اشیا دوسروں کی اشیا میں خلط ملط ہوجاتی ہیں ۔ خاص طور پر سکول جیسے مقامات پر یہ اکثر ہوتا رہتا ہے' اور یہ تو فلسفے کا سکول ہے۔

تمہارا' البرٹو کنوکس

سوفی کی عمر تقریباً پندرہ سال ہوچکی تھی ۔ اس نوعمری میں ہی اسے اور دنوں نہیں ' تو کم از کم کرسمس اور اپنی سال گرہ پر بے شمار خطوط موصول ہوجاتے تھے لیکن ایسا عجیب خط اسے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

اس پر ڈاک کی ٹکٹ نہیں تھی ۔ اسے ڈاک ڈبے میں بھی نہیں ڈالا گیا تھا ۔ اسے سیدھا باڑ میں سوفی کے انتہائی خفیہ ٹھکانے پہنچایا گیا تھا ۔ اسے اچنبھا اس بات پر ہورہا تھا کہ اس موسم بہار میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں برسی تھی لیکن خط گیلا تھا۔

لیکن عجیب ترین واقعہ تو سرخ سکارف کا تھا ۔ فلسفی کی ضرور کوئی دوسری شاگرد ہوگی ۔ ہاں 'بالکل یہی بات ہے ۔ اور اس دوسری شاگرد کا سرخ سکارف کھوگیا ہوگا لیکن اس کا یہ سکارف سوفی کے پلنگ کے نیچے کیسے پہنچ گیا؟

اور البرٹو کنوکس . . . یہ کس قسم کا نام ہے؟

ایک بات ـــــ فلسفی اور ہلڈے مولرکنیگ کے مابین تعلق ـــــ کی تصدیق ہوگئی تھی ۔ لیکن یہ کہ ہلڈے کا اپنا باپ پتوں میں گڑبڑ کررہا ہے ـــــ بالکل سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔

سوفی کافی دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ اس کے اپنے اور ہلڈے کے مابین کیا تعلق ہوسکتا ہے ۔ جب اسے کچھ نہ سوجھا ' اس نے سوچنا ترک کردیا ۔ فلسفی نے لکھا تھا کہ کسی روز ان کی ملاقات ہوجائے گی ۔ شاید وہ ہلڈے سے بھی مل سکے گی ۔

اس نے خط الٹایا - اس نے اب دیکھا کہ اس کی پشت پر بھی چند فقرے لکھے ہوئے ہیں:

کیا کوئی ایسی چیز ھے جسے فطری حیا کہا جاسکے؟
عقل مند ترین وہ ھے جو جانتا/جانتی ھے کہ وہ نہیں جانتا/جانتی..
صحیح بصیرت اندر سے آتی ھے-
جو جانتا / جانتی ھے کہ صحیح کیا ھے صحیح کام کرے گا/ گی۔

سوفی جانتی تھی کہ چھوٹے سفید لفافوں میں جو جملے آتے ہیں وہ اسے اگلے بڑے لفافے کے لیے تیار کرتے ہیں جو اس کے کچھ ہی دیر بعد پہنچ جاتے ہیں - اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا - اگر "پیام بر" نے خاکی لفافہ پہنچانے اس کے خفیہ ٹھکانے پر آنا ہے، پھر وہ یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرسکتی ہے - لیکن یہ "پیام بر" ہے کون، مرد یا عورت؟ بہرحال وہ عورت ہو یا مرد، کوئی فرق نہیں پڑتا - وہ بھی اپنی دھن کی پکی ہے اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی جب تک وہ اسے فلسفی کے متعلق مزید معلومات فراہم نہیں کرتا/ کرتی - خط میں بتایا گیا تھا کہ "پیام بر" ننھا منا ہے - تو کیا یہ کوئی بچہ ہے؟

"کیا کوئی ایسی چیز ہے جسے فطری حیا کہا جاسکے؟"

سوفی کو معلوم تھا کہ "حیا" شرمیلے پن کے لیے پرانی قسم کا لفظ ہے ــــ مثلاً آدمی کو اس بات پر حیا آتی ہے کہ کوئی اسے برہنہ حالت میں نہ دیکھ لے - لیکن اس سلسلے میں گھبرانا، شرمانا یا کھسیانا واقعی فطری فعل ہے؟ "اگر کوئی چیز فطری ہے، تو سب کے لیے ہونا چاہیے - "اس نے سوچا - "دنیا کے بہت سے علاقوں میں برہنہ رہنا بالکل فطری سمجھا جاتا ہے - چنانچہ آپ کو کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا، اس کا فیصلہ معاشرہ کرتا ہوگا - جب دادی اماں جواں ہوں گی، وہ یقیناً قمیص اور انگیا اتار کر دھوپ نہیں سینک سکتی ہوں گی - اگرچہ آج کل بھی بے شمار ممالک میں اس حرکت کو معیوب سمجھا جاتا ہے اور اس کی سخت ممانعت ہے، لیکن (مغرب میں) اس کا برا نہیں منایا جاتا اور اکثر لوگ اسے بالکل "فطری" قرار دیتے ہیں - کیا یہ بھی فلسفے کی کوئی بات ہے؟ سوفی متعجب تھی۔

اگلا جملہ تھا: "عقل مند ترین وہ ہے جو جانتا / جانتی ہے کہ وہ نہیں جانتا / جانتی۔"

کس سے زیادہ عقل مند؟ اگر فلسفی کا مطلب ہے کہ وہ عورت جو سمجھتی ہے کہ وہ آسمان تلے ہر شے نہیں جانتی ' اس عورت سے زیادہ عقل مند ہے جو جانتی تو کوئی خاص نہیں لیکن سمجھتی ہے کہ وہ بہت کچھ جانتی ہے ـــــ تو ' خیر ' پھر اس سے متفق ہونا اتنا مشکل نہیں ہے۔ سوفی نے اس بارے میں پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب وہ جتنا زیادہ سوچتی تھی اتنا ہی زیادہ واضح طور پر اسے نظر آرہا تھا کہ جو کچھ آپ نہیں جانتے اس کے متعلق یہ جاننا ہی کہ آپ نہیں جانتے ایک قسم کا علم ہے۔ اب وہ سمجھ گئی تھی کہ احمقانہ ترین لوگوں کا یہ رویہ ہے کہ جن چیزوں کا انہیں خاک علم نہیں ہوتا وہ ان کے متعلق بھی یوں باتیں کرتے ہیں جیسے وہ سب کچھ جانتے ہوں۔

اگلے جملے سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ صحیح بصیرت اندر سے آتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے: کیا لوگوں کے اذہان میں تمام علم باہر سے نہیں آتا؟ اس کے برعکس سوفی کو وہ واقعات بھی یاد آرہے تھے جب اس کی ماں یا اساتذہ اسے وہ باتیں سکھانے کی کوشش کرتے تھے جن کے لیے وہ ذہناً تیار نہیں ہوتی تھی۔ اور جب وہ واقعی کوئی چیز سیکھتی تھی تب سیکھتی تھی جب اس کے سیکھنے میں اس نے خود بھی کوئی حصہ لیا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پہلے جو چیز اس کے قطعاً پلے نہیں پڑی تھی ' ایکا ایکی اس کی سمجھ میں آجاتی تھی۔ "بصیرت" سے غالباً لوگوں کی یہی مراد ہے۔

چلیں ' یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ سوفی کے اپنے خیال کے مطابق اس نے پہلے تین سوالوں کے خاصے معقول جواب تلاش کر لیے تھے۔ لیکن اگلا بیان اتنا عجیب تھا کہ وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔ "جو جانتا / جانتی ہے کہ صحیح کیا ہے صحیح کام کرتا / کرتی ہے۔"

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ڈاکو بینک لوٹتا ہے اس لیے لوٹتا ہے کیونکہ اسے اس سے بہتر کا علم نہیں ہوتا؟ سوفی کا خیال تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

سوفی کا خیال تھا کہ اس کے برعکس بچے اور بڑے دونوں ہی ایسی ایسی احمقانہ حرکتیں کرتے ہیں کہ بعد میں غالباً وہ پچھتاتے ہوں گے کہ انہوں نے کیا کر دیا۔ انہیں جو پچھتاوا ہوتا ہے اس کی صحیح صحیح وجہ یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہوتا ہے اپنی دانست کے خلاف کیا ہوتا ہے۔

جب وہ بیٹھی سوچ رہی تھی اسے جنگل کے قریب ترین باڑ کی دوسری طرف درختوں کے نیچے جھاڑ جھنکاڑ میں سرسراہٹ سنائی دی۔ کیا یہ پیامبر ہے؟ اس کا دل تیزی سے

دھڑکنے لگا۔ آواز کچھ اس قسم کی تھی جیسے کوئی جانور ہانپتا کانپتا آرہا ہو۔
اگلے لمحے ایک لحیم شحیم لیبرے ڈور (labrador) (1) کتا دھکم دھکا کرتا خفیہ ٹھکانے میں داخل ہوگیا۔

اس کے منہ میں بڑا خاکی لفافہ تھا اور وہ اس نے سوفی کے قدموں پر گرا دیا۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ سوفی کو ردعمل ظاہر کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ ایک دو سیکنڈ بعد وہ ہاتھ میں لفافہ پکڑے بیٹھی تھی ——— اور سنہری بالوں والا کتا قلانچیں بھرتا جنگل میں جاچکا تھا۔

یہ سب کچھ ہوچکا تو اس نے اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ وہ رونے لگی۔
وہ کچھ دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ وقت کا احساس کھو چکی تھی۔
پھر اس نے اچانک نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔
تو یہ تھا اس کا مشہور پیام بر! سوفی نے اطمینان کی سانس لی۔ تو یہ بات تھی کہ سفید لفافوں کے کونے گیلے تھے اور ان میں سوراخ تھے۔ اسے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا؟ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ فلسفی نے یہ کیوں کہا تھا کہ جب وہ اسے خط لکھے، وہ لفافے کے قریب بسکٹ یا شکر کی ڈلی رکھ دیا کرے۔

وہ بے شک ہمیشہ اتنی تیزی طراری کا مظاہرہ نہیں کرپاتی تھی جتنا کہ وہ چاہتی تھی، پھر بھی یہ کیسے خیال آسکتا تھا کہ پیام بر تربیت یافتہ کتا ہوگا۔ نرم سے نرم الفاظ میں یہی کہا جاسکتا تھا کہ یہ بات معمول سے ذرا ہٹ کر تھی! اب اسے یقیناً بھول جانا ہوگا کہ وہ پیام بر کو البرٹو کنوکس کے ٹھکانے کے متعلق کچھ بتانے پر مجبور کرسکے گی۔
سوفی نے بڑا لفافہ کھولا اور پڑھنے لگی۔

ایتھنز کا فلسفہ

ڈیر سوفی، جب تم یہ تحریر پڑھوگی تم غالباً ہرمیز (Hermes) (2) سے مل چکی ہوگی۔ اگر تمہاری اس سے ملاقات نہیں ہوئی پھر میں یہ کہوں گا کہ وہ دراصل کتا ہے۔ لیکن تمہیں پریشان ہونے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بڑا نیک مزاج کتا

ہے ـــــ اور بڑی بات یہ ہے کہ وہ بے شمار لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ ذہین ہے ۔ بہرحال وہ کبھی یہ تاثر دینے کی کوشش نہیں کرتا کہ وہ اس سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے جتنا کہ وہ درحقیقت ہے ۔

یونانی دیومالا میں وہ دیوتاؤں کا پیام بر ہے ۔ وہ سمندری مسافروں اور ملاحوں کا دیوتا بھی تھا ' لیکن اس بارے میں کم از کم فی الحال ہم تردد نہیں کریں گے ۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ Hermes سے لفظ hermetic وجود میں آیا جس کے معنی پوشیدہ یا ناقابل رسائی ہیں ـــــ جس طریقے سے وہ ہمیں ایک دوسرے سے چھپانے کا اہتمام کرتا ہے ' اس کے پیش نظر یہ نام اتنا نامناسب نہیں ہے ۔

چلیں ' پیام بر کا تعارف تو ہوگیا ۔ جب اس کا نام پکارا جاتا ہے ' فطرتاً وہ اس کا جواب دیتا ہے اور مجموعی اعتبار سے وہ بڑا سلجھا ہوا اور خوش اخلاق کتا ہے ۔

خیر چھوڑو ' اب ہم فلسفے کی طرف دوبارہ رجوع کرتے ہیں ۔ ہم نصاب کا حصہ اول پہلے ہی مکمل کر چکے ہیں ۔ میرا اشارہ طبعی فلسفیوں اور ان کے اس کام کی طرف ہے جو انہوں نے یونان کی دیومالائی دنیا سے فیصلہ کن انداز سے قطع تعلق کرنے میں سرانجام دیا ۔ اب ہماری ملاقات تین عظیم کلاسیکی فلسفیوں ـــــ سقراط ' افلاطون اور ارسطو ـــــ سے ہوگی ۔ ان تینوں فلسفیوں نے اپنے اپنے انداز سے ساری یورپی تہذیب کو متاثر کیا ہے ۔

طبعی فلسفیوں کو ماقبل سقراطی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کا زمانہ سقراط سے پہلے کا ہے ۔ اگرچہ دیموکری توس سقراط کی پیدائش کے چند سال بعد بھی زندہ رہا ' تاہم اس کے تمام خیالات و افکار قبل از سقراط طبعی فلسفے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ سقراط جغرافیائی اور زمانی دونوں اعتبار سے ایک نئی عہد کی نمائندگی کرتا ہے ۔ ایتھنز میں جو فلسفی پیدا ہوئے ' ان میں اولیت کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے ۔ وہ اور اس کے دونوں جانشین وہیں رہتے اور وہیں اپنا کام کرتے تھے ۔ تمہیں شاید یاد ہو کہ اناک گوراس

بھی کچھ عرصہ ایتھنز میں مقیم رہا تھا لیکن اہل ایتھنز نے اسے اتنا تنگ کیا کہ اسے وہاں سے بھاگتے ہی بن پڑی ۔ ایتھنز کے باشندے اس لیے اس کے مخالف ہوگئے تھے کیونکہ وہ کہتا تھا کہ سورج دہکتا ہوا پتھر ہے ۔(سقراط کا انجام بھی اچھا نہیں ہوا!!)

سقراط کے عہد میں ایتھنز یونانی تہذیب وثقافت کا مرکز بن گیا اور اس کا یہ اعزاز آج تک برقرار ہے ۔ طبعی فلسفیوں سے سقراط تک پہنچتے پہنچتے خود فلسفیانہ پراجیکٹ کی نوعیت میں جو تبدیلی رونما ہوئی، اسے بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے ۔ لیکن سقراط سے ملاقات کرنے سے پہلے ہمیں کچھ ذکر نام نہاد سوفسطائیوں کا کرنا ہوگا جو سقراط کے زمانے میں ایتھنز پر چھائے ہوئے تھے ۔

تو سوفی، پردہ اٹھتا ہے ! خیالات کی تاریخ کئی لحاظ سے متعدد ایکٹ کے ڈرامے کی مانند ہے ۔

مرکز کا شخص

تقریباً چار سو پچاس سال قبل مسیح ایتھنز یونانی دنیا کا ثقافتی مرکز بن گیا۔ اس کے بعد فلسفہ نئی جہت میں چل پڑا۔

طبعی فلسفیوں کا زیادہ تر تعلق طبعی دنیا کی فطرت سے تھا ۔ اس نے انہیں سائنس کی تاریخ میں مرکزی مقام بخش دیا ہے ۔ ایتھنز میں اب توجہ فرد اور معاشرے میں فرد کے مقام پر مرکوز ہوگئی تھی ۔ بتدریج ایک قسم کی جمہوریت نمو پانے لگی تھی ۔ عام لوگوں پر مشتمل اسمبلیاں اور قانونی عدالتیں وجود میں آچکی تھیں۔

جمہوریت کی کامیابی کے لیے لازمی تھا کہ لوگ اتنے پڑھے لکھے ضرور ہوں کہ وہ جمہوری عمل میں حصہ لے سکیں ۔ ہم نے اپنے زمانے میں دیکھا ہے کہ کس طرح کسی نوخیز جمہوریت کے لیے یہ لازمی ہوجاتا ہے کہ عام لوگ روشن خیال ہوں ۔ ایتھنز والے جس بات پر سب سے زیادہ زور دیتے تھے، وہ یہ تھی کہ انہیں

فن خطابت پر عبور حاصل ہو۔ خطابت (oratory) کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنی بات ایسے انداز سے کہنے کا ہنر آتا ہو کہ دوسرے قائل ہو جائیں۔

یونانی نو آبادیوں سے گشتی اساتذہ اور فلسفی جوق در جوق ایتھنز پہنچے اور وہاں آباد ہونے لگے۔ وہ اپنے آپ کو سوفطائی (sophists) کہتے تھے۔ لفظ sophist کا مطلب عقل مند اور باخبر شخص ہے۔ ایتھنز میں سوفطائی شہریوں کو با معاوضہ تعلیم دیتے اور اپنی روزی کماتے تھے۔

سوفطائیوں اور طبعی فلسفیوں میں ایک بات مشترک تھی: دونوں روایتی صنمیات کے نکتہ چین تھے۔ لیکن اس کے ساتھ سوفطائی ایک بات کو، جسے وہ بے سود فلسفیانہ قیاس آرائی کہتے تھے، مسترد کردیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگرچہ فلسفیانہ سوالوں کے جواب موجود ہوسکتے ہیں، انسان فطرت اور کائنات کے معموں کی حقیقت معلوم نہیں کرسکتا۔ فلسفے میں اس قسم کے نقطہ نظر کو تشکیک پسندی (skepticism) کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر ہم فطرت کے تمام معموں کو نہ بھی جان سکیں، ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ لوگوں کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے کا ڈھنگ سیکھنا لازمی ہے۔ سوفطائیوں نے اپنے مطالعے کے لیے انسان اور معاشرے میں اس کے مقام کا انتخاب کیا۔

"انسان تمام اشیا کا پیمانہ ہے۔" سوفطائی فلسفی پروتے گوراس (تقریباً 485 تا 410 ق م) نے کہا تھا۔ اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ سوال طے کرنے کے لیے کہ آیا کوئی بات صحیح ہے یا غلط، اچھی ہے یا بری، اس پر ہمیشہ غور اس طرح کرنا چاہیے کہ انسانی ضروریات سے اس کا کیا تعلق بنتا ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا: "آپ کو یونانی دیوتاؤں پر اعتقاد ہے؟" اس نے جواب دیا: "سوال پیچیدہ اور زندگی مختصر ہے۔" وہ شخص جو دو ٹوک انداز سے یہ نہ بتا سکے کہ خدا یا دیوتا موجود ہے یا نہیں، اسے لاادری (agnostic) کہا جاتا ہے۔

سوفطائی عمومی اعتبار سے وہ لوگ تھے جنھوں نے گھاٹ

گھاٹ کا پانی پیا تھا اور جو طرح طرح کی حکومتیں دیکھ چکے تھے۔ شہری ریاستوں میں رواجی ضابطے اور مقامی قوانین دونوں دوسروں سے بہت مختلف ہوسکتے تھے ۔ اس سے سوفسطائیوں کو یہ سوال اٹھانے کا حوصلہ ہوا کہ انسان فطرتاً کیا کرتا ہے اور معاشرہ اس سے کیا کراتا ہے ۔ یوں انہوں نے ایتھنز کی شہری ریاست میں معاشرتی تنقید کا دروازہ کھول دیا۔

علاوہ وہ اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہوں گے کہ "فطری حیا" جیسی ترکیب قابل دفاع نہیں ہوتی کیونکہ اگر حیا دار ہونا "فطری" ہے ، پھر یہ کوئی ایسی چیز ہوگی جسے آپ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہونے ہوں گے یعنی یہ خلقی کہلانے گی ۔ لیکن سوفی ، کیا یہ واقعی فطری ہے یا معاشرے کا کیا دھرا ہے ؛ وہ شخص جو دنیا میں گھوما پھرا ہو ، اس کے لیے اس کا جواب دینا آسان ہوگا ۔ اپنی برہنگی سے خوف کھانا "فطری" ——— یا خلقی ——— نہیں ۔ حیا ——— یا اس کا فقدان ——— سراسر معاشرتی رواج ہے ۔

جیسا کہ تم خود تصور کرسکتی ہو کہ قریہ قریہ ملک ملک گھومنے پھرنے والے سوفسطائیوں نے جب یہ کہا ہوگا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے ، اس کو ماپنے کا کوئی حتمی پیمانہ نہیں ہے ، تو ایتھنز میں لازماً ہنگامہ کھڑا ہوگیا ہوگا۔

اس کے برعکس سقراط نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ اس قسم کے بعض معیار درحقیقت مطلق ہیں اور وہ آفاقی طور پر صحیح گردانے جاتے ہیں۔

سقراط کون تھا؟

سقراط (470 تا 399 ق م) فلسفے کی پوری تاریخ کی امکانی طور پر انتہائی پراسرار اور ناقابل فہم شخصیت ہے ۔ اس نے کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی تھی ۔ اس کے باوجود اس کا شمار ان فلسفیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے یورپی فکر پر انمٹ نقوش

چھوڑے ہیں ۔ پھر جس ڈرامائی انداز سے اس کی موت واقع ہوئی ، وہ بھی کم قابل توجہ نہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ ایتھنز میں پیدا ہوا تھا اور یہ کہ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ شہر کے چوراہوں اور منڈیوں میں لوگوں سے باتیں کرتے گزرا تھا جن سے اس کی وہاں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں ۔ "دیہات کے درخت مجھے کچھ نہیں سکھا سکتے ۔" وہ کہا کرتا تھا ۔ وہ مسلسل گھنٹوں اپنے خیالات میں مگن کھڑا بھی رہ سکتا تھا۔

اپنی زندگی کے دوران میں ہی اسے اکثر معما تصور کیا جاتا تھا اور اپنی موت کے کچھ ہی عرصہ بعد اسے اتنے کثیر لیکن ایک دوسرے سے قطعی مختلف مکاتب فکر کا بانی قرار دیا جانے لگا کہ ان کا شمار ممکن نہیں ۔ بالکل اسی حقیقت نے کہ وہ اتنا چیستانی اور ذو معنویت کا حامل تھا ، ایک دوسرے کے متضاد مکاتب فکر کے لیے ممکن بنا دیا کہ وہ اسے اپنا جتا سکیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اس کے متعلق یہ بات بالکل یقینی ہے کہ وہ بے حد بد صورت اور بھدا تھا ۔ وہ توندیل تھا ، اس کی آنکھیں باہر کو ابلی پڑتی تھیں اور اس کی ناک مہین اور اوپر کو اٹھی ہوئی تھی ۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کا باطن " کاملاً خوبصورت " تھا ۔ اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا تھا : " آپ اسے حال میں تلاش کریں ، آپ اسے ماضی میں تلاش کریں لیکن اس کا مثیل آپ کو کہیں نہیں ملے گا ۔ " اس کے باوجود اسے اپنی فلسفیانہ سرگرمیوں کی بنا پر سزائے موت دی گئی۔

سقراط کی زندگی کے بارے میں ہمیں زیادہ تر معلومات افلاطون کی تحریروں میں ملتی ہیں جو اس کا شاگرد تھا اور جو تمام زمانوں کے عظیم فلسفیوں میں شمار ہوتا ہے ۔ افلاطون نے فلسفے کے متعلق متعدد " مکالمات " یا ڈرامائی مباحث سپرد قلم کئے ۔ ان میں وہ سقراط کو اپنے بڑے (principal) کردار اور ترجمان کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

چونکہ افلاطون اپنا فلسفہ سقراط کے منہ میں ڈالتا رہتا ہے ، ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ مکالمات میں جو الفاظ ادا کرتا

ہے، وہ اس نے کبھی کہے بھی تھے یا نہیں ۔ چنانچہ سقراط کی تعلیمات اور افلاطون کے فلسفے کے مابین امتیاز کرنا آسان کام نہیں ۔ عین یہی مسئلہ بہت سی دیگر تاریخی شخصیات پر بھی منطبق ہوتا ہے جنھوں نے اپنی کوئی تحریر نہیں چھوڑی ۔ اس کی کلاسیک مثال یسوع کی ہے ۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ "تاریخی "یسوع نے بالکل وہی الفاظ کہے تھے جو متی یا لوقس نے ان سے منسوب کئے ہیں ۔ اسی طرح سقراط جو کچھ کہتا ہوگا، اس پر ہمیشہ اسرار کا پردہ پڑا رہے گا۔

لیکن یہ سوال کہ سقراط "حقیقتاً" کون تھا، نسبتاً غیر اہم ہے ۔ اصل چیز سقراط کا وہ خاکہ ہے جسے افلاطون نے رقم کیا تھا۔ اسی سے مغرب کے مفکرین گزشتہ اڑھائی ہزار سال سے وجدان حاصل کر رہے ہیں۔

گفتگو کا فن

سقراط کے فن کی اصل نوعیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ وہ لوگوں کو کسی قسم کی تعلیم نہیں دینا چاہتا، اس کے برعکس اس کی باتوں سے یہ تاثر ابھرتا تھا کہ جن اشخاص کے ساتھ وہ ہم کلام ہوتا ہے، وہ ان سے کچھ سیکھنے کا آرزومند ہے ۔ چنانچہ روایتی مدرس کی طرح درس دینے کی بجائے وہ بحث کرتا تھا۔

صاف ظاہر ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو محض دوسروں کی باتیں سننے تک محدود کرلیتا، وہ اتنا مشہور فلسفی نہ بن پاتا اور نہ اسے موت کی سزا ملتی ۔ لیکن وہ سوال: خاص طور پر گفتگو شروع کرنے کے لیے، کچھ اس انداز سے پوچھتا تھا جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہ ہو ۔ بحث کے دوران میں وہ عام طور پر کچھ اس طرح پینترا بدلتا کہ اس کے مخالفین کو ماننا پڑتا کہ ان کے اپنے دلائل کتنے بودے ہیں اور جب وہ ان کا ناطقہ بند کردیتا انہیں مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔

سقراط کی ماں دایہ تھی اور وہ کہا کرتا تھا کہ اس کا فن دایہ کا فن ہے ۔ دایہ خود بچے کو جنم نہیں دیتی لیکن وہ مدد کے لیے بوقت پیدائش موجود ہوتی ہے ۔ اسی طرح سقراط سمجھتا تھا کہ اس کا کام لوگوں کی مدد کرنا ہے تاکہ وہ صحیح بصیرت کو "جنم" دے سکیں کیونکہ بیج صحیح تفہیم لازماً اندر سے آنا چاہیے ۔ کوئی دوسرا شخص اسے آپ کے ذہن میں انڈیل نہیں سکتا ۔ اور صرف وہی بصیرت جو اندر سے پھوٹتی ہے 'سچی بصیرت کی طرف لے جاسکتی ہے ۔

میں اس بات کو ذرا مزید صراحت سے بیان کرتا ہوں ۔ جنم دینے کی صلاحیت فطری وصف ہے ۔ اسی طریقے سے ہر شخص فلسفیانہ صداقتوں کو سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی خلقی عقل کو استعمال کرے ۔ خلقی عقل کے استعمال سے مراد یہ ہے کہ آپ اپنے اندر جھانک کر دیکھیں اور جو کچھ وہاں ہے ' اسے استعمال کریں ۔

سقراط جن لوگوں سے ملتا تھا وہ بھلا بن کر انہیں اپنی عقل سلیم (کامن سنس) استعمال کرنے پر مجبور کردیتا تھا ۔ سقراط دکھاوے کے لیے لاعلمی کا لبادہ اوڑھ لیتا تھا ـــــ یا پھر وہ یوں بن جاتا تھا جیسے وہ جاہل مطلق ہو حالانکہ وہ جاہل بالکل نہیں تھا ۔ اسے سقراطی خطنز (Socratic irony) (3) کہتے ہیں ۔ اس کے اس انداز نے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ مسلسل لوگوں کی سوچ کی کمزوریاں طشت از بام کرتا رہا ۔ شہر کے چوک کے عین درمیان میں کھڑے ہوکر اسے یہ کام کرنا قطعاً ناپسند نہیں تھا ۔ اگر تمہاری سقراط سے ملاقات ہوسکتی تو عین ممکن ہے تم سر بازار لوگوں میں نکو بن جاتیں ۔

چنانچہ اگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ لوگ ' بالخصوص وہ لوگ جن کا معاشرے میں مقام تھا ' اس سے چڑنے لگے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہا کرتا تھا : "ایتھنز سہل انگار گھوڑے کی مانند ہے اور میں گھوڑ مکھی (4) ۔ میں ڈنک مار کر اسے مستعد کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں ۔"

(سوفی ! ہم گھوڑ مکھیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟)

الوہی آواز

سقراط اپنے ساتھی انسانوں کے اس لیے ڈنک نہیں مارتا تھا کیونکہ وہ انہیں ذہنی اذیت پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے اندر کوئی چیز تھی جس نے اس کے لیے اور کوئی راہ عمل چھوڑی ہی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا رہتا تھا کہ اس کے اندر کوئی "الوہی آواز" ہے۔ مثلاً سقراط احتجاج کرتا رہتا تھا کہ لوگوں کو سزائے موت دینے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ مزید برآں وہ اپنے سیاسی مخالفین کی مخبری کرنے یا ان کی چغلی کھانے سے انکار کر دیتا تھا۔ آخر کار اس کا یہی رویہ اسے لے ڈوبا اور اسے اس کا خمیازہ اپنی جان دے کر بھگتنا پڑا۔

سن 399 ق م میں اس پر الزام لگایا گیا کہ وہ "نئے خدا تراش رہا اور نوجوانوں کے اخلاق بگاڑ رہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ وہ تسلیم شدہ دیوتاؤں میں اعتقاد نہیں رکھتا۔ پانچ سو افراد پر مشتمل جیوری نے بالکل معمولی اکثریت سے اسے مجرم قرار دے دیا۔

قرین قیاس ہے کہ وہ نرم سزا کے لیے اپیل کر سکتا تھا۔ کم از کم وہ اپنی جان بچا سکتا تھا بشرطیکہ وہ ایتھنز چھوڑنے پر رضامند ہو جاتا۔ لیکن اگر اس نے یہ کام کیا ہوتا، پھر وہ سقراط نہ رہتا۔ وہ اپنے ضمیر ——— اور صداقت ——— کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ اس نے جیوری کو یقین دلایا کہ اس نے جو کچھ کیا، مملکت کے بہترین مفاد میں کیا۔ تاہم اسے زہر کا پیالہ پینے کی سزا دی گئی۔ اس کے چند روز بعد اس نے اپنے دوستوں کی موجودگی میں زہر پیا اور دائمی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

سوئی · کیوں؟ اگر سقراط کو موت کو گلے سے لگانے کی ضرورت کیا تھی؟ لوگ گزشتہ چوبیس سو سال سے یہ سوال پوچھ رہے ہیں۔ تاہم وہ تاریخ کا واحد شخص نہیں جس نے حالات کو نتیجہ انجام تک پہنچایا اور اپنے عقاید کی خاطر موت کو قبول کر لیا۔

میں یسوع کا پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں اور یہی بات یہ

ہے کہ اگرچہ ان کا تعلق مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں سے ہے، پھر بھی دونوں میں کافی مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔

سقراط اور یسوع دونوں اپنے معاصرین کے لیے بھی معما آسا شخصیتیں تھے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعلیمات کو قلمبند نہیں کیا چنانچہ ہمیں مجبوراً اس تصویر پر انحصار کرنا پڑتا ہے جو ان کے شاگردوں اور حواریوں نے دکھائی ہے۔ لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ دونوں کو گفتگو کے فن پر ید طولیٰ حاصل تھا۔ دونوں مخصوص خود اعتمادی کے ساتھ بات کرتے تھے جو سامعین کو لبھاتی اور انہیں اشتعال بھی دلاتی تھی۔ اور یہ بات بھی کم قابل ذکر نہیں کہ دونوں کو ایقان تھا کہ وہ کسی ایسی ہستی کی ترجمانی کر رہے ہیں جو خود ان سے کہیں بڑی ہے۔ چونکہ وہ نا انصافی اور بدعنوانی کی تمام شکلوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے تھے، یوں وہ معاشرے کی قوت کے لیے چیلنج بن گئے تھے۔ اور آخری بات یہ ہے ـــــ دونوں کو اپنی سرگرمیوں کا خمیازہ اپنی اپنی جان دے کر بھگتنا پڑا (6)۔

یسوع اور سقراط کے مقدمات میں بھی واضح مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔

دونوں رحم کی اپیل کرکے یقیناً اپنی جانیں بچا سکتے تھے، لیکن دونوں محسوس کرتے تھے کہ ان کے ذمے جو کام لگایا گیا ہے اگر وہ اس کے تلخ انجام تک اپنے ایمان کو برقرار نہ رکھ سکے، پھر وہ اس سے غداری کے مرتکب ہوں گے۔ انہوں نے دلیری سے موت قبول کرلی لیکن اپنی موت کے بعد بھی وہ بے شمار لوگوں کو اپنے معتقدین بنانے میں کامیاب رہے۔

میرا اس قسم کا کوئی عندیہ دینے کا ارادہ نہیں کہ سقراط اور مسیح ایک جیسے تھے۔ میں تو محض اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا ہوں کہ دونوں کے پاس پیغام تھا جو لاینفک طور پر ان کی ذاتی جرات سے منسلک ہے۔

ایتھنز کا جوکر

سوفی : ابھی ہم نے سقراط کی داستان ختم نہیں کی ۔ ہم اس کے طریق کار کا ذکر تو کر چکے ہیں ، لیکن اس کا فلسفیانہ پراجیکٹ کیا تھا؟

سوفی : ابھی ہم نے سقراط کی داستان ختم نہیں کی ۔ ہم اس کے طریق کار کا ذکر تو کر چکے ہیں ، لیکن اس کا فلسفیانہ پراجیکٹ کیا تھا؟

سقراط اسی عہد کا شخص تھا جس عہد میں سوفسطائی رہتے تھے ۔ ان کی طرح وہ بھی فطرت کی طاقتوں کے بجائے انسان اور معاشرے میں ان کے مقام کے بارے میں زیادہ سوچتا تھا ۔ جیسا کہ چند سو سال بعد ایک رومی فلسفی سسرو یا ککرو (Cicero) نے کہا تھا : "سقراط نے فلسفے کو آسمان سے نیچے بلایا ، شہروں میں اس کی دھاک بٹھائی ، گھروں میں متعارف کرایا اور اسے زندگی ، اخلاقیات ، نیکی اور بدی کی تفتیش کرنے پر مجبور کردیا۔"

لیکن سقراط سوفسطائیوں سے ایک اہم لحاظ سے مختلف تھا ۔ وہ اپنے آپ کو "سوفسطائی" —— یعنی دانا یا عالم فاضل شخص —— نہیں سمجھتا تھا ۔ سوفسطائیوں کے برعکس وہ روپے پیسے کے عوض تعلیم نہیں دیتا تھا ۔ نہیں ، وہ لفظ کے صحیح معنوں میں اپنے آپ کو فلسفی کہتا تھا ۔ فلسفی ("philo- sopher") کا درحقیقت مطلب وہ شخص ہوتا ہے جو "دانش و حکمت سے پیار کرتا ہے ۔"

سوفی ، تم آرام سے تو بیٹھی ہو ؟ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ تمہارے لیے سوفسطائی اور فلسفی کے مابین فرق پوری طرح سمجھنا نہایت ضروری ہے ۔ یہی وہ فرق ہے جو اس نصاب کے بقیہ حصے کا مرکزی نکتہ ہے ۔ سوفسطائی اپنی تشریحات میں موشگافیاں کرنے کے بڑے ماہر تھے اور اسی کام کے لوگوں سے پیسے وصول کرتے تھے ۔ اس قسم کے سوفسطائی قدیم ترین زمانے سے چلے آرہے ہیں ۔ میرا اشارہ ان تمام مدرسوں اور ان اشخاص کی طرف ہے جو اپنے خیالات میں بے لوچ ہوتے ہیں اور جو اپنی دانست میں سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں ، یا جو تھوڑا بہت

وہ جاتے ہیں اسی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں یا پھر ایسے موضوعات کے متعلق ، جن کی ان کو ہوا تک نہیں لگی ہوتی ، شیخی بگھارتے ہیں کہ وہ ان میں طاق ہیں ۔ تم بے شک نو عمر ہو لیکن اس نو عمری میں ہی تمہارا واسطہ بھی اس قسم کے چند ایک سوفسطائیوں سے ضرور پڑ چکا ہوگا ۔ سوفی ، سچا فلسفی بالکل مختلف قسم کی مخلوق ہوتا ہے ـــــ بلکہ وہ اصلاً ان (سوفسطائیوں) کے بالکل الٹ ہوتا ہے ۔ فلسفی جانتا ہے کہ وہ حقیقت میں بہت کم جانتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی پیہم کوشش ہوتی ہے کہ وہ بچی بصیرت تک رسائی حاصل کرے ۔ سقراط کا شمار انہی خال خال لوگوں میں ہوتا ہے ۔ وہ جانتا تھا کہ وہ زندگی اور دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ۔ اور اب اہم بات آتی ہے : اسے پریشانی اس بات کی رہتی تھی کہ وہ بہت کم جانتا ہے۔

چنانچہ فلسفی وہ شخص ہوتا ہے جو یہ تسلیم کرتا ہے کہ ایسی اشیا بے شمار ہیں جنہیں وہ بالکل نہیں جانتا اور یہی چیز اسے پریشانی میں مبتلا رکھتی ہے ۔ ان معنوں میں وہ پھر بھی ان تمام لوگوں سے زیادہ دانا ہوتا ہے جو ان چیزوں کے بارے میں اپنا علم بگھارتے رہتے ہیں جن کی ابجد کا بھی انہیں پتا نہیں ہوتا ۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ " عقل مند ترین وہ ہے جو جانتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا ۔ " خود سقراط نے کہا تھا : " میں صرف ایک بات جانتا ہوں اور وہ بات یہ ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

(سقراط کے) اس بیان کو یاد رکھو کیونکہ یہ وہ اعتراف ہے جو فلسفی بھی شاذ و نادر ہی کرتے ہیں ۔ مزید برآں اسے سرعام کہنا اتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کہ (بعض اوقات) آدمی کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے ہیں ۔ سب سے بڑے تخریب کار وہ ہوتے ہیں جو سوال پوچھتے ہیں ۔ جواب دینے میں تقریباً اتنے خطرات پنہاں نہیں ہوتے ۔ (کبھی کبھار) ایک سوال ایک ہزار جوابات سے زیادہ دھماکہ خیز ہوتا ہے۔

تمہیں شہنشاہ کے نئے کپڑوں کی کہانی یاد ہے ؟ شہنشاہ درحقیقت سر تا پا ننگا تھا لیکن اس کی رعایا کے کسی فرد میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ یہ بات اس کے منہ پر کہہ سکتا ۔ اچانک ایک

بچہ چلا اٹھا : "بادشاہ سلامت ننگے ہیں !" سوفی ' وہ بچہ بڑا دلیر ہوگا۔ سقراط کی طرح اس میں لوگوں کو بتانے کا حوصلہ تھا کہ ہم کتنا کم جانتے ہیں ۔ بچوں اور فلسفیوں کے مابین جو مشابہت پائی جاتی ہے ' ہم اس کا ذکر پہلے ہی کر چکے ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو متعدد مشکل سوالوں کا سامنا ہے جن کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ۔ چنانچہ ہمارے سامنے دو امکانی صورتیں ہیں : ہم یا تو یہ غلط دعویٰ کرکے کہ جو کچھ جاننے کی ضرورت ہے ' ہم وہ سب جانتے ہیں ' اپنے آپ کو اور باقی دنیا کو بے وقوف بناسکتے ہیں ۔ یا پھر ہم مرکزی مسائل پر ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ساری ترقی سے دست بردار ہوجائیں ۔ اگر بات کو اس انداز سے دیکھا جائے ' انسان دو طبقوں میں بٹے ہوئے نظر آئیں گے ۔ اگر عمومی انداز سے بات کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں کو یا تو اپنی بات کا پکا یقین ہوتا ہے یا پھر وہ بالکل تغافل شعار ہوتے ہیں ۔ (دونوں ہی طرح کے لوگ خرگوش کی پوستین کے اندر کہیں بہت دور گھسے ہوئے ہیں۔)

سوفی ' یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے تاش کی گڈی کو اس طرح دو ڈھیروں میں تقسیم کردیا جائے کہ سیاہ پتے ایک ڈھیر پر اور سرخ پتے دوسرے ڈھیر پر رکھ دئے جائیں ۔ لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایسا پتا نکل آتا ہے جو پان کا ہوتا ہے نہ اینٹ کا ' حکم کا ہوتا ہے نہ چڑیا کا ' اسے جوکر کہا جاتا ہے ۔ سقراط ایتھنز کا یہی جوکر تھا ۔ وہ نہ تو کوئی بات تیقن سے کہتا تھا اور نہ تغافل شعاری یا بے نیازی کا مظاہرہ کرتا تھا ۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا —— اور یہی بات اسے پریشانی میں مبتلا رکھتی تھی ۔ چنانچہ وہ فلسفی —— یا ایک ایسا شخص —— بن گیا جو کبھی ہمت نہیں ہارتا ' کبھی میدان سے نہیں بھاگتا بلکہ ان تھک انداز سے سچائی کی جستجو جاری رکھتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک ایتھنز والے نے ڈلفی کی غیبی آواز سے پوچھا تھا کہ ایتھنز کا عقلمند ترین انسان کون ہے ۔ غیبی آواز نے جواب دیا : "تمام انسانوں میں سقراط عقلمند ترین شخص ہے ۔"

جب سقراط تک یہ بات پہنچی ، نرم ترین الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہونقا رہ گیا ۔ (سوفی ، وہ لازماً کھلکھلا کر ہنس پڑا ہوگا!) وہ سیدھا شہر کے اس آدمی کے پاس پہنچا جس کے متعلق اس کی اور باقی تمام لوگوں کی رائے تھی کہ وہ بے انتہا عقل مند ہے ۔ لیکن جب یہ شخص سقراط کے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا ، سقراط کو احساس ہوگیا کہ غیبی آواز نے ٹھیک ہی کہا ہے ۔

سقراط محسوس کرتا تھا کہ ہمیں اپنے علم کے لیے ٹھوس بنیاد تعمیر کرنا چاہیے ۔ اس کا ایمان تھا کہ یہ بنیاد انسان کی عقل میں ہوتی ہے ۔ انسانی عقل میں اپنے اس محکم یقین کی بدولت وہ یقیناً عقلیت پسند تھا ۔

صحیح بصیرت صحیح عمل کی طرف لے جاتی ہے

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ سقراط کا دعویٰ تھا کہ کوئی الوہی داخلی آواز اس کی رہنمائی کرتی رہتی ہے اور یہ کہ اس کا یہ "ضمیر" اسے بتاتا رہتا ہے کہ صحیح کیا ہے ۔ "جو جانتا ہے کہ نیکی کیا ہے ، وہ نیک کام کرے گا ۔" وہ کہا کرتا تھا ۔

اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ صحیح بصیرت صحیح عمل کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور صرف وہی "پارسا شخص" کہلا سکتا ہے جو صحیح کام کرتا ہے ۔ جب ہم غلط کام کرتے ہیں ، تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے ذہن میں اس سے بہتر کا تصور نہیں ہوتا ۔ یہی وجہ ہے کہ سیکھتے رہنا اتنا ضروری ہے ۔ سقراط کا معاملہ یہ تھا کہ وہ غلط اور صحیح کی ایسی تعریفوں (definitions) کی جستجو کرتا رہتا تھا جو آفاقی طور پر صحیح تسلیم کی جاسکیں ۔ سوفسطائیوں کے برعکس اس کا ایمان تھا کہ صحیح اور غلط کے مابین تمیز کرنے کی صلاحیت لوگوں کی عقل میں ہوتی ہے ، معاشرے میں نہیں ۔

سوفی ، تم شاید یہ سوچو کہ یہ آخری حصہ کچھ زیادہ ہی مبہم ہے ۔ چنانچہ میں اسے اس طرح پیش کرتا ہوں : سقراط کا خیال تھا

کہ جو شخص اچھا تو سمجھتا ایک چیز کو ہے لیکن عمل اس کے برعکس کرتا ہے، وہ امکانی طور پر خوش نہیں رہ سکتا۔ اور جو شخص جانتا ہے کہ خوشی کیسے حاصل کی جاتی ہے، وہ اسے حاصل کرے گا۔ چنانچہ جو جانتا ہے کہ صحیح کیا ہے، وہ صحیح کام کرے گا۔ کیونکہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ ناخوش رہنے کو ترجیح دے؟

سوفی تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر تم مسلسل ایسے کام کرتی رہو جن کے متعلق تم اپنے باطن کی گہرائیوں میں جانتی ہو کہ وہ غلط ہیں، کیا پھر تم خوش رہ سکو گی؟ ایسے بے شمار لوگ ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے دیتے ہیں اور دوسروں کی برائیاں کرتے ہیں۔ کیا وہ آگاہ ہیں کہ ان کی یہ حرکتیں صحیح نہیں؟ —— اگر تم چاہو تو خلاف انصاف بھی کہہ سکتی ہو۔ تمہارا خیال ہے یہ لوگ خوش ہیں؟

سقراط کے خیال میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

جب سوفی خط پڑھ چکی، اس نے جلدی سے اسے بسکٹوں کے ڈبے میں رکھ دیا اور خود رینگتی رینگتی باغ میں چلی گئی۔ وہ اپنی ماں کے، جو بازار سے سودا سلف لینے گئی تھی، لوٹنے سے پہلے گھر کے اندر پہنچ جانا چاہتی تھی تاکہ وہ اس قسم کے سوالوں سے کہ وہ کہاں تھی، بچ سکے۔ اور پھر اس نے برتن دھونے کا وعدہ بھی تو کر رکھا تھا۔

اس نے سنک میں پانی بھرا ہی تھا کہ اس کی ماں دو بڑے بڑے شاپنگ بیگ اٹھائے لڑکھڑاتی اندر داخل ہوئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی ماں نے چھوٹتے ہی کہا:

"تم آج کل کچھ کچھ اپنے خیالوں میں کھوئی رہتی ہو۔"

سوفی سمجھ نہ سکی کہ اس نے یہ بات کیسے کہہ دی، بس اس کے منہ سے نکل گیا:

"سقراط کا بھی یہی حال تھا۔"

"سقراط؟" اس کی ماں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

سوفی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے کہ اسے اس کے نتیجے میں موت قبول کرنا پڑی۔"

"اف خدایا! سمجھ میں نہیں آرہا میں کیا کروں!"

"سقراط بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اس

کے باوجود وہ ایتھنز کا ہوشیار ترین شخص تھا۔"

اس کی ماں کی زبان گنگ ہو گئی۔

بالآخر اس نے کہا: "تم نے یہ سب کچھ سکول میں سیکھا ہے؟"

سوفی نے بڑے زور سے انکار میں سر ہلا دیا۔

"وہاں ہم کچھ بھی نہیں سیکھتے۔ سکولوں کے استادوں اور فلسفیوں کے مابین فرق یہ ہے کہ اساتذہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں اور وہ یہ سب کچھ ہمارے دماغوں میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فلسفی کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ مل کر معاملے کا حل ڈھونڈے۔"

"تو سفید خرگوشوں کا قصہ پھر شروع ہو گیا! تم کچھ جانتی ہو؟ میں جاننا چاہتی ہوں کہ تمہارا بوائے فرینڈ دراصل کون ہے۔ ورنہ میں سمجھوں گی کہ اس شخص کی ذہنی حالت درست نہیں۔"

سوفی نے اپنی پشت برتنوں کی طرف کر لی اور برتن پونچھنے کا کپڑا اپنی ماں کی طرف لہرانے لگی۔

"ذہنی حالت اس کی خراب نہیں۔ لیکن اسے دوسروں کے ذہنوں کو جھنجھوڑنا ضرور پسند ہے ـــــ تاکہ وہ اپنے گھسے پٹے انداز فکر سے باہر نکل سکیں۔"

"بس بس، اتنا ہی کافی ہے! میرے خیال میں وہ کچھ کچھ گستاخ بھی معلوم ہوتا ہے۔"

سوفی دوبارہ برتن صاف کرنے لگی۔

وہ گستاخ ہے نہ ناگستاخ۔" سوفی نے کہا۔ "وہ صرف صحیح دانش تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تاش کے اصلی جوکر اور دوسرے پتوں کے مابین یہی بڑا فرق ہے۔"

"کیا کہا، جوکر؟"

سوفی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ "کیا آپ نے کبھی اس حقیقت کے بارے میں کہ تاش کی گڈی میں پان اور اینٹ، حکم اور چڑیا کے پتے تو بہت ہوتے ہیں لیکن جوکر صرف ایک ہوتا ہے۔"

"اف خدایا! سوفی، یہ تم کس طرح تڑ تڑ جواب دے رہی ہو!"

"اور آپ کیسے پوچھ رہی ہیں!"

اس کی ماں آٹے، چینی، خوراک کے بند ڈبے اور اس قسم کی دوسری اشیا، جو

وہ خرید کر لائی تھی ، سنبھال کر رکھ چکی تھی ۔ اب اس نے اخبار اٹھایا اورنشستی کمرے میں چلی گئی ۔سوفی کا خیال تھا کہ وہ دروازہ معمول سے زیادہ دھماکے سے بند کرکے گئی ہے ۔

سوفی نے برتن دھوئے اور اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ اس نے سرخ ریشمی رومال لیگو کی گوٹوں کے ساتھ اپنی الماری کے اوپر کے خانے میں رکھ دیا تھا ۔ اس نے اسے باہر نکالا اور بڑے انہماک سے اس کا جائزہ لینے لگی ۔

ہلڈے . . .

8۔ ایتھنز

* * *

... کھنڈرات سے متعدد بلند و بالا عمارتیں ابھرنے لگیں ...

اس روز شام ہونے ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ سوفی کی امی اپنی کسی دوست سے ملنے چلی گئی ۔جونہی وہ گھر سے باہر نکلی ' سوفی باغ میں سے گزرتی اپنے خفیہ ٹھکانے پہنچ گئی ۔ وہاں اسے بسکٹوں کے ڈبے کے قریب خاصا بڑا پارسل پڑا ملا۔سوفی نے کاغذ پھاڑا ۔ اندر سے ایک وڈیو کیسٹ نکلی ۔

وہ بھاگتی دوڑتی واپس مکان میں چلی گئی ۔ وڈیو ٹیپ ! آخر فلسفی کو کیسے معلوم ہوا کہ ان کے گھر میں وی سی آر ہے ۔ اور اس کیسٹ میں آخر ہے کیا؟

سوفی نے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں ڈالی ۔ ایک کشادہ اور وسعت پذیر شہر ٹی وی کی سکرین پر نمودار ہوا ۔ جب کیمرے کی آنکھ ایکروپولس (Acropolis) پر مرکوز ہوئی ' سوفی سمجھ گئی کہ یہ شہر لازماً ایتھنز ہوگا ۔ اس نے وہاں کے کھنڈرات کی تصاویر اکثر دیکھی تھیں ۔

ٹی وی پر جو اولین تصاویر نمودار ہوئیں ' وہ موقع پر لی گئی تھیں ' سٹوڈیو میں نہیں بنائی گئی تھیں ۔ گرمیوں کے ملبوسات پہنے اور کندھوں پر کیمرے لٹکائے سیاح ہجوم در ہجوم کھنڈرات میں گھوم رہے تھے ۔ ان میں سے ایک کچھ یوں نظر آرہا تھا جیسے اس نے واقعی کوئی نوٹس بورڈ اٹھا رکھا ہو ۔ ایک بار پھر اس کی شکل دکھائی دی ۔ کیا اس نے "ہلڈے" نہیں کہا تھا؟

ایک دو منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر شخص کی تصویر نمودار ہوئی - یہ تصویر بالکل قریب سے لی گئی تھی اور اس میں اس کی شکل بالکل واضح دکھائی دے رہی تھی - اس کا قد قدرے چھوٹا ' داڑھی سیاہ اور اچھی طرح ترشی ہوئی تھی - اور اس نے اپنے سر پر نیلے رنگ کے کپڑے کی ٹوپی پہن رکھی تھی - وہ کیمرے میں جھانک رہا اور کہہ رہا تھا: "سوفی ' میں تمہیں ایتھنز خوش آمدید کہتا ہوں - جیسا کہ تم نے شاید اندازہ لگا لیا ہوگا میں البرٹو کنوکس ہوں - اگر نہیں ' تو میں صرف اتنا ہی دہراؤں گا کہ کائنات کے ٹاپ ہیٹ سے بڑا ہیٹ ابھی تک باہر کھینچا جارہا ہے -

"ہم ایکروپولس پر کھڑے ہیں - اس لفظ کا مفہوم ' قلعہ ' یا ' بالا حصار ' ــــــ یا صحیح تر ' پہاڑی پر شہر ' ہے - یہاں لوگ پتھر کے زمانے سے آباد چلے آرہے ہیں - فطری طور پر اس کی وجہ اس کا عدیم النظیر محل وقوع ہے - لوٹ مار کی غرض سے آنے والے حملہ آوروں کے خلاف بلند سطح مرتفع کا دفاع کرنا نسبتاً آسان تھا - ایکروپولس سے نیچے بحیرہ روم کی ایک بہترین بندرگاہ کا منظر بھی بخوبی دکھائی دیتا تھا - جب سطح مرتفع سے نیچے میدانی علاقے میں ایتھنز بڑھنے ' پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے لگا ' ایکروپولس کو بطور قلعے اور مقدس درگاہ استعمال کیا جانے لگا . . . پانچویں صدی قبل مسیح کے پہلے نصف میں اہل فارس کے ساتھ خون ریز معرکہ آرائی ہوئی اور 480 قبل مسیح میں فارسی بادشاہ اردشیر نے ایتھنز کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ایکروپولس کی تمام چوبی عمارات جلا کر راکھ کردیں - ایک سال بعد اہل فارس کو شکست ہوئی (1) اور یہیں سے ایتھنز کے سنہری دور کا آغاز ہوا - ایکروپولس کو دوبارہ تعمیر کیا گیا ــــ اور یہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ رفیع الشان اور پر وقار تھا اور اب یہ خالصتاً مقدس درگاہ تھا -

"یہی وہ زمانہ تھا جب سقراط شہر کے گلی کوچوں اور چوراہوں پر لوگوں کے ساتھ باتیں کرتا اور گھومتا پھرتا رہتا تھا - یوں اس نے ایکروپولس کے ظہور نو اور ہمیں اپنے گردوپیش جو عمارتیں نظر آرہی ہیں ' ان کو تعمیر کے مراحل طے کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا - اور تعمیر کے لیے یہ مقام تھا بھی کتنا موزوں ! میرے عقب میں تم سب سے بڑے معبد پارتھے نان (Parthenon) کو دیکھ سکتی ہو - اس کا مطلب ' کنواری کا مستقر ' ہے اور یہ ایتھنز کی مربی دیوی ایتھینے (Athene) کے اعزاز میں تعمیر کیا گیا تھا - وسیع و عریض سنگ مرمر کی اس عمارت کی کوئی دیوار سیدھی نہیں - چاروں پہلو قدرے خم دار ہیں تاکہ عمارت نسبتاً کم جسیم نظر آئے - اس کے باوجود کہ عمارت

بے حد طویل و عریض اور اونچی ہے ' دیکھنے میں یہ بھاری بھرکم نہیں بلکہ ہلکی پھلکی معلوم ہوتی ہے ۔ دوسرے الفاظ میں یہ بصری التباس (optical illusion) پیش کرتی ہے ۔ ستون قدرے اندر کی طرف خمیدہ ہیں اور اگر انہیں معبد کے اوپر بتدریج پتلا کرتے کرتے بالکل سیدھا کھڑا کردیا جاتا تو پندرہ سو میٹر اونچا ہرم بن جاتا ۔ معبد میں ایتھینے کے بارہ میٹر بلند مجسمے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی ۔ سفید سنگ مرمر (2) ' جس پر اس زمانے میں شوخ رنگوں سے پینٹ کردیا جاتا تھا ' سولہ سو کلومیٹر دور ایک پہاڑی مقام سے لایا گیا تھا ۔"

سوفی دم سادھے بیٹھی رہی ۔ کیا یہ واقعی فلسفی ہے جو اس سے باتیں کر رہا ہے ؟ اس نے صرف ایک مرتبہ تاریکی میں اس کی یک رخی دھندلی شکل دیکھی تھی ۔ کیا یہ وہی شخص ہوسکتا ہے جو اب ایتھنز کے ایکروپولس میں کھڑا ہے ؟

وہ معبد میں لمبائی کے رخ چل رہا تھا اور کیمرا اس کا تعاقب کر رہا تھا ۔ وہ سیدھا شہ نشین (terrace) کے آخری سرے تک پہنچ گیا اور زمینی منظر کی طرف انگلی لہرانے لگا ۔ کیمرا ایک قدیم تھیئٹر پر مرکوز ہوگیا جو ایکروپولس کی سطح مرتفع کے عین نیچے واقع تھا ۔

"یہاں تم قدیم دیونوسوس (Dionysos) تھیئٹر دیکھ سکتی ہو ۔" ٹوپی پوش شخص نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ "یہ غالباً یورپ کا قدیم ترین تھیئٹر ہے ۔ یہیں سقراط کے عہد میں ایسخائی لوس (Aeschyylus) ' سوفوکلیس (Sophocles) اور یورپیدیس (Euripides) کے عظیم المیہ ڈرامے سٹیج پر پیش کئے جاتے تھے ۔ میں بدقسمت شاہ اوئی دی پوس (Oedipus) کا پہلے ہی اشارتاً ذکر کرچکا ہوں ۔ اس کے متعلق سوفوکلیس کا ڈرامہ یہیں دکھایا گیا تھا ۔ لیکن یہاں صرف المیہ ڈرامے ہی نہیں ' طربیہ ڈرامے بھی پیش کئے جاتے تھے ۔ طربیہ ڈراموں کا مشہور ترین مصنف ارستو فانیس ہے ۔ اس نے سقراط کے متعلق بھی کینہ توز کامیڈی لکھی تھی جس میں اسے ایتھنز کا مسخرا (buffoon) بنا کر پیش کیا گیا تھا (3) ۔ بالکل عقب میں تم پتھر کی دیوار دیکھ سکتی ہو جسے اداکار بطور بیک ڈراپ (backdrop) استعمال کرتے تھے (یعنی تاریخی مناظر پیش کرنے کے لیے اس پر تصاویر بنایا کرتے تھے) ۔ اسے سکینے (skene) کہا جاتا تھا ۔ یورپی زبانوں کا) لفظ سین (scene) اسی سے مشتق ہے ۔ ضمناً یہ بھی بتاتا چلوں کہ لفظ تھیئٹر (Theatre) ایک قدیم یونانی لفظ (4) سے ' جس کے معنی ' دیکھنا ' ہیں ' نکلا ہے ۔

لیکن، سوفی، ہمیں دوبارہ فلسفیوں کی طرف پلٹنا ہے۔ ہم گیٹ وے میں سے پار تھے نان کا چکر لگا رہے اور پھر نیچے جا رہے ہیں۔۔۔"

کوتاہ قامت فلسفی نے وسیع و عریض معبدوں کے گرد چکر لگایا اور اپنی دائیں جانب چند چھوٹے معبدوں کے قریب سے گزرا۔ پھر وہ متعدد بلند و بالا ستونوں کے مابین چند سیڑھیاں نیچے اترا۔ جب وہ ایکروپولس کے نشیب میں پہنچا، ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ گیا اور ایتھنز کی طرف انگلی لہرانے لگا۔ "جس پہاڑی پر ہم کھڑے ہیں، اسے اریوپگس کہتے ہیں۔ یہاں قتل کے مقدمات کی سماعت کرنے کے لیے ایتھنز کی عدالت عالیہ کا اجلاس ہوا کرتا تھا۔ کئی سو سال بعد سینٹ پال یہاں پہنچا اور وہ اسی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اہل ایتھنز کے سامنے یسوع اور عیسائیت کے متعلق تقریریں کیا کرتا تھا۔ وہ کیا کہتا تھا، اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ بائیں طرف ایتھنز کے قدیمی چوک کی بچی کھچی نشانیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہیفائستوس (Hephaestos) ___ لوہاروں اور دھات کی اشیا بنانے والوں کا دیوتا ___ کے بڑے معبد کے ماسوا سنگ مرمر کی صرف چند اینٹیں باقی رہ گئی ہیں۔ آؤ، نیچے چلتے ہیں۔۔۔"

اگلے لمحے وہ قدیم کھنڈرات کے بیچ نظر آیا۔ آسمان کے نیچے ___ سوفی کی سکرین کے اوپر کے حصے پر ___ ایکروپولس پر ایتھینے کا رفیع الشان بلند و بالا معبد کھڑا تھا۔ سوفی کا فلسفے کا استاد سنگ مرمر کی اینٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ کیمرے کی طرف دیکھ رہا اور کہہ رہا تھا: "ہم اگورا (5) میں بیٹھے ہیں۔ بڑا افسوس ناک منظر ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟ لیکن کسی زمانے میں یہ چوک شاندار معبدوں، عدالت ہائے انصاف اور دوسرے سرکاری اداروں کی عمارتوں، دکانوں، موسیقی کے ہال، بلکہ وسیع و عریض جمنازیم میں بھی گھرا ہوا تھا۔ یہ تمام عمارتیں چوک کے ارد گرد واقع تھیں اور چوک خاصے بڑے خالی رقبے پر مشتمل تھا۔۔۔ ساری مغربی تہذیب کی بنیاد اسی مقام پر، جس میں کوئی خاص چونکا دینے والی بات نہیں تھی، رکھی گئی تھی۔

"سیاست (politics) اور جمہوریت (democracy)، معیشت (economy) اور تاریخ (history)، حیاتیات (biology) اور فزکس، ریاضی (mathematics) اور منطق (logic)، دینیات (theology) اور فلسفہ (philosophy)، اخلاقیات (ethics) اور نفسیات (psychology)، نظریہ (theory) اور طریق کار (method)، تصور (idea) اور نظریہ (theory) جیسے الفاظ اسی قلیل التعداد آبادی کی دین ہیں جس کی روزمرہ کی زندگی

اس چوک کے گرد گھومتی تھی ۔یہی وہ جگہ ہے جہاں سقراط ان لوگوں کے ساتھ ' جن سے اس کی ملاقات ہوتی تھی ' باتیں کرنے میں اپنا وقت صرف کرتا تھا ۔شاید وہ کسی غلام کو ' جو زیتون کے تیل کی کپی اٹھانے جارہا ہوگا 'روک لیتا ہوگا اور شامت کے مارے شخص سے فلسفے کا کوئی سوال پوچھنے لگتا ہوگا کیونکہ سقراط کی رائے میں غلام اسی عقل سلیم کا مالک ہوتا ہے جو کسی اونچے طبقے کے شخص میں ہوتی ہے ۔ اس کی شاید کسی جوشیلے شہری سے جھڑپ بھی ہوجاتی ہوگی ـــــ یا پھر وہ اپنے شاگرد افلاطون کے ساتھ دھیمے لہجے میں باتیں کرتا پھرتا ہوگا ۔ ان چیزوں کے متعلق سوچنا کتنا غیر معمولی معلوم ہوتا ہے ! ہم آج بھی سقراطی یا افلاطونی فلسفے کی باتیں کرتے ہیں لیکن افلاطون یا سقراط ہونا بالکل مختلف بات ہے ۔"

سوفی کا واقعی یہی خیال تھا کہ ان کے متعلق سوچنا غیر معمولی بات ہے ۔لیکن اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اس کا فلسفے کا استاد اچانک جس انداز سے ویڈیو پر ' جو کسی پراسرار کتے نے اس کے خفیہ ٹھکانے پہنچایا تھا ' اس سے مخاطب ہوگیا ہے ' وہ بھی غیر معمولی بات ہے ۔

فلسفی سنگ مرمر کی جس اینٹ پر بیٹھا ہوا تھا ' وہ اس سے اٹھا اور دھیمے لہجے سے کہنے لگا : "سوفی ' دراصل میرا ارادہ یہیں بات ختم کرنے کا تھا ۔میں تمہیں ایکروپولس اور اگورا کے بچے کھچے آثار دکھانا چاہتا تھا ۔لیکن مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم پوری طرح سمجھ گئی ہوگی کہ کسی زمانے میں یہ ماحول کتنا پرشکوہ تھا . . . چنانچہ مجھے یہ ترغیب مل رہی ہے کہ میں چندے مزید وضاحت کردوں ۔ یہ بات ہے تو خلاف قاعدہ . . . تاہم مجھے یقین ہے کہ میں تم پر اعتماد کرسکتا ہوں کہ یہ بات ہم دونوں کے بیچ ہی رہے گی ۔خیر ' مختصر سی جھلک سے ہی بہرحال کام چل جائے گا . . ."

اس نے مزید کچھ نہ کہا بلکہ کافی دیر تک وہیں کھڑا کیمرے کی آنکھ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا ۔جب وہ وہاں کھڑا تھا ' متعدد بلند عمارتیں سکرین پر نمودار ہونے لگیں ۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جادو کے زور سے پرانی عمارتیں ایک بار پھر ایستادہ ہوگئی ہوں ۔سوفی کو خط افق پر ابھی تک ایکروپولس نظر آرہا تھا لیکن اب وہ اور نیچے چوک کی تمام عمارتیں دونوں بالکل نئی نویلی تھیں ۔ ان پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا اور آنکھوں میں چبھنے والے بھڑکیلے رنگ پینٹ کئے ہوئے تھے ۔شوخ اور زرق برق لباس پہنے لوگ چوک میں ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے ۔ بعضوں نے تلواریں لٹکا رکھی تھیں

اور بعضوں نے سروں پر کپّے رکھے ہوئے تھے - ان میں سے ایک نے مخطوطے کا طومار (roll of papyrus) اپنی بغل میں دبا رکھا تھا -

سوفی نے اپنے فلسفے کے استاد کو پہچان لیا - اس نے ابھی تک اپنے سر پر گول اونی ٹوپی پہن رکھی تھی لیکن اب اس کے جسم پر وہی بسنتی چوغہ تھا جس میں باقی لوگ ملبوس تھے - وہ سوفی کی طرف بڑھا' اس نے کیمرے کی آنکھ میں جھانکا اور بولا :

" یہ زیادہ بہتر ہے ! سوفی ' اب ہم عہد قدیم کے ایتھنز میں پہنچ گئے ہیں - تم سمجھ گئی ہو گی کہ میری خواہش تھی کہ تم خود یہاں موجود ہوتیں - اس وقت ہم سال 402 ق م میں ہیں ' یعنی سقراط کے انتقال کرنے سے صرف تین برس پہلے کے زمانے میں - مجھے امید ہے کہ صرف تم اکیلی کو جو اس عہد میں داخل ہونے کا موقعہ ملا ہے ' تم اس کی قدر کرو گی کیونکہ وڈیو کیمرا بڑی مشکلوں سے کرائے پر ملا ہے . . . "

سوفی کا سر چکرانے لگا - " کیا نرالا آدمی ہے ؟ یہ 2400 سال پہلے کے زمانے میں کیسے پہنچ گیا ؟ وہ بالکل ہی مختلف عہد کی وڈیو فلم کیسے دیکھ سکتی ہے ؟ زمانہ قدیم میں وڈیو کہاں ہوتے تھے . . . کیا یہ کوئی متحرک فلم ہے ؟

" لیکن سنگ مرمر کی تمام عمارتیں حقیقی معلوم ہوتی ہیں - اگر انہوں نے ایتھنز کے چوک اور ایکروپولس کو دوبارہ بنایا ہے تو اس پر پانی کی طرح روپیہ بہایا ہو گا - محض سوفی کو تعلیم دینے کے لیے بے حساب رقم خرچ ہوئی ہو گی !"

اونی ٹوپی والے شخص نے آنکھ اٹھا کر دوبارہ سوفی کی طرف دیکھا -

" تم ستونوں کی قطار کے نیچے ان دو اشخاص کو دیکھ رہی ہو ؟ "

سوفی کو ایک بزرگ شخص ، جس نے مڑا تڑا چوغہ پہن رکھا تھا ' نظر آیا - اس کی لمبی ' ژولیدہ اور ناتراشیدہ داڑھی تھی - اس کی ناک چھوٹی اور اوپر کو اٹھی ہوئی تھی - اس کی آنکھیں کچھ ایسی تھیں جیسے دیکھنے والے شخص کے جسم میں برمے کی طرح چھید کردیں گی اور اس کے گال قدرے پھولے پھولے تھے - اس کے قریب کوئی خوش اندام اور خوب رو نوجوان شخص کھڑا تھا -

" یہ سقراط ہیں اور یہ ان کے نوجوان شاگرد افلاطون ہیں - تمہاری ان سے بالمشافہ ملاقات ہو گی - "

فلسفی ان دونوں اشخاص کے قریب گیا ' اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور ان سے کچھ کہا جو سوفی کی سمجھ میں نہ آیا - یہ ضرور یونانی زبان ہو گی - پھر اس نے کیمرے کی

طرف دیکھا اور بولا : "میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم ناروی لڑکی ہو اور ان سے ملنے کی بہت متمنی ۔ چنانچہ افلاطون تمہیں غور و فکر کے لیے چند سوال دیں گے ۔ لیکن ہمیں ذرا عجلت سے کام لینا ہو گا۔ کہیں محافظوں کی نظر پڑ گئی، پھر کام خراب ہو جائے گا۔"

جب نوجوان آگے بڑھا اور کیمرے کی طرف دیکھنے لگا، سوفی کو کچھ یوں محسوس ہوا جیسے اس کا کلیجا بلیوں اچھلنے لگا ہو۔

"سوفی، ہم ایتھنز میں تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں ۔ "اس نے نرم و لطیف لہجے سے کہا ۔ اس کے انداز سے مترشح ہو رہا تھا جیسے اس کا تعلق کسی خاص گروہ یا خاص علاقے سے ہو ۔ "میرا نام افلاطون ہے ۔ میں تمہیں چار سوال دے رہا ہوں ۔ پہلا سوال یہ ہے : ایک بیکر (baker) پچاس بسکٹ بناتا ہے اور وہ پچاسوں کے پچاس بالکل ایک جیسے ہیں ۔ خوب سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ اس نے یہ کام کیسے کیا ۔ دوسرا سوال یہ ہے : تمام گھوڑے ایک جیسے کیوں ہوتے ہیں ؟ تیسرا سوال یہ ہے : کیا انسان میں غیر فانی روح ہوتی ہے ؟ اور آخری سوال یہ ہے : کیا مرد اور عورتیں مساوی طور پر سمجھ دار اور عقل مند ہوتے ہیں ؟ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں !"

اس کے بعد ٹی وی پر تصویر غائب ہو گئی ۔ سوفی نے بار بار ٹیپ آگے پیچھے گھمائی لیکن وہ جو کچھ وہاں دیکھ چکی تھی، اس کے علاوہ وہاں اور کچھ نہیں تھا۔

سوفی نے کسی الجھاؤ کے بغیر سوچنے کی کوشش کی لیکن جونہی وہ ایک بات سوچتی، اس کے مکمل ہونے سے پہلے اس کے ذہن میں کوئی اور خیال گھومنے لگتا۔

اتنا تو اسے شروع سے ہی معلوم تھا کہ اس کا فلسفے کا استاد کچھ نرالی طبیعت کا مالک انسان ہے ۔ لیکن جب اس نے تدریس کے وہ طریقے استعمال کرنا شروع کر دیے جو فطرت کے تمام قوانین کا منہ چڑا رہے تھے، اسے محسوس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی آگے نکل گیا ہے ۔

کیا وہ واقعی سقراط اور افلاطون کو ٹی وی سکرین پر دیکھ چکی ہے ؟ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ ناممکن ! لیکن اس نے ٹی وی سکرین پر جو کچھ دیکھا، وہ کارٹون فلم بھی نہیں تھی ۔

سوفی نے وڈیو ریکارڈر سے کیسٹ نکال لی اور اسے پکڑ کر اپنے کمرے میں بھاگ گئی ۔ اس نے اسے اپنی الماری کے اوپر کے خانے میں لیگو (lego) کی گونوں

کے پاس رکھ دیا ۔ پھر وہ بے اختیار پلنگ پر گر پڑی ۔ وہ بہت تھک چکی تھی اور اسے لیٹتے ہی نیند آگئی ۔

چند گھنٹے بعد اس کی امی کمرے میں آئی ۔ اس نے سوفی کو جھنجھوڑا اور پوچھا :

"سوفی ، کیابات ہے ؟"

"ممم"

"تم اپنے سارے کپڑے پہنے سو رہی ہو !"

سوفی نے نیند کے عالم میں اپنی آنکھیں جھپکائیں ۔

"میں ایتھنز چلی گئی تھی !" وہ بڑبڑائی ۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی ۔ اس نے کروٹ بدلی اور دوبارہ سو گئی ۔

9 _ افلاطون

* * *

. . . روح کی مملکت میں واپس جانے کی آرزو . . .

اگلے روز سوفی کی صبح سویرے ہی آنکھ کھل گئی ۔ وہ قدرے ہڑبڑا گئی ۔ اس نے کلاک پر نظر ڈالی ۔ وقت پانچ سے کچھ ہی اوپر تھا لیکن وہ پوری طرح بیدار ہو چکی تھی اور وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی ۔ وہ اپنے پورے کپڑے کیوں پہنے ہوئے ہے ؟ پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا ۔

وہ سٹول پر چڑھ گئی اور اس نے الماری کے اوپر کے خانے کے اندر دیکھا ۔ ہاں ـــ وہاں عقبی حصے میں ویڈیو کیسٹ پڑی تھی ۔ تو یہ خواب نہیں تھا ؛ بالکل نہیں ۔ کم از کم سارے کا سارا نہیں ۔

لیکن سقراط اور افلاطون سے اس کی حقیقتاً ملاقات نہیں ہوئی ہو گی . . . خیر ، فکر نہیں ! اس میں اس کے متعلق مزید سوچنے کی ہمت نہیں رہی تھی ۔ شاید اس کی امی ٹھیک ہی کہتی تھی ، شاید آج کل اس کی عقل ٹھکانے نہیں رہی تھی ۔

بہرحال اب اسے دوبارہ نیند نہیں آسکتی تھی ۔ شاید اسے نیچے اپنے خفیہ ٹھکانے جانا اور دیکھنا چاہیے کہ کتا کوئی اور خط تو نہیں چھوڑ گیا ۔ وہ دبے پاؤں زینے سے نیچے اتری ، اس نے جوگنگ شو (jogging shoes) پہنے اور باہر نکل گئی ۔

باغ میں حیرت انگیز طور پر ہر چیز ساکن اور صاف دکھائی دے رہی تھی ۔ پرندے اتنے زور زور سے چہچہا رہے تھے کہ سوفی کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا ۔

گھاس پر صبح کی شبنم بلوری بوندوں کی مانند چمک رہی تھی ۔ ایک بار وہ پھر دنیا کے ناقابل بیان عجائب دیکھ کر دنگ رہ گئی ۔

پرانی باڑ کے اندر بھی ابھی خاصی نمی تھی ۔ سوفی کو فلسفی کا کوئی نیا خط نظر نہ آیا۔ تاہم اس نے ایک ابھی خاصی موٹی جڑ کو جھاڑا پونچھا اور اس کے اوپر بیٹھ گئی ۔

اسے یاد آیا کہ وڈیو کیسٹ کے افلاطون نے اسے حل کرنے کے لیے چند سوال دئے تھے ۔ پہلا سوال یہ تھا کہ کوئی بیکر بالکل ایک جیسے پچاس بسکٹ کیسے بنا سکتا ہے ۔

سوفی کو اس کے متعلق بہت احتیاط سے سوچنا پڑا کیونکہ صاف ظاہر تھا کہ جواب اتنا آسان نہیں ہوگا ۔ جب اس کی امی کبھی کبھار بسکٹ بناتی تھی وہ سب کے سب بالکل ایک جیسے نہیں ہوتے تھے ۔ لیکن وہ پیسٹریاں اور بسکٹ بنانے کی اتنی ماہر بھی تو نہیں تھی ۔ بعض اوقات تو باورچی خانے میں کچھ اس قسم کا سماں دکھائی دیتا تھا جیسے وہاں کسی نے بم دے مارا ہو ۔ لیکن بیکر کی دکان سے وہ جو بسکٹ خریدا کرتی تھیں وہ بھی تو کبھی ہو بہو ایک جیسے نہیں ہوتے تھے ۔ ہر بسکٹ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے بیکر نے اس کی دوسروں سے علیحدہ شکل بنائی ہو ۔

تب سوفی کے چہرے پر اطمینان بخش مسکراہٹ بکھر گئی ۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ جس روز اس کی امی کرسمس کے بسکٹ بنانے میں مصروف تھی ' وہ اور اس کا ابا شاپنگ کرنے بازار چلے گئے تھے ۔ جب وہ واپس آئے 'باورچی خانے کی میز پر آدمیوں کی شکل کے بسکٹوں (۱) کا ' جن میں ادرک کی آمیزش کی گئی تھی ' ڈھیر لگا ہوا تھا ۔ اگرچہ وہ سارے کے سارے بے عیب تو نہیں تھے ' ایک لحاظ سے وہ سبھی ایک جیسے تھے ۔ اس کی وجہ کیا تھی ؟ صاف ظاہر ہے کہ اس کی امی نے انہیں بنانے کے لیے ایک ہی سانچہ استعمال کیا تھا ۔

وہ یہ واقعہ یاد کرنے پر اتنا خوش ہوئی کہ اس نے اپنے متعلق یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ اس نے میدان مار لیا ہے اور پہلا سوال حل کر لیا ہے ۔ اگر بیکر بالکل ایک جیسے پچاس بسکٹ بناتا ہے ' وہ ان سب کے لیے ایک ہی سانچہ استعمال کرتا ہوگا ۔ معاملہ ختم ' مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں !

اس کے بعد وڈیو کے افلاطون نے کیمرے میں جھانکا اور پوچھا تھا کہ تمام گھوڑے ایک جیسے کیوں ہوتے ہیں ۔ لیکن وہ سب کے سب ہو بہو ایک جیسے تو بالکل

نہیں ہوتے ! اس کے برعکس سوفی کا خیال تھا کہ جس طرح دو انسانوں کی شکل ایک جیسی نہیں ہوتی' دو گھوڑوں کی بھی نہیں ہوتی۔

وہ معاملہ یہیں ختم کرنا چاہتی تھی کہ اسے یاد آیا کہ اس نے بسکٹوں کے بارے میں کیا سوچا تھا۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو ہو بہو کسی بھی دوسرے جیسا ہو۔ بعض دوسروں کی نسبت قدرے زیادہ فربہ تھے اور بعض شکستہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہر شخص صاف دیکھ سکتا تھا کہ وہ ایک لحاظ سے "بالکل ایک جیسے" ہیں۔

دراصل افلاطون جو کچھ پوچھ رہا تھا' وہ شاید یہ تھا: گھوڑا ہمیشہ گھوڑا ہی کیوں ہوتا ہے' وہ' مثلاً' گھوڑے اور خنزیر کے مابین کوئی چیز کیوں نہیں ہوتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بے شک بعض گھوڑے بھالو کی طرح بھورے اور بعض بھیڑ کی طرح سفید ہوتے ہیں' اس کے باوجود سب گھوڑوں میں کوئی چیز مشترک ہوتی ہے۔ مثلاً سوفی نے ابھی تک ایک بھی ایسا گھوڑا نہیں دیکھا تھا جس کی چھ یا آٹھ ٹانگیں ہوں۔

لیکن یقیناً افلاطون یہ تو بالکل نہیں سمجھتا ہوگا کہ سب گھوڑے اس لیے ایک جیسے ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک ہی سانچے سے نکلے ہوتے ہیں؟

اس کے بعد افلاطون نے واقعی مشکل سوال پوچھا تھا۔ کیا انسان میں غیر فانی روح ہوتی ہے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کے متعلق سوفی کا خیال تھا کہ وہ اس کا جواب دینے کی اہل نہیں۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ مردوں کو دفنا دیا جاتا ہے یا جلا دیا جاتا ہے' یوں ان کا مستقبل ختم ہو جاتا ہے۔ اگر انسان میں غیر فانی روح موجود ہوتی ہے' پھر یہ ماننا پڑے گا کہ انسان دو مختلف حصوں پر مشتمل ہوتا ہے: ایک تو اس کا جسم ہوا جو چند سال گزرنے کے بعد گھس جاتا ہے ـــــ اور دوسری روح ہوئی جو یہ نہیں دیکھتی کہ جسم پر کیا بیت رہا یا بیت چکا ہے' بلکہ آزادانہ مصروف عمل رہتی ہے۔ اس کی دادی نے ایک مرتبہ اسے بتایا تھا۔ "یہ میرا صرف جسم ہے جو بوڑھا ہوا ہے۔ ورنہ میں اپنے باطن میں تو ہمیشہ اپنے آپ کو نوخیز دوشیزہ سمجھتی رہی ہوں۔"

"نوجوان دوشیزہ" کے تصور نے اس کی توجہ آخری سوال کی طرف مبذول کرا دی۔ کیا مرد اور خواتین مساوی طور پر سمجھ دار اور عقل مند ہوتے ہیں؟ وہ اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ سوال کے جواب کا انحصار اس بات پر تھا کہ افلاطون کی سمجھ دار اور عقل مند سے مراد کیا ہے۔

فلسفی نے سقراط کے متعلق جو کچھ کہا تھا' اس کی ایک بات اسے یاد آ گئی۔

سقراط نے کہا تھا کہ ہر شخص فلسفیانہ صداقتیں سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی عقل سلیم استعمال کرے ۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ غلام میں اتنی ہی عقل سلیم ہوتی ہے جتنی کسی اونچے طبقے کے آدمی میں ۔سوفی کو یقین تھا کہ اس نے یہ بھی کہا ہوگا کہ عورتیں بھی اسی عقل سلیم کی مالک ہوتی ہیں جس کی کہ مرد۔

جب وہ وہاں بیٹھی سوچ رہی تھی ، اچانک باڑ میں سرسراہٹ ہونے لگی اور سٹیم انجن کی طرح کسی چیز کے ہانپنے اور سیٹیاں بجانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں ۔ اگلے ہی لمحے سنہری بالوں والا کتا خفیہ ٹھکانے میں گھس آیا ۔ اس کے منہ میں بڑا لفافہ تھا۔

"ہرمیز !"سوفی نے چلا کر کہا،" گرادو ! گرادو !"

ہرمیز نے لفافہ سوفی کی گود میں گرا دیا ، اور سوفی نے کتے کے سر پر تھپکی دینے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ہرمیز ،تم بہت اچھے ہو !"اس نے کہا۔

کتا نیچے لیٹ گیا اور اس نے سوفی کو اپنا سر تھپکنے دیا ۔لیکن دو منٹ بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جس طرح آیا تھا اسی طرح باڑ میں دھکے مارتا واپس چلا گیا ۔سوفی خاکی لفافہ ہاتھ میں پکڑے اس کے پیچھے چل پڑی ۔ وہ جھاڑیوں کے گھنے جھنڈ میں سے رینگتی باغ سے باہر نکلی اور جنگل کی طرف چلنے لگی ۔

ہرمیز پہلے ہی جنگل کے کنارے پہنچ چکا تھا ۔ وہ بھاگا جارہا تھا اور سوفی چند گز پیچھے اس کا تعاقب کر رہی تھی ۔ دو مرتبہ کتے نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور غرایا ۔لیکن سوفی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اس مرتبہ وہ فلسفی کا اتا پتا معلوم کرنے کا تہیہ کرچکی تھی ـــــ خواہ اس مقصد کے لیے اسے ایتھنز تک ہی کیوں نہ بھاگنا پڑے ۔

کتا پہلے ہی خاصا تیز بھاگتا جارہا تھا لیکن اب اس نے اپنی رفتار اور بھی تیز کردی اور وہ اچانک کسی تنگ پگڈنڈی کی طرف مڑ گیا ۔سوفی بھی اپنی دھن کی پکی تھی ، اس نے تعاقب جاری رکھا لیکن چند منٹ بعد وہ رکا ، واپس مڑا اور کسی چوکیدار کتے کی طرح بھونکنے لگا ۔سوفی اب بھی باز نہ آئی اور موقعہ سے فائدہ اٹھا کر دونوں کے مابین فاصلہ تنگ کرنے لگی ۔

کتا واپس مڑا اور اس مرتبہ وہ برق رفتاری سے بھاگنے لگا ۔سوفی کو اندازہ ہوگیا

کہ وہ اسے کبھی پکڑ نہیں پائے گی ۔ وہ کچھ دیر ، جو طوالت میں غیر مختتم معلوم ہو رہی تھی ، ساکن کھڑی رہی اور کتے کی آواز سنتی رہی جو دور سے دور تر ہوتا جارہا تھا ۔ پھر کامل سکوت چھا گیا ۔

پھر وہ جنگل میں کسی جگہ ایک درخت کے ٹھنٹھ پر بیٹھ گئی ۔ خاکی لفافہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا ۔ اس نے لفافہ کھولا ، متعدد ٹائپ شدہ کاغذات نکالے اور پڑھنے لگی ۔

افلاطون کی اکیڈمی

سوفی ، ہم نے جو چند گھڑیاں اکٹھے گزاریں ، میں ان کے لیے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ میرا مطلب ان گھڑیوں سے ہے جو ہم نے ایتھنز میں گزاری تھیں ۔ چنانچہ اب کم از کم اتنا تو ہوا ہے کہ میں نے اپنا تعارف کرا دیا ہے ۔ اور چونکہ میں افلاطون کا تعارف بھی کراچکا ہوں ، ہم کسی مزید کھکھیڑ کے بغیر اپنا درس شروع کر سکتے ہیں ۔

جب سقراط نے زہر کا پیالہ پیا تھا ، افلاطون (428 ق م تا 347 ق م) کی عمر انتیس سال تھی ۔ وہ کچھ مدت سقراط کا شاگرد رہ چکا تھا اور اس نے سقراط کے مقدمے کی کارروائی بڑے قریب سے دیکھی تھی ۔ اس حقیقت نے کہ ایتھنز اپنے شریف ترین شہری کو موت کی سزا سنا سکتا تھا ، اس کے ذہن پر انتہائی گہرے نقوش ثبت کیے تھے ۔ اس نے اس کی تمام فلسفیانہ تگ ودو کو بالکل نئے راستے پر ڈال دیا ۔

افلاطون کے نزدیک سقراط اس کشمکش کی نمایاں مثال تھا جو کسی سچے یا مثالی معاشرے اور اس معاشرے کے مابین پائی جاتی ہے جوکہ وہ درحقیقت ہوتا ہے ۔ فلسفی کی حیثیت سے افلاطون نے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے سقراط کے "جواب دعویٰ" یا "صفائی" (Apology) کی (بصورت کتاب) تشہیر کردی ۔

لاریب تمہیں یاد ہوگا کہ سقراط نے خود کبھی کوئی چیز

تحریر نہیں کی تھی حالانکہ اس کے بہت سے پیش رو یہ کام کرتے رہے تھے۔ دقت یہ ہے کہ ان کے تحریری مواد کا صرف حقیر حصہ زمانے کی دستبرد سے بچا ہے۔ لیکن جہاں تک افلاطون کا تعلق ہے، ہمیں یقین ہے کہ اس کی تمام بڑی تصانیف محفوظ رہ گئی ہیں۔ (سقراط کے "جواب دعویٰ" کے علاوہ افلاطون نے ایک خطوط کا مجموعہ اور لگ بھگ پچیس فلسفیانہ "مکالمات" (Dialogues) رقم کئے تھے۔) یہ کہ اس کی یہ تصانیف آج بھی موجود ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ افلاطون نے ایتھنز سے کچھ ہی دور درختوں کے جھنڈ میں اپنا فلسفے کا سکول کھول لیا تھا۔ اس نے اس کا نام یونان کے ایک افسانوی ہیرو اکادےموس (2) (Academus) کے نام پر رکھا تھا۔ چنانچہ یہ سکول اکادمی کے نام سے مشہور ہوگیا۔ (تب سے اب تک دنیا کے کونے کونے میں ہزاروں اکادمیاں قائم ہوچکی ہیں۔ آج بھی ہم "academics" اور "academic subjects" کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔)

افلاطون کی اکادمی میں جو مضامین پڑھائے جاتے تھے، وہ فلسفہ، ریاضی اور جسمانی تعلیم (gymnastics) تھے —— حالانکہ "پڑھانے" کو بمشکل صحیح لفظ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جوشیلی اور تیز طرار گفتگوئیں اور مکالمے افلاطون کی اکادمی کی اہم ترین خصوصیات گردانی جاتی تھیں۔ چنانچہ یہ محض اتفاق نہیں کہ افلاطون کی تحریروں نے مکالموں کی صورت اختیار کرلی۔

دائمی طور پر صحیح، دائمی طور پر خوبصورت اور دائمی طور پر اچھی

میں نے اس نصاب کے آغاز پر کہا تھا کہ یہ پوچھنا کہ کسی خاص فلسفی کا پراجیکٹ کیا تھا، اچھی بات ہوتا ہے۔ چنانچہ اب میں پوچھتا ہوں: افلاطون کا واسطہ کن مسائل سے تھا؟

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ افلاطون کا واسطہ اس تعلق سے تھا جو ایک طرف اس چیز کے جو ابدی اور غیرتغیرپذیر ہوتی

ہے اور دوسری طرف اس کے جوکہ " بہتی ہے "، "مابین ہوتا ہے ۔ (یہ بالکل وہی مسئلہ ہے جو قبل از سقراط فلسفیوں کو پیش آیا تھا ۔)
ہم دیکھ چکے ہیں کہ سوفسطائیوں اور سقراط نے کس طرح اپنی توجہ کا رخ فلسفہ فطرت کے سوالوں سے انسان اور معاشرے سے متعلق مسائل کی طرف پھیر دیا تھا ۔ تاہم ایک مفہوم میں سقراط اور سوفسطائی بھی ابدی اور غیرتغیرپذیر اور " بہتے ہوئے " کے مابین تعلق میں منہمک رہے ۔ اس مسئلے کا انسان کی اخلاقی اقدار اور معاشرے کے آدرشوں یا نیکی کے تصورات سے جو تعلق ہے، انہیں اس میں دلچسپی تھی ۔ مختصراً سوفسطائیوں کا خیال تھا کہ صحیح کیا ہے یا غلط کیا ہے، اس کا ادراک ہر شہری، ہر ریاست اور ہر نسل اپنے اپنے انداز سے کرتی ہے اور یوں ان کے تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ۔ چنانچہ صحیح اور غلط ایک ایسی چیز ہے جو " بہتی ہے ۔ "سقراط کے لیے یہ بات سراسر ناقابل قبول تھی ۔ اس کا عقیدہ تھا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے، اس کے متعلق ابدی اور مطلق ضوابط موجود ہیں ۔ اپنی عقل سلیم استعمال کرکے ہم سب ان غیرتغیرپذیر معیاروں تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں کیونکہ عقل انسانی درحقیقت ابدی اور غیرتغیرپذیر ہے ۔

سوفی، سمجھ رہی ہونا؟ پھر افلاطون منظر عام پر نمودار ہوتا ہے ۔ اس کا تعلق ان دونوں باتوں سے ہے کہ فطرت میں ابدی اور غیرتغیرپذیر کیا ہے اور اخلاقی اقدار اور معاشرے کے معاملے میں ابدی اور غیر تغیر پذیر کیا ہے ۔ افلاطون کے نزدیک یہ دونوں مسائل دراصل ایک ہی ہیں ۔ اس نے ایک ایسی " حقیقت " گرفت میں لینے کی کوشش کی جو ابدی اور غیر تغیر پذیر ہے ۔

اور یہی بات یہ ہے کہ صحیح صحیح بالکل یہی چیز ہے جس کے لیے ہمیں فلسفیوں کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ ہمیں کسی ملکہ حسن کے انتخاب یا ٹماٹروں کا بھاؤ چکانے کے لیے ان کی ضرورت پیش نہیں آتی ۔ (یہی وجہ ہے کہ وہ اتنے غیرمقبول ہوتے ہیں!) فلسفی انتہائی وقتی دلچسپی کے مسائل نظر انداز کردیتے ہیں اور اس کی بجائے وہ لوگوں کی توجہ ان چیزوں کی طرف مبذول کرانے

کی کوشش کرتے ہیں جو دائمی طور پر "صحیح"، دائمی طور پر "خوبصورت" اور دائمی طور پر "اچھی" ہوتی ہیں۔

یوں ہمیں افلاطون کے فلسفیانہ پراجیکٹ کے کم از کم خاکے کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ ہم ایک غیر معمولی دماغ کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ دماغ جس نے یورپ کے بعد کے فلسفے پر گہرا اثر (3) ڈالا تھا۔

امثال کی دنیا

ایمپےدوکلیس اور دیموکری توس دونوں نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی کہ اگرچہ دنیائے فطرت میں ہر چیز "بہتی" ہے، تاہم کوئی نہ کوئی چیز ("چار جڑیں" یا "ایٹم") ایسی لازماً ہونا چاہیے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ افلاطون اس بیان سے متفق تو تھا ـــــ لیکن بالکل ہی مختلف طریقے سے۔

افلاطون کا ایقان تھا کہ ہر وہ چیز جسے چھوا جاسکتا ہے یا جس کا دوسرے حواس سے ادراک کیا جاسکتا ہے، "بہتی" ہے۔ چنانچہ ایسے کوئی "مادے" (substances) نہیں جو حل نہ ہوسکتے ہوں۔ بلا رورعایت ہر وہ چیز جس کا تعلق مادی دنیا سے ہے، ایسے مواد (material) سے بنی ہے جس کی وقت کے ساتھ شکست و ریخت ہوتی رہتی ہے اور جو انجام کار نیست و نابود ہوجاتی ہے، لیکن ہر چیز ایک ایسے "سانچے" یا "شکل" کے مطابق بنی ہوتی ہے جو وقت کی قید سے آزاد اور یوں ابدی اور غیر تغیر پذیر ہوتی ہے۔

سمجھیں؟ نہیں، تم نہیں سمجھیں۔

سوفی، گھوڑے ایک جیسے کیوں ہوتے ہیں؟ تم غالباً سمجھتی ہو کہ سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ لیکن تمام گھوڑوں میں کوئی چیز مشترک ہوتی ہے، کوئی ایسی چیز جو ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم ان کی گھوڑوں کی حیثیت سے شناخت کرسکیں۔ فطری طور پر کوئی خاص گھوڑا "بہتا" ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ معمر اور

لنگڑا ہو اور یہ وقت کے ساتھ مرجائے گا ۔ لیکن گھوڑے کی شکل ابدی اور غیر تغیر پذیر ہوتی ہے۔

جو چیز ابدی اور غیر تغیر پذیر ہے ، افلاطون کے نزدیک وہ اس طرح طبعی "بنیادی مادا" نہیں جس طرح کہ وہ ایمپے دوکلیس اور دیموکری توس کے نزدیک تھی ۔ افلاطون سمجھتا تھا کہ ایسے ابدی اور غیرتغیرپذیر نظائر یا نمونے (patterns) موجود ہیں جن کے مطابق تمام اشیا کی ساخت عمل میں آتی ہے ۔ یہ نمونے اپنی نوعیت یا فطرت کے اعتبار سے روحانی اور تجریدی ہیں۔

میں ذرا اس کی اس طرح وضاحت کرتا ہوں : قبل از سقراط فلسفیوں نے یہ فرض کئے بغیر کہ ہر چیز فی الواقع " تبدیل " ہوتی رہتی ہے ، فطرت میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں ، ان کی اچھی خاصی معقول توجیہہ پیش کی تھی ۔ ان کا خیال تھا کہ قدرت کا جو دوریہ (cycle) چلتا ہے ، اس کے دوران میں اشیا تو بنتی اور ختم ہوتی رہتی ہیں ، لیکن ان اشیا میں بعض ایسے ابدی اور غیر تغیر پذیر " صغیر ترین عناصر " ہوتے ہیں ، جو ضائع نہیں ہوتے (بلکہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں) ۔ سوفی ، یہاں تک تو بات ٹھیک ہوسکتی ہے ! لیکن ان کے پاس اس بات کی کوئی معقول توجیہہ نہیں تھی کہ یہ " صغیر ترین عناصر " جو کسی زمانے میں کسی گھوڑے کی ساخت میں بالکل اسی طرح استعمال ہوئے تھے جس طرح کہ مکان کی تعمیر میں اینٹیں استعمال ہوتی ہیں ، کس طرح گھومتے پھرتے چار پانچ سو سال بعد اچانک اکٹھے ہوجاتے اور بالکل نیا گھوڑا تشکیل دے دیتے ہیں ؛ افلاطون نے جو نکتہ اٹھایا وہ یہ تھا کہ اگر دیموکری توس کے ایٹم اسی طرح اکٹھے ہوتے اور گھوڑے تشکیل کرتے رہتے ہیں ، وہ "ہاتھی نا مگر مچھ " (eledile) یا " مگر مچھ نا ہاتھی " (crocophant) کیوں تشکیل نہیں دیتے ؛ اسی ایک چیز نے اس کے سارے فلسفیانہ غور و فکر کو مہمیز دی۔

جو کچھ میں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں ، اگر تو تم اسے پہلے ہی سمجھ گئی ہو پھر تم اگلا پیرا آسانی سے چھوڑ سکتی ہو ۔ بصورت دیگر میں مزید وضاحت کئے دیتا ہوں ۔ تمہارے پاس لیگو (lego) کا ڈبا ہے اور تم لیگو گھوڑا بناتی ہو ۔ پھر تم اسے ادھیڑ

دیتی ہو اور گوٹیں دوبارہ ڈبے میں رکھ دیتی ہو ۔ اب اگر تم یہ
توقع کرو کہ تم محض ڈبے کو زور زور سے جھٹکے دے کر نیا گھوڑا
بنا لوگی تو تمہاری توقع پوری نہیں ہوگی ۔ لیگو کی گوٹیں کیسے
اپنی مرضی سے ایک دوسری کو تلاش کرسکتی اور نئے گھوڑے
میں تبدیل ہوسکتی ہیں ؛ نہیں ، سوفی ، تمہیں نیا گھوڑا خود بنانا
ہوگا ۔ اور یہ کام جو تم کرسکتی ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ گھوڑا جس
طرح نظر آتا ہے ، اس کی واضح تصویر تمہارے ذہن میں موجود
ہے ۔ لیگو گھوڑا ایک ایسے نمونے کے مطابق بنایا جاتا ہے جو ،
گھوڑا خواہ کتنی بار بنایا جائے ، تبدیل نہیں ہوتا ۔

تم نے بالکل ایک جیسے بسکٹوں کے معاملے میں کیا کیا
تھا ؟ آئیں ، ہم فرض کرلیتے ہیں کہ تم اچانک بیرونی خلا سے ٹپک
پڑتی ہو اور اس سے پہلے تم نے کسی بیکر کو کبھی نہیں دیکھا
ہوتا ۔ تم اتفاق سے کسی جی للچانے والی بیکری میں داخل ہوجاتی
ہو اور وہاں تمہیں کسی شیلف پر انسانی شکلوں کے بالکل ایک
جیسے پچاس بسکٹ ، جن میں ادرک کی آمیزش ہوتی ہے ، نظر
آجاتے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں تعجب ہوا ہوگا کہ یہ سب
کے سب بالکل ایک جیسے کیسے ہوگئے ۔ عین ممکن ہے کہ ان میں
سے کسی کا بازو غائب ہو ، دوسرے کے سر کا کچھ حصہ ٹوٹ چکا ہو
یا تیسرے کے پیٹ پر مضحکہ خیز ابھار بن گیا ہو لیکن پوری توجہ
سے غور و فکر کرنے کے بعد تم بہرحال اس نتیجے پر پہنچ جاؤ گی
کہ ان انسان نما ادرک ملے بسکٹوں میں کوئی نہ کوئی چیز مشترک
ہے ۔ اگرچہ ان میں سے ایک بھی بے عیب نہیں ، تمہارے ذہن
میں یہی خیال آئے گا کہ غالباً ان سب کا ماخذ مشترک ہے ۔ تمہیں
اندازہ ہوجائے گا کہ تمام بسکٹ ایک ہی سانچے میں بنائے گئے
ہیں ۔ اور سوفی ، مزید بات یہ ہے کہ اب تمہیں اس سانچے کو دیکھنے
کی ناقابل مزاحمت خواہش اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے ۔ وجہ
صاف ظاہر ہے ، ان بے ڈھنگی نقلوں کے مقابلے میں سانچہ فی نفسہ
کاملاً بے عیب ـــــ اور ایک لحاظ سے زیادہ خوبصورت ـــــ
ہونا چاہیے ۔

اگر تم نے یہ مسئلہ خود حل کرلیا تھا تو تم نے اس کا

فلسفیانہ حل عین مین اسی طرح دریافت کرلیا تھا جس طرح افلاطون نے کیا تھا۔

اکثر فلسفیوں کی طرح وہ بھی "بیرونی خلا سے ٹپکا تھا۔" (وہ خرگوش کی پوستین کے بالوں کی بالکل آخری نوک پر کھڑا تھا۔) اسے جس انداز سے تمام قدرتی مظاہر ایک جیسے نظر آئے، انہیں دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا، اور اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایسا ہونا ہی تھا کیونکہ ہمیں اپنے گردوپیش جو چیز بھی نظر آتی ہے، اس کے "عقب" میں اشکال کی ایک محدود تعداد موجود ہوتی ہے۔ ہر گھوڑے، خنزیر یا انسان کے پیچھے "مثالی گھوڑا" (idea horse)، "مثالی خنزیر" یا "مثالی انسان" ہوتا ہے۔ (بالکل اسی طرح جس طرح بیکری میں، جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں، انسان نما بسکٹ، گھوڑے نما بسکٹ یا خنزیر نما بسکٹ ہوسکتے ہیں، کیونکہ ہر اچھی بیکری میں، جو اپنی قدر کرانا جانتی ہے، ایک سے زیادہ سانچے ہوتے ہیں۔ لیکن ادرک ملے بسکٹ کی ہر قسم کے لیے ایک ہی سانچہ کافی ہوتا ہے۔)

افلاطون اس نتیجے پر پہنچا کہ "مادی دنیا" کے عقب میں لازماً کوئی حقیقت (reality) ہوگی۔ وہ اس حقیقت کو دنیائے امثال (world of ideas) کہتا تھا، اسی دنیا میں ان تمام مظاہر کے، جو فطرت میں ہمیں نظر آتے ہیں، ابدی اور غیرتغیرپذیر نمونے (patterns) موجود ہیں۔ اس غیر معمولی نظریے کو افلاطون کا نظریہ امثال (theory of ideas) کہا جاتا ہے۔

صحیح علم

ڈیر سوفی، مجھے یقین ہے کہ تم میری باتیں سمجھ رہی ہوگی۔ لیکن تم شاید سوچ رہی ہوگی کہ آیا افلاطون واقعی سنجیدہ تھا۔ کیا اسے واقعی یقین تھا کہ اس قسم کی شکلیں حقیقتاً کسی بالکل ہی مختلف اصلی دنیا میں موجود ہیں؟

وہ غالباً اپنی ساری زندگی اسی طریقے سے لفظی معنوں

میں اس پر یقین نہیں کرتا رہا لیکن اس کے بعض مکالمات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس کا یقیناً یہی مدعا تھا کہ اسے اسی انداز سے سمجھا جائے ۔ آؤ ، ہم اس کے سلسلہ خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں فلسفی کسی ایسی چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو ابدی اور تغیرناآشنا ہوتی ہے ۔ مثلاً اگر کوئی شخص صابن کے کسی خاص بلبلے کی موجودگی پر فلسفیانہ مقالہ تحریر کرتا ہے ، تو اس سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بلبلے کے پھٹنے سے پہلے آدمی کو اتنا وقت ملے گا ہی نہیں کہ وہ اس کا گہرائی سے مطالعہ کرسکے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کے متعلق مقالہ قلم بندکرتا ہے جسے کبھی کسی نے دیکھا ہی نہ ہو اور جو محض پانچ سیکنڈ "زندہ" رہتی ہے 'بازار میں اس کا کوئی خریدار ملنا دشوار ہے۔

افلاطون کا ایقان تھا کہ ہمیں اپنے گرد و پیش جو چیز بھی نظر آتی ہے یا جسے ہم چھو سکتے ہیں ' اسے صابن کے بلبلے سے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ حواس کی دنیا میں جو چیزیں موجود ہیں ' ان میں سے ایک کو بھی دوام حاصل نہیں ۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہر انسان اور ہر حیوان جلد یا بدیر مرجائے گا اور گل سڑ جائے گا ۔ یہی نہیں ' سنگ مرمر کی سل بھی بتدریج تبدیل ہوتی رہتی اور بالآخر شکست و ریخت کا شکار ہوجاتی ہے ۔ (سوفی ' ایکروپولس کھنڈرات میں تبدیل ہوچکا ہے ! یہ ہے تو شرم ناک بات ' لیکن کیا کیا جائے ' ہوتا یہی ہے ۔) افلاطون کا نکتہ یہ ہے کہ ہم کسی ایسی چیز کا سچا علم حاصل نہیں کرسکتے جو مسلسل تبدیلی کے عمل سے دوچار رہتی ہو ۔ ہم ان اشیا کے بارے میں ' جن کا تعلق حواس کی دنیا سے ہے یا جو حواس کی مدد سے معلوم کی جاسکتی ہیں ' صرف آرا قائم کرسکتے ہیں ۔ ہم صرف ان اشیا کا سچا علم حاصل کرسکتے ہیں جن کی تفہیم ہم اپنی عقل کی مدد سے کرسکتے ہیں۔

خیر ' سوفی ' میں اس کی تشریح ذرا زیادہ واضح انداز سے کرتا ہوں ۔ بیکنگ (baking) کے تمام مراحل میں سے گزارنے

کے بعد بھی انسان نا بلنک اتنا غیر متوازن ہوسکتا ہے (یہ ایک طرف سے بھاری اور دوسری طرف سے ہلکا ہوسکتا ہے) کہ یہ سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے کہ آخر اس کے بنانے کا مقصد کیا تھا ۔ لیکن ایک درجن انسان نا بلنک دیکھنے کے بعد ، جنہیں کامیابی سے بنایا جاسکا تھا ، مجھے یقین ہوجاتا ہے کہ بسکٹوں کا سانچہ کس قسم کا تھا ۔ اگرچہ میں نے اس سانچے کو کبھی نہیں دیکھا ہوتا ، میں اس کے متعلق قیاس آرائی کرسکتا ہوں ۔ سانچے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا بھی شاید سودمند ثابت نہ ہو کیونکہ ہم ہمیشہ اپنے حواس کی گواہی پر اعتبار نہیں کرسکتے ۔ بصارت کی صلاحیت ہر شخص میں مختلف ہوتی ہے ۔ اس کے برعکس جو کچھ ہماری عقل بتاتی ہے ، ہم اس پر بھروسا کرسکتے ہیں کیونکہ یہ سب کی ایک جیسی ہوتی ہے ۔

اگر تم تیس دوسرے طالب علموں کے ساتھ کلاس میں بیٹھی ہو اور استاد کلاس سے پوچھتا ہے کہ دھنک کا خوبصورت ترین رنگ کون سا ہے ، اسے غالباً بے شمار مختلف جواب ملیں گے ۔ لیکن اگر وہ یہ سوال پوچھے : آٹھ ضرب تین کا حاصل کیا ہے ، ساری کلاس ایک ہی جواب ـــــ امید تو یہی ہے ـــــ دے گی ، کیونکہ اب عقل بول رہی ہے اور عقل ایک لحاظ سے "میرا خیال ہے" یا "مجھے محسوس ہوتا ہے" کے بالکل متضاد ہوتی ہے ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقل ابدی اور آفاقی ہے کیونکہ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو یہ محض ابدی اور آفاقی حالتوں (states) کا اظہار کرتی ہے ۔

افلاطون کو ریاضی بہت توجہ گیر معلوم ہوئی کیونکہ ریاضی کی حالتیں کبھی تبدیل نہیں ہوتیں ۔ چنانچہ یہ وہ حالتیں ہیں جن کے متعلق ہم صحیح علم حاصل کرسکتے ہیں ۔ لیکن یہاں ایک مثال پیش کرنے کی ضرورت ہے ۔

فرض کرو تمہیں جنگل میں چیڑ کی کوئی گنولی (pine cone) ملتی ہے ۔ شاید تم کہتی ہو : میرا "خیال" ہے یہ بالکل گول نظر آتی ہے جب کہ جوآننا کا اصرار ہے کہ یہ ایک طرف سے قدرے چپٹی ہے ۔ (اب تم دونوں کی آپس میں بحث شروع ہوجاتی ہے !) لیکن تمہیں کسی ایسی چیز کا ، جس کا ادراک تم اپنی

آنکھوں سے کرتی ہو، صحیح علم حاصل نہیں ہوسکتا ۔ اس کے برعکس تم کامل تیقن سے کہہ سکتی ہو کہ دائرے میں زاویوں کا مجموعہ تین سو ساٹھ درجے ہوتا ہے ۔ اس سلسلے میں تم کسی مثالی (ideal) دائرے کا ذکر کر رہی ہوگی جو ممکن ہے کہ اس طبعی دنیا میں موجود نہ ہو لیکن جسے تم اپنے تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی ہو ۔ (تم باورچی خانے کی میز پر رکھے کسی خاص بسکٹ سے نہیں بلکہ انسان نما بسکٹوں کے پوشیدہ سانچے سے نپٹ رہی ہو ۔)

قصہ مختصر ، ہم جن چیزوں کا ادراک اپنے حواس سے کرتے ہیں ان کا غیر صحیح تصور ہی ہمارے ذہنوں میں آسکتا ہے ۔ مگر جن اشیا کو ہم اپنی عقل کی مدد سے سمجھتے ہیں ، ان کا ہم صحیح علم حاصل کرسکتے ہیں ۔ کسی تکون میں زاویوں کا مجموعہ تا ابد ایک سو اسی درجے ہی رہے گا ۔ اور اسی طرح "مثالی" گھوڑا ہمیشہ چار ٹانگوں پر چلتا رہے گا خواہ ہمارے حواس کی دنیا میں تمام گھوڑے اپنی ایک ایک ٹانگ تڑوا بیٹھیں ۔

غیر فانی روح

جیسا کہ میں تصریح کرچکا ہوں افلاطون کا ایقان تھا کہ حقیقت دو خطوں میں منقسم ہے ۔

ایک خطہ حواس کی دنیا ہے جس کا ہم اپنے پانچوں (تخمینی یا نامکمل) حواس سے محض تخمینی یا نامکمل علم حاصل کرپاتے ہیں ۔ اس حواسی دنیا میں "ہر چیز بہتی ہے" اور کوئی چیز مستقل نہیں ۔ عدم اس حواسی دنیا میں ہے ، یہاں صرف وہی اشیا ہیں جو آتی ہیں ، کچھ دیر ٹھہرتی ہیں اور فنا ہوجاتی ہیں ۔

دوسرا خطہ دنیائے امثال ہے جس کا ہم اپنی عقل استعمال کرکے صحیح علم حاصل

کر سکتے ہیں - اس دنیائے امثال کا ادراک حواس
کے ذریعے نہیں ہوسکتا لیکن امثال (ideas) (یا
شکلیں: forms) ابدی اور غیر تغیر پذیر ہیں -

افلاطون کے مطابق انسان مثنوی (dual) مخلوق ہے - ہمارا
ایک جسم ہے جو " بہتا " ہے اور جو لاینفک طور پر حواس کی دنیا کے
ساتھ پیوست ہے اور اسی طرح مقدر کے تابع ہے جس طرح اس
دنیا کی باقی تمام اشیا ـــــ مثلاً صابن کا بلبلہ ـــــ ہیں - لیکن
ہماری ایک غیرفانی روح بھی ہوتی ہے ـــــ اور یہ روح عقل
کی مملکت ہے - اور چونکہ روح کا جسم نہیں ہوتا ' یہ دنیائے امثال
کا جائزہ لے سکتی ہے -

لیکن سوفی ' بات یہیں ختم نہیں ہوتی - بالکل ختم نہیں
ہوتی -

افلاطون کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ روح جسم میں داخل ہونے
سے پہلے بھی موجود ہوتی ہے - (یہ بسکٹوں کے تمام سانچوں کے
ساتھ الماری کے کسی خانے میں پڑی ہوگی -) لیکن جونہی روح
کسی انسانی جسم میں بیدار ہوتی ہے ' یہ تمام کامل امثال بھول چکی
ہوتی ہے - پھر کچھ وقوع پذیر ہونے لگتا ہے - سچ پوچھو تو کوئی
حیرت انگیز اور متاثر کن عمل شروع ہوجاتا ہے - جب انسان
دنیائے فطرت میں مختلف شکلیں دریافت کرنے لگتا ہے ' کوئی
دھندلی یاد اس کی روح میں کلبلانے لگتی ہے - اسے کوئی گھوڑا
نظر آتا ہے ـــــ لیکن یہ گھوڑا غیر کامل ہوتا ہے (گھوڑا نما
بسکٹ) - اس کا نظارہ اس کی روح میں کامل " گھوڑے " کی یاد تازہ
کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے جو روح نے کبھی دنیائے امثال
میں دیکھا تھا اور اس سے روح کے اندر اپنی اصلی مملکت میں واپس
جانے کی تڑپ کروٹیں لینے لگتی ہے - افلاطون اس شدید آرزو کو
عیروس (eros) ـــــ جس کا مطلب محبت ہے ـــــ کہتا
ہے - تب روح کو اپنے اصل ماخذ کی طرف لوٹنے کی " شدید آرزو "
کا تجربہ ہونے لگتا ہے - جب یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے تب
جسم اور حواسی دنیا میں گزرنے کا تجربہ غیر کامل اور غیر اہم معلوم

ہونے لگتا ہے - روح محبت کے پروں پر اڑ کر اپنے گھر دنیائے
امثال میں واپس جاتے کے لیے تڑپنے لگتی ہے - یہ جسم کی
زنجیروں سے آزاد ہونے کی آرزو کرنے لگتی ہے-
میں بلا تاخیر یہ بات زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ افلاطون
مثالی طرز حیات کا ذکر کر رہا ہے کیونکہ تمام انسان کسی اعتبار سے
بھی اپنی روح کو یوں آزاد نہیں کرتے کہ وہ دنیائے امثال کی
طرف سفر شروع کردے - اکثر لوگ دنیائے حواس میں امثال
کی "پرچھائیوں" سے چمٹے رہتے ہیں - انہیں پہلے ایک گھوڑا نظر آتا
ہے —— اور پھر دوسرا - لیکن انہیں وہ گھوڑا کبھی نظر نہیں
آتا جس کی تمام گھوڑے کمزور نقلیں ہیں - (وہ اندھا دھند بھاگتے
باورچی خانے میں داخل ہوتے ہیں اور مختلف شکلوں میں بنے
ہوئے ادرک ملے بسکٹ اپنے پیٹوں میں ٹھونسنے لگتے ہیں اور ذرا
بھی نہیں سوچتے کہ یہ کہاں سے آئے ہیں -) جو کچھ افلاطون بیان
کر رہا ہے وہ فلسفیوں کا طریقہ ہے - اس کے فلسفے کا یوں
مطالعہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ فلسفیوں کے طریق کار کا بیان ہے-

سوفی ، جب تمہیں کوئی سایہ نظر آتا ہے ، تم یہ فرض
کرلوگی کہ کہیں نہ کہیں کوئی چیز ہے جس کی یہ پرچھائیاں منعکس
ہو رہی ہیں - تمہیں کسی جانور کا سایہ دکھائی دیتا ہے - تمہیں
خیال گزرتا ہے کہ یہ کسی گھوڑے کا سایہ ہوسکتا ہے لیکن تم
یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتیں (کہ یہ کس جانور کا سایہ ہے) -
چنانچہ تم مڑتی ہو اور تمہیں خود گھوڑا نظر آجاتا ہے —— جو
ناک نقشے کے اعتبار سے "اپنی سائے" سے یقیناً غیر محدود طور پر
زیادہ خوبصورت ہے اور اس کی شکل بھی "اپنی سائے" کے
مقابلے میں ، جو دھندلا نظر آتا تھا ، کہیں زیادہ واضح ہے -
افلاطون کا عقیدہ تھا کہ تمام فطری مظاہر ابدی شکلوں یا
امثال کی محض پرچھائیاں ہیں - لیکن اکثر لوگ محض
پرچھائیوں کے ساتھ زندگی گزارنے پر قانع ہوجاتے ہیں - وہ قطعاً
نہیں سوچتے کہ پرچھائیاں کس چیز کی منعکس ہو رہی ہیں - وہ سمجھتے
ہیں کہ پرچھائیاں ہی سب کچھ ہیں ، انہیں اتنا بھی احساس نہیں ہوتا
کہ یہ دراصل پرچھائیاں ہیں - چنانچہ وہ اپنی روح کی لافناپذیری پر

کوئی دھیان نہیں دیتے۔

غار کی تاریکی سے باہر

افلاطون نے اس کی تشریح ایک اسطورے (متھ) کے حوالے سے کی ہے۔ ہم اسے "غار کا اسطورہ" کہتے ہیں۔ میں اسے اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

فرض کرو چند اشخاص کسی زیرزمین غار میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ غار کے دہانے کی طرف پشت کئے بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کچھ اس انداز سے بندھے ہوئے ہیں کہ وہ غار کی محض عقبی دیوار کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک اونچی دیوار ہے اور اس دیوار کے پیچھے انسان نما مخلوق چل پھر رہی ہے۔ اس مخلوق نے دیوار کے اوپر اپنے ہاتھوں میں مورتیاں اٹھا رکھی ہیں۔ چونکہ ان مورتیوں کے پیچھے آگ جل رہی ہے، ان کی ٹمٹماتی پرچھائیاں غار کی عقبی دیوار پر پڑ رہی ہیں۔ چنانچہ غار کے مکینوں کو جو واحد چیز نظر آتی ہے، وہ ان پرچھائیوں کا کھیل ہے۔ چونکہ وہ عالم پیدائش سے اس حالت میں بیٹھے ہوئے ہیں، وہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ پرچھائیاں ہی سب کچھ ہیں۔

اب فرض کرو کہ غار کا کوئی مکین کسی طرح ان بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ جو پہلا سوال وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے، وہ یہ ہے کہ دیوار پر جو پرچھائیاں پڑ رہی ہیں، وہ کہاں سے آ رہی ہیں۔ جب وہ اپنی پشت موڑتا ہے اور دیوار کے اوپر اٹھی ہوئی مورتیوں کو دیکھتا ہے، تو تمہارے خیال میں کیا ہوتا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہوتی ہے کہ سورج کی تیز روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ مورتیوں کی شفاف صورتیں بھی، جن کی وہ اب تک محض پرچھائیاں دیکھتا رہا ہے، اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ اب وہ اگر کسی طرح دیوار پھاند لیتا ہے اور باہر کی دنیا میں آگ سے آگے گزر جاتا ہے، اس کی آنکھیں اور بھی چندھیا جائیں گی۔ لیکن جب وہ آنکھیں ملتا ہے اور اسے ہر چیز

صاف نظر آنے لگتی ہے ، وہ مختلف اشیا کی خوبصورتی دیکھ ششدر رہ جائے گا ۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ رنگ اور غیر دھندلی چیزیں دکھائی دیں گی ۔ وہ اصلی جانوروں اور پھولوں کا نظارہ کرے گا جن کی غار میں پرچھائیں اصل کی محض بھونڈی نقلیں تھیں ۔ لیکن اب بھی وہ اپنے آپ سے سوال کرے گا کہ یہ تمام جانور اور پھول کہاں سے آئے ہیں ۔ پھر اسے آسمان پر سورج دکھائی دے گا اور اسے اندازہ ہوجائے گا کہ جس طرح آگ نے پرچھائیوں کا دیکھنا ممکن بنا دیا تھا ، اسی طرح یہ (یعنی سورج) ان جانوروں اور پودوں کو زندگی دیتا ہے ۔

مسرور و شاداں غار کا باسی اگر چاہتا تو کلیلیں بھرتا دیہاتی فضا میں نکل سکتا تھا اور اپنی نئی نئی حاصل شدہ آزادی سے لطف اندوز ہوسکتا تھا ۔ لیکن اس کے برعکس اسے دوسروں کا خیال آجاتا ہے جو تمام کے تمام ابھی تک نیچے غار میں ہیں ۔ وہ واپس جاتا ہے ۔ جب ایک مرتبہ وہ وہاں پہنچ جاتا ہے ، وہ دوسروں کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ غار کی دیوار پر جو پرچھائیاں دیکھ رہے ہیں ، وہ "اصل" اشیا کے محض لرزتے پرتو ہیں ۔ لیکن انہیں اس کی بات کا یقین نہیں آتا ۔ وہ غار کی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہیں : "جو کچھ ہمیں نظر آرہا ہے ، وہی سب کچھ ہے ۔" جب وہ اپنی بات پر اصرار کرتا ہے ، وہ اسے ہلاک کردیتے ہیں ۔

غار کے اسطورے کے حوالے سے افلاطون جس بات کی وضاحت کر رہا ہے وہ دھندلی شبیہوں (images) سے تمام قدرتی مظاہر کے پیچھے صحیح امثال (ideas) تک فلسفی کا سفر ہے ۔ اس کے ذہن میں غالباً سقراط بھی تھا جسے "غار کے مکینوں" نے اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کیونکہ اس نے ان کی روایتی سوچوں کو گزبڑا دیا تھا اور انہیں بھی بصیرت کا راستہ دکھانے کی کوشش کی تھی ۔ غار کا اسطورہ سقراط کے ہمت و حوصلے اور اس کے معلمانہ ذمے داریوں کے احساس کی توضیح کرتا ہے ۔

افلاطون کا نکتہ یہ تھا کہ غار کی تاریکی اور اس سے باہر کی دنیا کے مابین جو تعلق ہے وہ اس تعلق کے مماثل ہے جو دنیائے

فطرت کی صورتوں اور امثال کی دنیا کے مابین پایا جاتا ہے ۔ اس سے اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ دنیائے فطرت تاریک اور افسردہ کن ہے ، بلکہ یہ تھا کہ دنیائے فطرت امثال کی شفافی کے مقابلے میں تاریک اور افسردہ کن ہے ۔ یہ محض تصویر ہے (اصل نہیں)۔

فلسفیانہ مملکت

غار کا اسطورہ افلاطون کے مکالمے " جمہوریت " میں ملتا ہے ۔ اس مکالمے میں افلاطون نے " مثالی مملکت " کی یعنی کسی خیالی ، مثالی یا جسے دوسرے الفاظ میں یوٹوپیائی مملکت کہا جاتا ہے ، کی تصویر پیش کی ہے ۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ افلاطون ایک ایسی مملکت میں یقین رکھتا تھا جس پر فلسفیوں کی حکومت ہو ۔ وہ اس کی وضاحت انسانی جسم کی ساخت کے حوالے سے کرتا ہے ۔

افلاطون کے مطابق انسانی جسم تین حصوں ـــ سر ، سینے اور پیٹ ـــ پر مشتمل ہوتا ہے ۔ ان تینوں حصوں میں سے ہر ایک کے لیے روح کی کوئی مماثل صلاحیت ہوتی ہے ۔ عقل کا تعلق سر سے ، ارادے کا سینے سے اور اشتہا کا پیٹ سے ہوتا ہے ۔ ان میں سے ہر روحانی صلاحیت کا کوئی " آدرش " یا " حسنہ " بھی ہوتا ہے ۔ عقل حکمت و دانائی کی اور ارادہ جرات کی امنگ کرتا ہے ۔ رہی اشتہا ، تو اسے لگام دی جانا چاہیے تاکہ خورونوش (اور دوسرے معاملوں) میں اعتدال برتا جا سکے ۔ صرف تبھی جب جسم کے تینوں اعضا یک جان ہو کر اپنے وظائف سرانجام دیتے ہیں ، مربوط یا " احسن " فرد وجود میں آتا ہے ۔ سکول میں بچے کو پہلے اپنی اشتہاؤں پر قابو پانا سیکھنا چاہیے ، پھر اسے جرات کی نمو کرنا چاہیے اور آخر میں عقل حکمت و دانائی کا رستہ دکھاتی ہے ۔

افلاطون اب ایک ایسی مملکت کا تصور باندھتا ہے جس کی تعمیر بالکل سہ اعضائی انسانی جسم کی مانند ہوئی ہوتی ہے ۔ جہاں

جسم میں سر ، سینہ اور پیٹ ہوتے ہیں ، مملکت میں حکمران ، معاونین اور محنت کش (مثلاً کسان) پائے جاتے ہیں ۔ یہاں افلاطون صریحاً یونانی طب کو بطور نمونہ استعمال کر رہا ہے ۔ جس طرح مربوط اور " احسن " انسان توازن اور اعتدال برتتا ہے ، اسی طرح " احسن " مملکت کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ہر شخص کو مجموعی صورت حال میں اپنا مقام اور کام معلوم ہوتا ہے۔

افلاطون کے فلسفے کے ہر رخ کی طرح اس کے سیاسی فلسفے کا نمایاں وصف عقلیت پسندی ہے ۔ اچھی مملکت کی تخلیق تبھی ممکن ہے جب اس پر عقل کی حکومت ہو ۔ جس طرح سر (دماغ) جسم پر حکمرانی کرتا ہے ، اسی طرح معاشرے پر حکمرانی فلسفیوں کی ہونا چاہیے۔

انسان اور مملکت کے تینوں حصوں (اعضا) کے مابین تعلق کی وضاحت سادے خاکے سے کی جاسکتی ہے:

جسم	روح	حسنہ	مملکت
سر	عقل	حکمت	حکمران
سینہ	ارادہ	جرات	معاونین
پیٹ	اشتہا	اعتدال	محنت کش

افلاطون کی مثالی مملکت ہندوؤں کے پرانے ذات پات کے نظام سے مختلف نہیں جس میں ہر مرد اور عورت کو کل کے مفاد میں اپنا مخصوص فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے ۔ افلاطون کے عہد سے پہلے ہی ہندوؤں کے ذات پات کے نظام میں معاونین (یا پروہتوں) ، جنگجوؤں (کشتریوں) اور محنت کشوں کے طبقوں کے مابین وہی سہ فریقی تقسیم (5) موجود تھی ۔ شاید موجودہ زمانے میں ہم افلاطون کی مملکت کو یک جماعتی آمریت کہیں گے ۔ تاہم قابل توجہ بات یہ ہے کہ افلاطون کو یقین تھا کہ عورتیں بھی اسی موثر انداز سے حکومت کرسکتی ہیں جس طرح کہ مرد کرتے ہیں اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ حکمران حکومت کا کاروبار اپنی عقل سے چلاتے ہیں ۔ اس کا دعوٰی تھا کہ عورتیں استدلال کی عین مین اپنی

صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوتی ہیں جو مردوں میں پائی جاتی ہیں ۔ شرط صرف یہ ہے کہ انہیں بھی تعلیم وتربیت کے وہی مواقع حاصل ہوں اور انہیں گھر سنبھالنے اور بچے پالنے کے جھنجٹ سے بری الذمہ قرار دے دیا جائے ۔ افلاطون کی مثالی مملکت میں حکمرانوں اور فوجیوں کو خاندانی زندگی اور نجی ملکیت کی اجازت نہیں ۔ بچوں کی پرداخت اور تعلیم وتربیت اتنا اہم فریضہ ہے کہ اسے افراد پر نہیں چھوڑا جاسکتا بلکہ یہ مملکت کی ذمے داری ہونا چاہیے ۔ (افلاطون پہلا فلسفی تھا جس نے سرکاری اہتمام میں نرسری سکولوں کے قیام اور کل وقتی تعلیم کی وکالت کی تھی ۔)

چند زبردست سیاسی دھچکوں کے بعد افلاطون نے "قوانین" (Laws) تحریر کی ۔ اس میں اس نے "آئینی مملکت" (constitu-tional state) کو دوسری بہترین مملکت قرار دیا ۔ اب اس نے نجی ملکیت اور خاندانی روابط کو بحال کردیا ۔ یوں عورتوں کی آزادی مزید محدود ہوگئی ۔ تاہم اس نے یہ ضرور کہا کہ وہ مملکت جو خواتین کی تعلیم وتربیت کا انتظام نہیں کرتی ، اس کی کیفیت اس شخص کی ہوتی ہے جو صرف اپنے دائیں بازو کو ورزش کراتا ہے ۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ جس زمانے میں افلاطون رہتا تھا اگر اسے پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عورتوں کے متعلق اس کا نقطہ نظر مثبت تھا ۔ اپنے مکالمے "سمپوزیم" (Symposium) میں وہ ایک عورت ـــ داستانی پروہتن دائیوتیما (Diotima) ـــ کی عزت افزائی یوں کرتا ہے کہ سقراط اپنی بصیرت کے لیے اسی کا مرہون منت تھا ۔

چنانچہ ، سوفی ، یہ تھا افلاطون ۔ دو ہزار سال سے اوپر بیت چکے ہیں لیکن اس کے حیرت انگیز نظریوں پر بحث ـــ اور نکتہ چینی ـــ ہنوز جاری ہے ۔ جس شخص نے سب سے پہلے یہ کام کیا ، وہ اس کی اپنی ہی اکادمی کا ایک طالب علم تھا ۔ اس کا نام ارسطو تھا اور وہ ایتھنز کا تیسرا عظیم فلسفی تھا ۔

میں مزید کچھ نہیں کہوں گا!

جب سوفی افلاطون کے بارے میں پڑھ رہی تھی ، مشرق کی جانب سورج جنگل کے اوپر بلند ہوچکا تھا - جب وہ یہ پڑھ رہی تھی کہ کس طرح ایک شخص غار کی دیوار پھاند کر باہر آیا اور خیرہ کن روشنی میں اپنی آنکھیں جھپکانے لگا ' اس وقت یہ افق کے اوپر جھانک رہا تھا -

تب اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ خود زیر زمین غار سے باہر نکلی ہو - اسے لگا کہ افلاطون کے متعلق پڑھنے کے بعد وہ فطرت کو بالکل مختلف انداز سے دیکھ رہی ہے - اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے پہلے وہ رنگندھی (colour-blind) تھی - اس نے چند پرچھائیں تو دیکھی تھیں لیکن شفاف امثال نہیں -

وہ وثوق سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ افلاطون نے ابدی نمونوں (patterns) کے متعلق جو کچھ تحریر کیا تھا ' وہ حرف بہ حرف صحیح ہے ' تاہم اس کی یہ سوچ بہت خوبصورت ہے کہ تمام ذی حیات اشیا دنیائے امثال کی ابدی شکلوں کی غیر کامل نقول ہیں - کیا یہ صحیح نہیں کہ تمام پھول ' درخت ' انسان اور حیوان "غیر کامل" ہیں ؟

سوفی کو اپنے گرد و پیش جو کچھ نظر آرہا تھا ' یہ یقین کرنے کے لیے کہ وہ واقعی اتنا ہی حسین اور زندگی سے بھرپور ہے جتنا کہ وہ دکھائی دے رہا ہے ' اسے اپنی آنکھیں ملنا پڑیں - لیکن جو اشیا وہ اب دیکھ رہی تھی '' ان میں سے کسی کو بھی دوام حاصل نہیں تھا - لیکن اس کے باوجود سو سال گزرنے کے بعد بھی یہ پھول اور یہ حیوان دوبارہ یہیں ہوں گے - اگر تمام کے تمام پھول اور تمام کے تمام حیوان فنا اور ذہنوں سے محو ہوجائیں ' پھر بھی کوئی نہ کوئی چیز بچ جائے گی جسے "یاد" آسکے گا کہ یہ سب کچھ کیسے نظر آتا تھا -

سوفی ٹکٹکی باندھ کر دنیا کا جائزہ لے رہی تھی - اچانک کوئی گلہری ایک چیڑ کے درخت پر پھدکنے لگی - اس نے تنے کے آر پار چند چکر لگائے اور پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی -

"میں تمہیں پہلے بھی دیکھ چکی ہوں !" سوفی نے سوچا - اسے احساس ہوا کہ یہ شاید وہی گلہری نہ ہو جو اس نے پہلے کبھی دیکھی تھی لیکن اس نے "شکل" تو یہی دیکھی تھی - کیا معلوم افلاطون یہی کہتا ہو - ممکن ہے کہ وہ حقیقتاً اپنی روح کے انسانی جسم میں مقید ہونے سے پہلے "ابدی" گلہری دیکھ چکی ہو -

کیا یہ بات صحیح ہوسکتی ہے کہ وہ پہلے بھی زندہ تھی ؟ اور کیا یہ بات واقعی سچ

ہے کہ وہ اپنے اندر ایک طلائی ڈلی ـــــ ایک گوہر جو وقت کے ساتھ زنگ آلود نہیں ہوسکتا ـــــ 'ایک روح لیے پھر رہی ہے جو تب بھی زندہ رہے گی جب اس کا جسم بوڑھا ہوجائے گا اور اس جہان سے رخصت ہوجائے گا؟

10۔ میجر کی چوبی کٹیا

* * *

... آئینے میں لڑکی نے دونوں آنکھیں ماریں ...

ابھی صرف سوا سات بجے تھے ۔ گھر بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی ۔ اتوار کو اس کی ماں کو کوئی خاص فکر نہیں ہوتی تھی ، چنانچہ وہ شاید ابھی مزید دو گھنٹے سوئی رہے گی۔

کیا اسے جنگل میں مزید آگے جانا اور البرٹو کنوکس کو تلاش کرنا چاہیے ؟ اور کتا اتنے سفاک انداز سے کھیسیں نکال کر اس پر غرایا کیوں تھا؟

سوفی اٹھی اور اس پگڈنڈی پر چلنے لگی جو ہرمیز نے اختیار کی تھی ۔ اس کے ہاتھ میں خاکی لفافہ تھا جس کے اندر افلاطون کے بارے میں کاغذات تھے ۔ جہاں کہیں پگڈنڈی سے نئی پگڈنڈی نکلتی ، وہ نسبتاً زیادہ چوڑی پگڈنڈی پر ہو لیتی۔

درختوں پر ، فضا میں ، جھاڑیوں میں ، کنجوں میں ہر جگہ پرندے چہچہا رہے تھے۔ وہ اپنے صبح کے مشاغل میں پوری طرح مصروف تھے ۔ انہیں کام کے ایام اور اتوار کے مابین فرق کا کوئی علم نہیں تھا ۔ انہیں یہ سب کچھ کرنا کس نے سکھایا تھا ؟ کیا ان سب کے اندر اپنا اپنا کمپیوٹر لگا ہوا ہے جو انہیں بعض کام کرنے کی ہدایات دیتا رہتا ہے۔

پگڈنڈی اسے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر لے گئی ۔ پھر وہ چیڑ کے بلند و بالا درختوں کے مابین نیچے اتر گئی ۔ اب جنگل اتنا گھنا ہو گیا تھا کہ اس کی آنکھیں صرف چند گز دور تک دیکھ سکتی تھیں۔

اچانک اسے چیڑ کے درختوں کی شاخوں کے بیچ میں کوئی چیز چمکتی نظر آئی ۔ یہ ضرور کوئی چھوٹی جھیل ہوگی ۔ رستہ دوسری طرف سے جاتا تھا لیکن سوفی درختوں کے بیچوں بیچ چلنے لگی ۔ اسے حقیقتاً قطعاً معلوم نہیں تھا کہ اس نے یہ سمت کیوں اختیار کی ہے ۔

جھیل کسی فٹ بال گراؤنڈ سے بڑی نہیں تھی ۔ دوسری جانب اسے برچ (birch) کے روپہلی درختوں کے قریب مختصر سی خالی جگہ پر ایک چوبی کٹیا دکھائی دینے لگی تھی ۔ کٹیا سرخ رنگ کی تھی ۔ چمنی سے دھوئیں کی باریک لکیر اوپر اٹھ رہی تھی ۔

سوفی نیچے اتری اور جھیل کے کنارے پہنچ گئی ۔ جگہ جگہ کیچڑ ہی کیچڑ تھا ، لیکن پھر اسے چپوؤں والی کشتی نظر آگئی ۔ یہ آدھی پانی میں اور آدھی پانی سے باہر تھی ۔ اس میں دو چپو پڑے تھے ۔

سوفی نے نظریں گھما کر اپنے گردوپیش دیکھا ۔ وہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ کرے ، وہ اپنے جوتے بھگونے بغیر جھیل کا چکر کاٹ کر سرخ کٹیا تک نہیں پہنچ سکے گی ۔ وہ دل کڑا کرکے کشتی کے پاس پہنچ گئی اور اس نے اسے پانی میں دھکیل دیا ۔ پھر وہ کشتی پر سوار ہوگئی ، چپو پتوار ٹیک میں پھنسائے اور کشتی کھینے لگی ۔ کچھ ہی دیر میں کشتی دوسرے کنارے جالگی ۔ سوفی نے کنارے پر پاؤں رکھے اور کشتی کو اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کرنے لگی ۔ ادھر کا کنارا دوسرے کنارے کی نسبت زیادہ عمودی تھا (اور یوں وہ کشتی کو پانی سے باہر نہ کھینچ سکی) ۔

اس نے اپنے کندھوں کے اوپر سے صرف ایک مرتبہ اپنی پچھلی جانب سرسری نگاہ ڈالی اور کٹیا کی طرف چل پڑی ۔

اپنی دلیری پر وہ خود ششدر رہ گئی ۔ اس میں یہ ہمت کہاں سے آگئی تھی ؟ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا ۔ بات کچھ یوں تھی جیسے کوئی چیز اسے اکسا رہی ہو ۔

وہ دروازے کے پاس گئی اور دستک دینے لگی ۔ اس نے قدرے انتظار کیا لیکن دروازہ کھولنے کوئی نہ آیا ۔ اس نے ڈرتے جھجکتے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھل گیا ۔

"ہیلو !" وہ پکاری ۔ "کوئی ہے ؟"

وہ اندر چلی گئی ۔ یہ نشستی کمرا تھا ۔ اسے اپنے پیچھے دروازہ بند کرنے کی ہمت نہ ہوئی ۔

بظاہر کوئی شخص یہاں رہائش پذیر تھا ۔ سوفی کو پرانے سٹوو (stove) میں

لکڑی کے چٹخنے کی آواز سنائی دی ۔ لازماً کوئی شخص ابھی ابھی یہاں سے کہیں باہر گیا ہو گا۔

کھانے کی خاصی بڑی میز پر ٹائپ رائٹر ، چند کتابیں ، دو پنسلیں اور کاغذوں کا انبار پڑا تھا ۔ ایک کھڑکی کے قریب ، جو جھیل کی طرف کھلتی تھی ، چھوٹی میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں ۔ ان کے علاوہ کمرے میں مزید کوئی خاص فرنیچر نہیں تھا ۔ ہاں ، ایک پوری دیوار کے ساتھ کتابوں کے شیلف بنے ہوئے تھے ۔ وہ ٹھسا ٹھس کتابوں سے بھرے ہوئے تھے ۔سفید درازوں کی الماری کے اوپر بڑا گول آئینہ لٹک رہا تھا ۔ اس کا فریم پیتل کا تھا اور بہت وزنی تھا ۔ آئینہ بہت پرانا معلوم ہوتا تھا ۔

ایک دیوار پر دو تصویریں لٹک رہی تھیں ۔ ایک روغنی تصویر کسی سفید مکان کی تھی جو کسی خلیج سے ، جس کے ساحل کے عین اوپر کشتیاں رکھنے کی عمارت تھی ، ذرا فاصلے پر تعمیر کیا گیا تھا ۔ مکان اور کشتی گھر کے درمیان باغ تھا ۔ اس میں ایک سیب کا درخت ، چند گھنی جھاڑیاں اور کچھ چٹانیں تھیں ۔ باغ کے چاروں کناروں کے ساتھ ساتھ برچ کے گھنے درخت کچھ اس طرح کھڑے تھے جیسے کسی نے انہیں گجرے میں پرو دیا ہو ۔ تصویر کا عنوان "بجار کلی" (Bjerkely) تھا ۔

اس پینٹنگ کے قریب کسی آدمی کا پورٹریٹ لٹک رہا تھا ۔ وہ دریچے کے قریب بیٹھا تھا اور اس نے اپنی گھٹنوں پر کتاب رکھی ہوئی تھی ۔ اس تصویر میں بھی ایک چھوٹی سی خلیج تھی جس کے پس منظر میں درخت اور چٹانیں تھیں ۔ یہ تصویر کچھ یوں نظر آ رہی تھی جیسے اسے کئی سو سال پہلے بنایا گیا ہو ۔ اس تصویر کا عنوان "بار کلی" (Berkeley) تھا ۔ مصور کا نام سمائی برٹ (1) تھا ۔

بار کلی اور بجار کلی ۔ کتنی عجیب بات ہے !

سوفی نے اپنی تفتیش جاری رکھی ۔ نشستی کمرے کا ایک دروازہ چھوٹے سے باورچی خانے میں کھلتا تھا ۔ وہاں کسی نے ابھی ابھی برتن دھوئے تھے ۔ رکابیاں اور گلاس صافی پر رکھے ہوئے تھے اور ان میں سے بعض پر ابھی تک صابن ملے پانی کے قطرے چمک رہے تھے ۔ فرش پر ٹین کا پیالہ پڑا تھا ۔ اس میں بچے کھچے کھانے کے بھورے پڑے تھے ۔ جو کوئی بھی یہاں رہتا تھا ، اس کے پاس کوئی پالتو جانور ـــــ کتا یا بلی ـــــ تھا ۔

سوفی واپس نشستی کمرے میں چلی گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی ۔ ایک

اور دروازہ تنگ سی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔ پلنگ کی پرلی جانب فرش پر دو کمبل بصورت بنڈل پڑے تھے۔ سوفی کو کمبلوں کے اوپر چند سنہری بال نظر آئے۔ تو یہ رہا ثبوت! اب سوفی کو معلوم ہو گیا کہ اس کٹیا کے مکین البرٹو کنوکس اور ہرمیز ہیں۔

سوفی ایک بار پھر نشستی کمرے میں چلی گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ شیشہ بے آب تھا اور اس میں خراشیں پڑی ہوئی تھیں، اور اسی نسبت سے اسے اپنا عکس دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ جس طرح وہ اپنے کمرے میں کرتی تھی، یہاں بھی وہ اپنا منہ بگاڑ کر اور زبان باہر نکال کر اپنا مضحکہ آپ اڑانے لگی۔ اس کا عکس بھی حسب توقع عین مین اس کی نقالی کر رہا تھا۔

لیکن ایکا ایکی ایک قدرے ڈراؤنا واقعہ پیش آگیا۔ صرف ایک مرتبہ —— اور وہ بھی پلک جھپکانے کے دوران میں —— سوفی نے دیکھا کہ آئینے کی لڑکی نے اپنی دونوں آنکھیں مار کر اس کی طرف دیکھا ہے۔ سوفی خوف کے عالم میں پیچھے ہٹ گئی۔ اگر اس نے خود آنکھ ماری ہوتی، —— وہ دوسری لڑکی کو آنکھ مارتے کیسے دیکھ سکتی تھی؟ یہی نہیں۔ کچھ یوں لگا تھا جیسے دوسری لڑکی سوفی کو آنکھ مار کر اس سے کہنا چاہتی ہو: "سوفی، میں تمہیں دیکھ سکتی ہوں۔ میں یہاں ہوں، اس طرف۔"

سوفی کو محسوس ہوا کہ اس کا دل دھڑک رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے کچھ فاصلے پر کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ ہرمیز! اسے فوراً یہاں سے نکلنا ہو گا۔ اتنے میں اسے آئینے کے نیچے دراز دار الماری کے اوپر سبز رنگ کا بٹوا پڑا نظر آیا۔ اس میں ایک سو کراؤن کا نوٹ، ایک پچاس کا، اور ایک سکول کا شناختی کارڈ تھا۔ کارڈ پر کسی لڑکی کی تصویر تھی جس کے بال ہلکے رنگ کے تھے۔ تصویر کے نیچے لڑکی کا نام تھا: ہلڈے مولر کنیگ...

سوفی پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ اسے دوبارہ کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ اسے فوراً نکلنا ہو گا!

جب وہ تیز تیز قدموں میز کے برابر سے گزر رہی تھی، اسے کتابوں اور کاغذوں کے انبار میں ایک سفید لفافہ نظر آگیا۔ اس پر ایک لفظ تحریر تھا: سوفی۔

پیشتر اس کے کہ وہ سمجھ پاتی کہ وہ کیا کر رہی ہے، اس نے لفافے پر جھپٹا مارا اور اسے خاکی لفافے میں افلاطون کے متعلق کاغذوں میں گھسیڑ دیا۔ پھر وہ بجلی کی رفتار سے بھاگتی دروازے سے باہر نکل گئی لیکن جاتے جاتے اسے دھماکے سے بند کر گئی۔

بھونکنے کی آواز قریب تر آتی جارہی تھی لیکن بدترین بات یہ تھی کہ کشتی غائب ہوچکی تھی ۔ ایک دو سیکنڈ بغور دیکھنے کے بعد یہ اسے جھیل کے عین درمیان میں ڈولتی نظر آئی ۔ ایک چپو اس کے قریب تیر رہا تھا ۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کیونکہ وہ اسے کھینچنے اور خشکی پر ٹکانے میں ناکام رہی تھی ۔ اب اسے کتا بالکل ہی قریب بھونکتا سنائی دیا اور جھیل کی دوسری جانب درختوں کے بیچ حرکات بھی دکھائی دیں ۔

سوفی نے مزید توقف نہ کیا ۔ بڑا لفافہ ہاتھ میں پکڑے وہ کٹیا کے پیچھے جھاڑیوں میں گھس گئی ۔ کچھ ہی دیر میں اسے دلدلی زمین پر چلنا پڑا اور کئی بار تو وہ ٹخنوں ٹخنوں گیلی مٹی میں دھنس گئی ۔ لیکن اسے چلتے رہنا تھا ۔ اسے گھر پہنچنا تھا ۔

کچھ ہی دیر میں اسے غیر متوقع طور پر پگڈنڈی مل گئی ۔ کیا یہ وہی پگڈنڈی تھی جس پر چل کر وہ ادھر آئی تھی ؟ وہ اپنے کپڑے نچوڑنے کے لیے رک گئی ۔ پھر اس کے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ۔

اس سے یہ حماقت کیسے سرزد ہوگئی ؟ بدترین معاملہ کشتی کا تھا ۔ اس سے یہ منظر بھلایا نہیں جاتا تھا کہ کشتی جھیل کے بیچوں بیچ جھول رہی ہے اور اس کے قریب ایک چپو بے چارگی سے تیر رہا ہے ۔ یہ سب کچھ کتنا شرمناک ، کتنا خفت انگیز تھا . . .

فلسفے کا استاد اب غالباً جھیل کے قریب پہنچ گیا ہوگا ۔ اسے گھر پہنچنے کے لیے کشتی کی ضرورت پیش آئے گی ۔ سوفی کو قریب قریب محسوس ہورہا تھا کہ وہ مجرم ہے ۔ لیکن اس نے جو کچھ کیا تھا ، عمداً نہیں کیا تھا ۔

لفافہ ! یہ معاملہ غالباً اور بھی بدتر تھا ۔ وہ اسے اٹھا کیوں لائی ہے ؟ محض اس لیے کہ اس پر اس کا نام تحریر تھا اور یوں ایک لحاظ سے وہ اسی کا تھا ۔ لیکن اس استدلال کے باوجود وہ اپنے آپ کو چور محسوس کر رہی تھی ۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اس نے ثبوت فراہم کردیا تھا کہ وہاں جو شخص گیا تھا ، وہ وہ تھی ۔

سوفی نے لفافے میں سے رقعہ نکالا ۔ اس پر تحریر تھا :

پہلے کون وجود میں آیا —— چوزہ یا "مثالی" چوزہ ؟
کیا ہم خلقی "امثال" (ideas) کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں ؟
پودے ، حیوان اور انسان کے مابین کیا فرق ہے ؟
بارش کیوں ہوتی ہے ؟

اچھی زندگی گزارنے کے لیے کیا چاہیے؟

سوفی فی الحال اس حالت میں نہیں تھی کہ وہ ان سوالوں کے متعلق کچھ سوچ سکتی تاہم اس نے فرض کر لیا کہ ان کا کچھ نہ کچھ تعلق اگلے فلسفی سے ہے۔ اس کا نام ارسطو تو نہیں؟

جنگل میں اتنی دور دوڑنے کے بعد جب اسے باڑ نظر آئی' اس کی کیفیت اس شخص کی تھی جو جہاز کی غرقابی کے بعد تیر کر ساحل پر پہنچتا ہے۔ دوسری طرف سے باڑ مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔

جب تک وہ رینگتے رینگتے اپنے خفیہ ٹھکانے نہ پہنچ گئی' اس نے گھڑی پر نظر تک نہیں ڈالی تھی۔ اب اس نے دیکھا کہ صبح کے ساڑھے دس بج چکے ہیں۔ اس نے بڑا لفافہ دوسرے کاغذات کے ساتھ بسکٹوں کے ڈبے میں رکھ دیا اور رقعہ' جس پر نئے سوالات درج تھے' اپنی تنگ پتلون کی ٹانگ میں گھسیڑ لیا۔

جب وہ گھر پہنچی' اس کی امی ٹیلی فون سے چمٹی ہوئی تھی۔ جونہی اس کی نظر سوفی پر پڑی' اس نے جلدی سے چونگا نیچے رکھ دیا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"میں ... میں ذرا جنگل میں ... گھومنے چلی گئی تھی۔" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔"

سوفی چپ چاپ کھڑی اور اپنے کپڑوں سے پانی کے قطرے نچڑتے دیکھتی رہی۔

"میں نے جو آنا کو ٹیلی فون کیا تھا۔ . ."

"جو آنا؟"

اس کی امی چند خشک کپڑے لے آئی۔ سوفی نے بڑی مشکل سے فلسفی کا رقعہ چھپایا۔ پھر وہ دونوں باورچی خانے میں بیٹھ گئیں۔ اس کی امی نے چاکلیٹ کا گرم مشروب بنایا۔

"تم اس کے پاس گئی تھیں؟" اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"اس کے پاس؟"

سوفی کے ذہن میں محض اپنا فلسفے کا استاد آرہا تھا۔

"ہاں ،اس کے پاس۔ وہی۔ ۔ ۔ تمہارا خرگوش!"

سوفی نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"سوفی ، جب تم آپس میں ملتے ہو ، تم کرتے کیا ہو؟ یہ تمہارے کپڑے اتنے گیلے کیوں ہو رہے ہیں؟"

سوفی بیٹھی گمبھیر انداز سے میز کو گھور گھور کر دیکھتی رہی۔ لیکن اپنے قلب کی گہرائیوں میں وہ ہنس رہی تھی۔ بے چاری امی۔ اب اسے نئی فکر لگ گئی ہے۔

اس نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ پھر اس پر مزید سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔

"میں سچ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ تم ساری رات باہر رہی ہو؟ تم کپڑے تبدیل کئے بغیر کیوں سو گئی تھیں؟ جب میں سوئی تھی ، تم اسی وقت چپکے سے باہر نکل گئی تھیں؟ سوفی ، تم ابھی صرف چودہ سال کی ہو۔ میں تم سے پوچھ سکتی ہوں کہ تم کس سے ملاقاتیں کرتی پھر رہی ہو!"

سوفی رونے لگی۔ پھر اس کی زبان چل پڑی اور وہ بولنے لگی۔ وہ ابھی تک خوف زدہ تھی ،اور جب آدمی خوف زدہ ہو ،وہ عام طور پر باتیں کرنے لگتا ہے۔

اس نے بتایا کہ اس کی تڑکے آنکھ کھل گئی تھی اور وہ جنگل میں گھومنے نکل گئی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو چوبی کٹیا ، کشتی اور پراسرار آئینے کے متعلق بتایا۔ لیکن اس نے مراسلات کے ذریعے خفیہ نصاب کی تعلیم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اور نہ اس نے سبز رنگ کے بٹوے کا کوئی ذکر کیا۔ یہ تو اسے معلوم نہیں تھا کہ اس نے بٹوے کا ذکر کرنا کیوں مناسب خیال نہ کیا ، لیکن وہ ہلڈے کے متعلق کچھ بتا بھی تو نہیں سکتی تھی۔

سوفی کی امی نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور سوفی سمجھ گئی کہ اس کی ماں نے اس کی باتوں پر اعتبار کر لیا ہے۔

"میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں۔" سوفی نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے ویسے ہی کہہ دیا تھا کیونکہ آپ خرگوش کے بارے میں پریشان ہو گئی تھیں۔"

"تم واقعی اتنی دور میجر کی کٹیا میں گئی تھیں۔ ۔ ۔" اس کی ماں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میجر کی کٹیا؟" سوفی حیرانی سے ٹکٹکی باندھ کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔
"جنگل کی کٹیا میجر کی کٹیا کہلاتی ہے کیونکہ چند سال پیشتر ایک میجر وہاں کچھ عرصہ رہائش پذیر رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کچھ عجیب سا بلکہ جنونی سا آدمی تھا۔ لیکن خیر چھوڑو۔ جب سے وہ گیا ہے کٹیا خالی پڑی ہے۔"
"مگر اب یہ خالی نہیں ہے! وہاں اب کوئی فلسفی رہتا ہے"
بس بس، چپ کرو۔ طوطے مینا بنانا چھوڑ دو۔"
سوفی اپنے کمرے میں چلی گئی اور جو کچھ ہوا تھا، اس کے متعلق بیٹھی سوچتی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا سر کوئی چنگھاڑتا دہاڑتا سرکس ہو جو جھومتے جھامتے ہاتھیوں، احمق مسخروں، رسی پر چلنے والے نڈر نٹوں اور تربیت یافتہ بندروں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن ایک تصویر ـــــ جنگل کے عین درمیان میں جھیل کی سطح پر ڈولتی کشتی اور اس کے قریب تیرتا چپو ـــــ مسلسل اس کے ذہن میں گھومتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی ایک شخص کا تصور بھی بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آرہا تھا جسے گھر پہنچنے کے لیے کشتی کی ضرورت تھی۔
اسے یقین تھا کہ فلسفے کا استاد اسے کوئی ضرر نہیں پہنچانا چاہتا اور اگر اسے معلوم ہوگیا کہ وہ اس کی کٹیا میں گئی تھی، وہ اسے معاف کردے گا۔ اسے سوفی کو فلسفے کی تعلیم دینے کا بس یہی معاوضہ ملنا ہے۔ وہ اس کی تلافی کیسے کرسکتی ہے؟
سوفی نے گلابی کاغذ نکالا اور لکھنے لگی:

محترم فلسفی صاحب، اتوار کو صبح سویرے آپ کی رہائش گاہ میں جو شخص داخل ہوا، وہ میں تھی۔ مجھے آپ سے ملاقات کرنے اور چند فلسفیانہ مسائل کے متعلق گفتگو کرنے کی شدید خواہش تھی۔ فی الحال میں افلاطون کی پرستار ہوں۔ تاہم انہوں نے کسی دوسری دنیا میں امثال یا نمونے کی تصویروں کی موجودگی کا جو ذکر کیا ہے "میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے صحیح کہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ (چیزیں) ہماری روحوں میں موجود ہیں لیکن میرا خیال ہے ـــــ کم از کم فی الحال ـــــ کہ یہ مختلف چیز ہے۔ مجھے یہ بھی اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ مجھے پوری طرح یقین نہیں آرہا کہ روح غیر فانی ہوسکتی

ہے ۔ ذاتی طور پر مجھے اپنی سابقہ زندگیوں کے بارے میں کچھ یاد نہیں ۔ اگر آپ مجھے یقین دلا سکیں کہ میری مرحوم دادی کی روح امعال کی دنیا میں شانت ہے تو میں بہت ممنون ہوں گی ۔

درحقیقت میرے اس خط (جب میں اسے گلابی لفافے میں ڈالوں گی ، میں اس کے ساتھ شکر کی ڈلی بھی رکھ دوں گی) کے لکھنے کا محرک کوئی فلسفیانہ وجوہ نہیں تھیں ۔ میں کہنا صرف یہ چاہتی تھی کہ میں نے آپ کی جو نافرمانی کی ہے ، میں اس پر بہت نادم ہوں ۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ کشتی کو خشکی پر پہنچا دوں لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ کام میری ہمت سے بڑا تھا ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی بڑی لہر آئی ہو اور کشتی کو اپنے ساتھ بہا لے گئی ہو ۔

مجھے امید ہے کہ آپ اپنے پاؤں گیلے کئے بغیر واپس گھر پہنچ گئے ہوں گے ۔ اگر آپ ایسا نہیں کرسکے تو آپ کے اطمینان کے لیے میں یہ عرض کئے دیتی ہوں کہ میرا حال بھی خاصا پتلا ہوا ۔ میں پوری طرح بھیگ گئی اور غالباً اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں نزلے میں مبتلا ہو جاؤں گی ۔ لیکن یہ میرا اپنا قصور ہو گا ۔

میں نے آپ کے مکان میں کسی چیز کو نہیں چھیڑا تھا
تاہم ندامت کے ساتھ اتنا عرض کرتی ہوں کہ میز پر جو لفافہ پڑا
تھا ، میں اسے اٹھانے سے باز نہ رہ سکی ۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ
میں کچھ چرانا چاہتی تھی لیکن چونکہ اس پر میرا نام لکھا ہوا تھا ،
افراتفری کی حالت میں مجھے خیال آیا کہ یہ میرا ہے ۔ بہرحال مجھ
سے جو کچھ ہوا ، میں اس پر واقعی اور صحیح معنوں میں شرمندہ
ہوں ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ میں کبھی آپ کو مایوس نہیں
کروں گی ۔

پس نوشت : میں تمام نئے سوالات پر پوری توجہ سے غور
کروں گی اور میں یہ کام ابھی شروع کر رہی ہوں ۔

پس پس نوشت : درازدار الماری کے اوپر پیتل کے فریم
میں جو آئینہ لٹک رہا ہے ، وہ عام آئینہ ہے یا طلسمی ؟ میں یہ محض
اس لیے پوچھ رہی ہوں کیونکہ میں نے اپنے عکس کو کبھی دونوں
آنکھیں مارتے نہیں دیکھا ۔

پرخلوص انداز سے دلچسپی لینے والی شاگرد کی طرف سے

سلام۔ سوفی

سوفی نے لفافے میں ڈالنے سے پہلے دو مرتبہ خط پڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ گزشتہ خط کی نسبت یہ کم رسمی انداز سے لکھا گیا ہے۔ شکر کی ڈلی لانے کے لیے باورچی خانے میں جانے سے پہلے اس نے اس رقعے پر نظر ڈالی جس پر اس دن کے سوال درج تھے۔

"پہلے کون وجود میں آیا ـــــ چوزہ یا 'مثالی' چوزہ؟"

یہ سوال اتنا ہی پیچ دار تھا جتنا کہ چوزے یا انڈے کا پرانا معما۔ انڈے کے بغیر چوزہ پیدا نہیں ہوسکتا اور مرغی نہ ہو تو انڈا کہاں سے آئے گا۔ پہلے اس دنیا کا چوزہ وجود میں آیا یا "مثالی "دنیا کا' کیا یہ سوال بھی واقعی اتنا ہی دشوار ہے؟ سوفی سمجھ گئی کہ افلاطون کا مطلب کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چوزوں کے اس حواسی دنیا میں وجود میں آنے سے بہت پہلے "مثالی "چوزہ موجود تھا۔ افلاطون کے مطابق روح جسم میں ٹھکانا اختیار کرنے سے پہلے "مثالی "چوزہ "دیکھ چکی تھی۔ لیکن کیا یہ وہی بات نہیں جس میں سوفی کے خیال کے مطابق افلاطون نے ٹھوکر کھائی تھی؟ جس شخص نے پہلے کبھی جیتا جاگتا چوزہ یا چوزے کی تصویر تک نہ دیکھی ہو اس کے ذہن میں چوزے کا "تصور" یا "مثال" کیسے آسکتی ہے؟ اس سے اس کا دھیان اگلے سوال کی طرف منتقل ہوگیا:

"کیا ہم خلقی 'امثال' (ideas) کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں؟"

"بالکل ناقابل قیاس۔ "سوفی نے سوچا۔ اس کے تصور میں یہ بات آ ہی نہیں رہی تھی کہ نومولود بچہ بطور خاص امثال سے لیس ہوتا ہے۔ بظاہر تو یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس حقیقت کا کہ بچہ گویائی کی قوت سے محروم ہوتا ہے لازماً مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ذہن میں کوئی خیال ہوتا ہی نہیں۔ لیکن یہ بات بھی تو یقینی ہے کہ اشیا کے متعلق کچھ جاننے سے پہلے ہمیں دنیا میں انہیں دیکھنا پڑتا ہے۔

"پودے' حیوان اور انسان کے مابین کیا فرق ہے؟ "سوفی کو فوراً ہی بہت واضح اختلافات نظر آنے لگے۔

مثلاً وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پودے کی کوئی بہت پیچیدہ جذباتی زندگی ہوسکتی ہے۔ کس نے کبھی کسی ایسے سوسن کے پھول کا سنا ہے جس کا دل

ٹوٹ چکا ہو؟ پودا پیدا ہوتا ہے، صحت بخش غذا حاصل کرتا ہے، بڑھتا اور پھلتا پھولتا ہے، اور بیج بناتا ہے تاکہ وہ اپنی نسل کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ پودوں کے متعلق آدمی یہی کچھ جان سکتا ہے۔ سوفی اس نتیجے پر پہنچی کہ ہر وہ چیز جس کا اطلاق پودوں پر ہوتا ہے، جانوروں اور انسانوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن جانوروں میں دوسرے اوصاف بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ حرکت کرسکتے ہیں۔ (کیا کبھی کسی نے گلاب کے پھول کو کسی لمبی دوڑ میں حصہ لیتے دیکھا ہے؟) جانوروں اور انسانوں کے مابین فرق کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ انسان سوچ سکتے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ جانور نہیں سوچتے؟ سوفی کو پختہ یقین تھا کہ اس کی بلی شیری کان سوچ سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے: کیا وہ فلسفیانہ مسائل کے متعلق غور و فکر کرسکتی ہے؟ کیا بلی پودے، جانور اور انسان کے مابین فرق کے متعلق قیاس آرائی کرسکتی ہے؟ شاید نہیں! بلی شاد یا ناشاد تو ہوسکتی ہے لیکن کیا کبھی اس نے اپنے آپ سے پوچھا کہ خدا موجود ہے یا اس کے اندر کوئی غیر فانی روح ہے؟ سوفی کے خیال کے مطابق یہ مسئلہ انتہائی مشکوک ہے۔ لیکن یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوا جو نومولود بچے اور خلقی امثال و تصورات کے سلسلے میں پیدا ہوا تھا۔ کسی بلی کے ساتھ اس قسم کے سوالوں کے متعلق گفتگو کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ نومولود بچے کے ساتھ۔

"بارش کیوں ہوتی ہے؟" سوفی اپنے کندھے اچکانے لگی۔ شاید بارش اس لیے ہوتی ہے کیونکہ سمندر کا پانی بھاپ بن کر اڑتا رہتا ہے اور بادل کثیف ہوکر بارش کے قطروں کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ کیا اس نے تیسری جماعت میں یہ سب کچھ نہیں پڑھا تھا؟ البتہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بارش اس لیے ہوتی ہے تاکہ پودوں اور جانوروں کی نشوونما ہوسکے۔ لیکن کیا یہ جواب واقعی صحیح ہے؟ بارش کا جو چھینٹا پڑتا ہے، کیا اس کا واقعی کوئی مقصد ہوتا ہے؟

آخری سوال کا صریحاً مقصد سے کوئی تعلق تھا۔ "اچھی زندگی گزارنے کے لیے کیا چاہیے؟"

فلسفی نے نصاب کے بالکل آغاز میں اس کے متعلق کچھ لکھا تھا۔ ہر شخص کو غذا، حرارت، محبت اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہرحال یہ بنیادی اشیا اچھی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ پھر فلسفی نے اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ بعض فلسفیانہ سوال سامنے آتے رہتے ہیں اور لوگوں کو ان کے جواب تلاش کرنے کی

ضرورت پیش آتی ہے ۔ غالباً یہ بات بھی خاصی اہم ہے کہ آدمی کے پاس اپنی روزی کمانے کے لیے اپنی پسند کا کام ہو ۔ مثلاً آپ کو ٹریفک سے نفرت ہے اور پیشہ آپ نے ٹیکسی ڈرائیور کا اختیار کرلیا ' پھر آپ خوش کیسے رہ سکیں گے ؟ اور اگر آپ کو سکوں کا کام گھر پر کرنے سے نفرت ہے ' پھر غالباً تدریس کے شعبے سے منسلک ہونا اچھا ثابت نہیں ہوگا ۔ سوفی کو جانوروں سے پیار تھا اور وہ جانوروں کے امراض کی معالج بننا چاہتی تھی ۔ بہرحال اس کا قطعاً یہ خیال نہیں تھا کہ آدمی کو اچھی زندگی گزارنے کے لیے لاٹری میں دس لاکھ کا انعام ضرور جیتنا چاہیے ۔

غالباً صحیح بات اس کے بالکل برعکس ہے ۔ ایک کہاوت ہے : بیکار ہاتھوں کے لیے شیطان کام ڈھونڈ لیتا ہے ۔

جب تک سوفی کی امی نے اسے دوپہر کے پر تکلف کھانے کے لیے نیچے نہ بلایا وہ اپنے کمرے میں ہی بیٹھی رہی ۔ جب وہ نیچے گئی میز پر گائے کی پٹھ کے سٹیک (steak) ' بھنے ہوئے آلو ' رس بھریاں اور کریم میز پر سجی ہوئی تھی ۔

وہ ہر قسم کے موضوعات پر باتیں کرتی رہیں ۔ سوفی کی امی جاننا چاہتی تھی کہ وہ اپنی پندرھویں سال گرہ کس طرح منانا چاہتی ہے ۔ اس میں اب صرف چند ہی ہفتے رہ گئے تھے ۔

سوفی نے کندھے اچکا دیے ۔

" تم کسی کو بلانا نہیں چاہتیں ؟ میرا مطلب ہے تم پارٹی وارٹی نہیں کرنا چاہتیں ؟"

"شاید ۔"

" ہم مارتھا اور این میری . . . اور ہیلن کو بلا سکتے ہیں ۔ اور رہی جوآنا ' وہ تو آئے گی ہی ۔ اور شاید جیرمی کو بلانے میں بھی کوئی ہرج نہیں ۔ لیکن کرنا کیا ہے ' اس کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے ۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے اپنی پندرھویں سال گرہ خوب اچھی طرح یاد ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے گزرے کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا ۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میں تو خاصی جوان ہوگئی ہوں ۔ ہے نا عجیب بات ' سوفی ! مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کے بعد مجھ میں بالکل کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔"

" نہیں ۔ آپ تبدیل نہیں ہوئیں ۔ کوئی چیز تبدیل نہیں ہوئی ۔ صرف اتنا ہوا کہ آپ بڑی ہوگئیں ' آپ کی عمر بڑھ گئی . . ."

"چپ۔ کیا پاگلوں کی سی باتیں کرنے لگی ہو۔ میں صرف یہی سوچتی ہوں کہ
یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا۔"

11۔ ارسطو

*　*　*

... ایک دقیقہ رس تنظیم کار جو ہمارے تصورات کی دھندلاہٹ دور کرنا چاھتا تھا ...

جب سہ پہر کے وقت سوفی کی امی قیلولہ کر رہی تھی، سوفی اپنے خفیہ ٹھکانے چلی گئی۔ اس نے لفافے میں شکر کی ڈلی رکھ دی تھی اور اس کے باہر "برائے البرٹو" لکھ دیا تھا۔

کوئی نیا خط نہیں آیا تھا لیکن چند منٹ بعد سوفی کو کتے کی آہٹ سنائی دی۔

"ہرمیز!" اس نے آواز دی اور اگلے لمحے وہ جھاڑیوں کو دھکیلتا خفیہ ٹھکانے پہنچ گیا۔ اس کے منہ میں خاکی لفافہ تھا۔

"شاباش!" سوفی نے اپنا بازو کتے کے گلے میں حمائل کر دیا جو کسی وال رس (walrus) کی طرح سوں سوں اور زوں زوں کر رہا تھا۔ اس نے گلابی لفافہ اٹھایا اور کتے کے منہ میں رکھ دیا۔ وہ رینگتا رینگتا باڑ سے باہر نکلا اور جنگل میں بھاگنے لگا۔

سوفی نے ڈرتے ڈرتے بڑا لفافہ کھولا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس میں کٹیا اور کشتی کا کوئی ذکر تو نہیں۔

لفافے میں حسبِ معمول ٹائپ شدہ کاغذات تھے جنہیں کلپ (clip) سے نتھی کر دیا گیا تھا۔ لیکن اندر ایک ورق علیحدہ بھی تھا۔ اس پر تحریر تھا:

ڈیر مس جاسوس بلکہ صحیح تر مس نقب زن : یہ معاملہ پہلے ہی پولیس کے حوالے کیا جاچکا ہے ۔ دراصل ، ایسی کوئی بات نہیں ۔ نہیں ، میں تم سے ناراض نہیں ہوں ۔ جب فلسفے کے معموں کے جواب ڈھونڈنے کا مسئلہ پیدا ہوگا ، اگر تم نے ان کے معاملے میں بھی اتنے ہی تجسس کا مظاہرہ کیا تو میں کہوں گا کہ تمہاری مہم خاصی امید افزا تھی ۔ بس معمولی سی پریشانی کی بات یہ ہے کہ اب مجھے یہاں سے کوچ کرنا ہوگا ۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اس کے لیے مجھے کسی دوسرے کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو قصور وار ٹھہرانا ہوگا ۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ تم وہ لڑکی ہو جو ہمیشہ بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتی ہے ۔

آداب ، البرٹو ۔

سوفی نے اطمینان کی سانس لی ۔ تو فلسفی اس سے ناراض نہیں تھا ۔ لیکن اسے مکان بدلنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟

اس نے کاغذات اٹھائے اور اپنے کمرے میں بھاگ گئی ۔ دور اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ جب اس کی امی جاگے وہ گھر پر ہی ہو ۔ وہ آرام سے اپنے بستر پر لیٹ گئی اور ارسطو کے متعلق پڑھنے لگی ۔

فلسفی اور سائنس دان

ڈیر سوفی ، تمہیں شاید افلاطون کے نظریہ امثال پر حیرانی ہوئی ہوگی ۔ لیکن اس معاملے میں تم اکیلی نہیں ہو ! مجھے معلوم نہیں کہ تم نے ساری باتیں آنکھیں بند کرکے صحیح تسلیم کرلی تھیں ـــــ یا تمہیں اس کی بعض باتوں پر اعتراض تھا ۔ اگر تمہیں واقعی کوئی اعتراض تھا ، تو یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی ۔ خاطر جمع رکھو کہ ارسطو (384 ق م تا 322 ق م) نے بھی ، جو تقریباً بیس سال افلاطون کی اکادمی میں طالب علم رہا تھا ، بالکل اسی قسم کے اعتراضات کئے تھے ۔

افلاطون ارسطو کا آبائی شہر نہیں تھا ۔ وہ مقدونیہ میں پیدا ہوا تھا اور جب وہ اکادمی میں داخل ہوا ، افلاطون اکسٹھ کے پیٹے میں داخل ہو چکا تھا ۔ ارسطو کا باپ معزز طبیب ـــــ اور یوں سائنس دان ـــــ تھا ۔ ارسطو کا یہ پس منظر ہمیں اس کے سائنسی پراجیکٹ کے متعلق بعض معلومات فراہم کرتا ہے ۔ اسے جس چیز میں سب سے زیادہ دلچسپی تھی ، وہ فطرت کا مطالعہ تھا ۔ وہ نہ صرف یونان کا آخری عظیم سائنس دان تھا بلکہ یورپ کا پہلا عظیم ماہر حیاتیات (biologist) بھی تھا۔

اگر معاملے کو انتہا تک پہنچا دیا جائے ہم کہہ سکتے ہیں کہ افلاطون اپنی ابدی شکلوں یا " امثال " میں اتنا منہمک تھا کہ فطرت میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں ، اس نے ان پر کوئی خاص دھیان نہ دیا ۔ اس کے برعکس ارسطو کی ساری توجہ انہی تبدیلیوں پر تھی جنہیں ہم آج کل کی زبان میں فطرت کی عمل کاریاں (processes) کہہ سکتے ہیں۔

اگر مزید مبالغہ آرائی سے کام لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ افلاطون نے حواسی دنیا کی طرف پیٹھ پھیر لی اور ہمیں اپنے گردوپیش جو کچھ نظر آتا ہے اس سے آنکھیں چرا لی تھیں ۔ (وہ غار سے فرار ہونا اور امثال کی ابدی دنیا میں جھانکنا چاہتا تھا ۔) ارسطو نے اس کے برعکس متضاد رویہ اختیار کیا ۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر جھک گیا اور مینڈکوں اور مچھلیوں ، گل بادنے ہوا (anem-ones) اور پوستوں (poppies) کا مطالعہ کرنے لگا۔

افلاطون نے اپنی عقل کا استعمال کیا تھا لیکن ارسطو نے اپنے حواس سے بھی کام لیا۔

ہمیں دونوں کے مابین فیصلہ کن اختلافات نظر آتے ہیں اور یہ اختلافات ان کی تحریروں میں واضح طور پر پائے جاتے ہیں ۔ افلاطون شاعر مزاج اور اسطوروں (myths) کا شیدائی تھا ۔ ارسطو کا طرز تحریر انسائیکلوپیڈیا کی طرح خشک اور غیر مبہم تھا ۔ تاہم اس نے جو کچھ لکھا ، وہ اس کے موقع پر مطالعے کا نچوڑ اور تازہ ترین معلومات پر مبنی تھا۔

مفروضہ طور پر ارسطو نے جو کتابیں تحریر کی تھیں ، عہد

متی کے ریکارڈ کے مطابق ان کی تعداد ستر تک پہنچتی تھی ۔ ان میں سے سینتالیس محفوظ رہیں ۔ یہ مکمل کتابیں نہیں ہیں ، زیادہ تر لیکچر نوٹس پر مشتمل ہیں ۔ اس کے زمانے میں فلسفہ ابھی تک زبانی کاروبار تھا۔

یورپی کلچر میں ارسطو کو جو اہم مقام حاصل ہے ، اس کی وجہ (اور یہ کوئی معمولی وجہ نہیں) یہ ہے کہ اس نے جو اصطلاحات وضع کیں سائنس دان آج بھی انہیں استعمال کرتے ہیں ۔ وہ عظیم تنظیم کار تھا ۔ اس نے مختلف علوم (sciences) کی بنیاد رکھی اور ان کی درجہ بندی کی۔

چونکہ ارسطو نے تمام علوم کے متعلق تحریریں چھوڑی ہیں ، میں ان میں سے صرف چند اہم ترین کا ذکر کرسکوں گا ۔ چونکہ میں تمہیں افلاطون کے بارے میں اتنا کچھ بتا چکا ہوں ، تمہیں آغاز میں ہی معلوم ہوجانا چاہیے کہ ارسطو نے کس طرح افلاطون کے نظریہ امثال کا ابطال کیا تھا ۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ اس نے کس طرح اپنا فلسفہ فطرت تشکیل کیا کیونکہ یہ ارسطو ہی تھا جس نے اپنے پیش رو فطرتی فلسفیوں کے خیالات کی تلخیص پیش کی تھی ۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ اس نے کس طرح ہمارے تصورات کی درجہ بندی کی اور منطق کے مضمون کی بطور سائنس بنیاد رکھی ۔ اور آخر میں میں انسان اور معاشرے کے متعلق اس کے نظریے کی مختصراً تشریح کروں گا۔

خلقی خیالات کی نفی

اپنے پیش رو فلسفیوں کی طرح افلاطون تمام تغیرات کے مابین ابدی اور تغیر نا آشنا (چیز) تلاش کرنا چاہتا تھا ۔ چنانچہ اسے کامل اور بے عیب امثال (ideas) مل گئے جو حواسی دنیا سے برتر تھے ۔ مزید برآں افلاطون کا دعوٰی تھا کہ امثال فطرت کے تمام مظاہر سے کہیں زیادہ حقیقی ہیں ۔ پہلے "مثالی" گھوڑا آیا ۔ اس کے بعد دنیائے حواس کے تمام گھوڑے کسی غار کی پرچھائیوں

کی طرح ذکی چال چلتے نمودار ہوئے ۔ "مثالی" چوزہ چوزے اور انڈے دونوں سے پہلے وجود میں آیا۔

ارسطو کا خیال تھا کہ افلاطون نے ہر چیز اوندھی کر دی ہے ۔ وہ اپنے استاد کی اس بات سے متفق تھا کہ خاص گھوڑا "بہتا" ہے اور کوئی گھوڑا ہمیشہ زندہ نہیں رہتا ۔ وہ اس بات سے بھی اتفاق کرتا تھا کہ گھوڑے کی اصلی شکل ابدی اور تغیر نا آشنا ہے ۔ لیکن "مثالی" گھوڑا محض تصور ہے جو ہم انسانوں نے گھوڑوں کی خاص تعداد دیکھنے کے بعد گھڑ لیا ہے ۔ چنانچہ "مثالی" یا "شکلی" گھوڑے کا اپنا کوئی وجود نہیں ۔ ارسطو سمجھتا تھا کہ "مثالی" یا "شکلی" گھوڑا گھوڑوں کی خصوصیات کا مطالعہ کرنے کے بعد وضع کیا گیا ہے ۔ یہ خصوصیات وہی چیز ہیں جسے ہم آج کل اسمی نوع کہتے ہیں۔

اگر زیادہ صحیح طرز بیان اختیار کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ "شکلی" گھوڑے سے ارسطو کی مراد وہ چیز ہے جو سب گھوڑوں میں مشترک ہوتی ہے ۔ اور یہاں انسان نما بسکٹوں کے سانچے کا استعارہ اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے کیونکہ خواہ کتنے ہی بسکٹ کیوں نہ بنا لیے جائیں ، سانچے کا اپنا الگ وجود برقرار رہتا ہے ، وہ اس کے لیے ان بسکٹوں کا محتاج نہیں ہوتا ۔ ارسطو اس قسم کے سانچوں یا شکلوں پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا جو دنیائے فطرت سے ماورا اپنے اپنے شیلف (shelf) پر پڑے ہوں ۔ اس کے برعکس ارسطو کا خیال تھا کہ شکلیں اشیا کے اندر ہوتی ہیں کیونکہ وہ ان اشیا کی اپنی اپنی خصوصیات کی مظہر ہوتی ہیں۔

چنانچہ ارسطو افلاطون کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا تھا کہ چوزے سے پہلے "مثالی" چوزہ وجود میں آیا تھا ۔ ارسطو "جسے شکلی "چوزہ کہتا ہے وہ بلا استثنا ہر چوزے یا مرغی میں موجود ہوتا ہے کیونکہ ہر چوزے یا مرغی کی اپنی واضح خصوصیات ہوتی ہیں ـــــ مثلاً یہی کہ ہر مرغی انڈے دیتی ہے ۔ چنانچہ اصلی چوزہ اور "شکلی" چوزہ ایک دوسرے کے لیے اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جس طرح کہ جسم اور روح۔

ارسطو نے افلاطون کے نظریہ امثال پر جو تنقید کی ہے ،

یہی اس کا مرکزی اور بنیادی نکتہ ہے ۔ لیکن تمہیں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ فکر میں ڈرامائی موڑ ہے ۔ افلاطون کے نظریے میں حقیقت کا بلندترین درجہ وہ ہے جسے ہم اپنی عقل کی مدد سے سوچتے ہیں ۔ اس کے برعکس ارسطو واضح طور پر سمجھتا تھا کہ حقیقت کا بلندترین درجہ وہ ہے جس کا ادراک ہم حواس کی مدد سے کرتے ہیں ۔ افلاطون کا خیال تھا کہ دنیائے فطرت میں ہمیں جو اشیا نظر آتی ہیں وہ ان اشیا کی محض پرچھائیاں ہیں جو دنیائے امثال کی بلند ترین حقیقت میں ــــ اور یوں انسانی روح میں ــــ موجود ہیں ۔ ارسطو کی سوچ اس کے متضاد تھی ؛ اس کا کہنا تھا کہ انسانی روح میں موجود اشیا فطری اشیا کی محض پرچھائیاں ہوتی ہیں ۔ چنانچہ دنیائے فطرت ہی اصل دنیا ہے ۔ ارسطو کے خیال کے مطابق افلاطون دنیا کی اس تصویر سے دھوکا کھا گیا تھا جو صنمیات پیش کرتی تھی کیونکہ اس میں انسانی تخیل اورحقیقی دنیا کو آپس میں گڈمڈ کردیا جاتا ہے۔

ارسطو کہتا تھا کہ جس چیز کا تجربہ پہلے حواس کو نہیں ہوتا وہ شعور میں موجود نہیں ہوسکتی ۔ اس کے برعکس افلاطون دعویٰ کرتا تھا کہ دنیائے فطرت میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہوسکتی جو پہلے دنیائے امثال میں موجود نہ ہو ۔ ارسطو کا خیال تھا کہ اس طرح افلاطون "اشیا کی تعداد دگنی کر رہا" ہے ۔ وہ گھوڑے کی تشریح "مثالی" گھوڑے کے حوالے سے کرتا تھا ۔ لیکن سوفی ، یہ کس قسم کی تشریح ہوئی ؟ میرا سوال یہ ہے کہ یہ "مثالی" گھوڑا کہاں سے آتا ہے ؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی تیسرا گھوڑا بھی موجود ہو جس کی "مثالی" گھوڑا محض نقل ہو؟

ارسطو کا نظریہ تھا کہ ہمارے شعور میں جو خیالات وافکار آتے ہیں وہ صرف ان اشیا کی وساطت سے آتے ہیں جنہیں ہم سنتے یا دیکھتے ہیں ۔ لیکن ہمارے اندر عقل کی خلقی قوت بھی ہوتی ہے ۔ ہمارے اندر خلقی خیالات تو نہیں ہوتے جیسا کہ افلاطون سمجھتا تھا لیکن ہم میں اتنی خلقی صلاحیت ضرور ہوتی ہے کہ ہم تمام حواسی تاثرات کو مختلف درجوں اور زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں ۔ "پتھر" ، "پودا" ، "حیوان" اور "انسان" جیسے تصورات ہمارے

ذہنوں میں اسی طرح آتے ہیں - بعینہٖ "گھوڑا"، "جھینگا" اور "کناری" کے تصورات سے ہم آشنا ہوتے ہیں۔

ارسطو کو اس بات سے انکار نہیں تھا کہ انسانوں میں خلقی عقل ہوتی ہے - اس کے برعکس اس کا ایمان تھا کہ یہ عقل ہی تو ہے جو انسان کا انتہائی امتیازی وصف ہے - لیکن جب تک ہمیں حواس کے ذریعے کسی چیز کا ادراک نہیں ہوتا، ہماری عقل مکمل طور پر خالی رہتی ہے - چنانچہ انسان کے کوئی خلقی "خیالات" یا "امثال" نہیں ہوتے۔

کسی چیز کی ہیئت اس کے مخصوص اوصاف ہوتے ہیں

افلاطون کے "ناپسندیدہ" نظریہ امثال سے عہدہ برآ ہونے کے بعد ارسطو نے فیصلہ کیا کہ حقیقت مختلف علیحدہ علیحدہ اشیا پر مشتمل ہوتی ہے جو ہیئت (form) اور مادے (substance) کی وحدت تشکیل کرتی ہیں - "مادہ" وہ چیز ہے جس سے اشیا بنتی ہیں جب کہ "ہیئت" ہر چیز کے مخصوص اوصاف ہوتے ہیں۔

سوفی، تمہارے سامنے کوئی مرغی پھڑپھڑا رہی ہے - صحیح معنوں میں مرغی کی ہیئت یہی ہے کہ یہ پھڑپھڑاتی ہے ——— اور یہ کہ یہ کڑکڑاتی اور انڈے دیتی ہے - چنانچہ مرغی کی ہیئت سے ہماری مراد اس کی نوع کے مخصوص اوصاف ہوتے ہیں ——— یا دوسرے الفاظ میں یہ کرتی کیا ہے - جب مرغی مرجاتی ہے ——— اور کڑکڑانا بند کردیتی ہے ——— اس کی "ہیئت" معدوم ہوجاتی ہے - جو چیز باقی رہ جاتی ہے وہ محض اس کا "مادا" ہے (ہے نا افسوس ناک بات، سوفی!)، لیکن اسے مرغی نہیں کہا جاسکتا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ارسطو زیادہ دھیان فطرت کی تبدیلیوں پر دیتا تھا - "مادے" میں کوئی نہ کوئی مخصوص "ہیئت" اختیار کرنے کے امکانات ہمیشہ موجود رہتے ہیں - ہم کہہ سکتے ہیں

کہ "مادے" کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اس مخفی امکان کو عملی شکل دے سکے۔ ارسطو کے مطابق فطرت کی ہر تبدیلی مواد کے "امکان" سے "حقیقت" میں متغیر ہونے کا عمل ہے۔

سوفی، میرا مطلب کیا ہے، میں اس کی وضاحت کر دیتا ہوں۔ میں تمہیں ایک مضحک کہانی سنا رہا ہوں۔ دیکھیں، تمہیں اس سے کوئی مدد ملتی ہے یا نہیں۔ ایک سنگ تراش پتھر کی بہت بڑی سل پر کام کر رہا ہے۔ وہ بے ہیئت سل کو ہر روز تیشے سے کاٹتا رہتا ہے۔ ایک روز کوئی چھوٹا سا بچہ اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے: "آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟" "انتظار کرو اور دیکھو،" سنگ تراش جواب دیتا ہے۔ چند دن بعد بچہ دوبارہ آتا ہے۔ اتنے میں سنگ تراش پتھر کو کاٹ تراش کر خوبصورت گھوڑے میں تبدیل کر چکا ہوتا ہے۔ بچے کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ سنگ تراش کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے: "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ اس کے اندر موجود تھا؟"

واقعی اسے کیسے معلوم ہوا! ایک لحاظ سے یہ کہنا درست ہے کہ سنگ تراش نے پتھر کی سل میں گھوڑے کی ہیئت دیکھ لی تھی کیونکہ اس خاص سل میں یہ امکان موجود تھا کہ اسے گھوڑے کی شکل میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح ارسطو کو یہ یقین تھا کہ فطرت کی ہر چیز میں یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص ہیئت یا شکل اختیار کرے۔

آؤ، ہم مرغی اور انڈے کے معاملے پر دوبارہ غور کرتے ہیں۔ مرغی کے انڈے میں یہ امکان ہوتا ہے کہ وہ چوزے میں تبدیل ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام انڈے چوزوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں — ان میں سے بے شمار کا انجام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ آملیٹ، خاگینے یا ابلے ہوئے انڈوں کی صورت میں ہمارے ناشتے کی میز کی زینت بن جاتے ہیں اور یوں ان کے اندر چوزے بننے کا جو امکان تھا، اسے وہ شرمندہ تعبیر نہیں کرپاتے۔ چنانچہ کسی چیز کی "ہیئت" ہی سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس کے امکانات کیا ہیں اور اس کی مجبوریاں کیا ہیں۔

جب ارسطو اشیا کے "مادے" اور "ہیئت" کی بات کرتا ہے، اس کا اشارہ محض نامیاتی اشیا کی طرف نہیں ہوتا۔ جس طرح مرغی کی "ہیئت" کڑکڑانا، اپنے پر پھڑپھڑانا اور انڈے دینا ہے، اسی طرح پتھر کی ہیئت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ زمین کی طرف گرتا ہے۔ جس طرح مرغی کڑکڑائے بنا نہیں رہ سکتی، بعینہٖ پتھر زمین پر گرے بنا نہیں رہ سکتا۔ یہ درست ہے کہ تم پتھر اٹھا سکتی اور اسے خاصا اونچا فضا میں اچھال سکتی ہو، لیکن چونکہ پتھر کی فطرت ہی یہ ہے کہ یہ آخرکار زمین پر ہی گرے گا، تم اسے چاند پر نہیں پھینک سکتیں۔ (اگر تم تجربہ کرنا چاہو، تو بے شک کرلو لیکن احتیاط سے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پتھر انتقام پر تل جائے اور مختصر ترین راستہ اختیار کرے۔)

علت غائی (The Final Cause)

پیشتر اس کے کہ ہم اس موضوع کو ختم کریں کہ تمام جاندار اور بے جان اشیا کی کوئی نہ کوئی "ہیئت" ہوتی ہے جو ہمیں اس کے امکانی "فعل" (action) کے متعلق کچھ بتاتی ہے، میں اتنا مزید کہنا چاہتا ہوں کہ فطرت میں علت اور معلول کے مابین جو تعلق ہوتا ہے، ارسطو نے اس کے متعلق قابل توجہ نقطہ نظر پیش کیا تھا۔

آج کل جب ہم کسی چیز کی "علت" (Cause) کے متعلق بات کرتے ہیں، تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کیسے وقوع پذیر ہوئی۔ کھڑکی کے شیشے اس لیے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئے کیونکہ پیٹر نے اس پر پتھر دے مارا تھا۔ جوتا اس لیے بنتا ہے کیونکہ جفت ساز چمڑے کے ٹکڑوں کو آپس میں سی دیتا ہے۔ لیکن ارسطو کا کہنا تھا کہ فطرت میں مختلف اقسام کی علل ہوتی ہیں۔ اس نے مجموعی طور پر چار مختلف علل گنوائی ہیں۔ یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ جس چیز کو وہ "علت غائی" (final cause) کہتا ہے، وہ کیا ہے۔

کھڑکی کے شیشے کے ٹوٹنے کے سلسلے میں یہ پوچھنا بالکل معقول بات ہے کہ پیٹر نے پتھر کیوں پھینکا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہم دریافت کر رہے ہیں کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوتا بنانے کے فعل میں بھی مقصد کو عمل دخل حاصل تھا۔ لیکن جب ارسطو نے فطرت کی خالصتاً بے جان عمل کاریوں (lifeless processes) کے متعلق غور وفکر کیا، تب بھی اس نے مشابہ "مقصد" کو پیش نظر رکھا۔ میں یہاں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

سوفی، بارش کیوں ہوتی ہے؟ تم نے غالباً سکول میں پڑھا ہوگا کہ بارش اس لیے ہوتی ہے کیونکہ بادلوں کی رطوبت ٹھنڈی ہوجاتی ہے اور کثیف ہوکر برشگالی قطروں کی صورت اختیار کرلیتی ہے جو کشش ثقل کی قوت کے باعث زمین کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ ارسطو اس جواب پر ہاں میں سر ہلا دیتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مزید کہتا کہ تم نے صرف تین علتیں گنوائی ہیں۔ "علت مادی" (material cause) تو یہ ہے کہ رطوبت فضا میں عین اس وقت موجود تھی جب ہوا ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ "موثر علت" (efficient cause) یہ ہے کہ رطوبت ٹھنڈی ہوجاتی ہے اور "ہیئتی علت" (formal cause) یہ ہے کہ پانی کی ہیئت (form) یا فطرت (nature) یہ ہے کہ یہ زمین کی طرف گرتا ہے۔ لیکن اگر تم نے اپنا جواب یہیں ختم کردیا تو ارسطو اس میں یہ اضافہ کرے گا: بارش اس لیے ہوتی ہے کیونکہ پودوں اور جانوروں کو نشوونما کے لیے بارش کے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے وہ "علت غائی" کہتا تھا۔ ارسطو بارش کے قطروں کے ذمے حیاتی فریضہ یا "مقصد" لگادیتا ہے۔

ہم غالباً اس معاملے کو ایک اور انداز سے دیکھیں گے اور کہیں گے کہ پودے اس لیے نمو پاتے ہیں کیونکہ انہیں رطوبت مل جاتی ہے۔ سوفی، دونوں باتوں میں جو فرق ہے، تم اسے بخوبی سمجھ سکتی ہو۔ ٹھیک؟ ارسطو کا عقیدہ تھا کہ فطرت میں جو کچھ رونما ہوتا ہے، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ بارش اس لیے ہوتی ہے تاکہ پودوں کی نشوونما ہوسکے۔ نارنگیاں اور انگور

اس لیے اگتے ہیں تا کہ لوگ انہیں کھا سکیں۔

آج کل سائنسی استدلال کی نوعیت یہ نہیں ۔ ہم کہتے ہیں کہ انسانوں اور حیوانوں کے لیے غذا اور پانی لازمی اشیا ہیں ۔ اگر یہ اشیا نہ ہوتیں ' ہمارا کوئی وجود نہ ہوتا ۔ لیکن پانی اور غذا کا مقصد یہ نہیں کہ ہماری خوراک بنیں۔

چنانچہ جہاں تک علت اور معلول کے مابین تعلق کا مسئلہ ہے ' ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم یہ کہہ دیں کہ ارسطو غلطی پہ تھا ۔ لیکن ہمیں خواہ مخواہ کی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے ۔ بے شمار لوگوں کا ایمان ہے کہ یہ دنیا جیسی بھی ہے ' خدا نے اس لیے بنائی ہے تاکہ اس کی تمام مخلوق اس میں رہ سکے ۔ اگر اس انداز سے دیکھا جائے تو فطرتاً یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ دریاؤں میں پانی اس لیے آتا ہے کیونکہ حیوانوں اور انسانوں کو زندہ رہنے کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن اب ہم خدا کے مقصد کی بات کر رہے ہیں ۔ جہاں تک بارش کے قطروں اور دریاؤں کے پانیوں کا تعلق ہے 'انہیں ہماری بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

منطق

ہم جس انداز سے دنیا کی اشیا کا ادراک کرتے ہیں ' اس کی ارسطو نے جو توضیح کی ہے ' اس میں "ہیئت" اور "مادے" کے مابین امتیاز اہم کردار ادا کرتا ہے۔

جب ہم اشیا کا ادراک کرتے ہیں ' ہم انہیں مختلف گروہوں یا زمروں میں تقسیم کردیتے ہیں ۔ مجھے ایک ' پھر دوسرا ' پھر تیسرا گھوڑا نظر آتا ہے ۔ سب گھوڑے بالکل ہی ایک جیسے نہیں ہوتے لیکن ان میں کوئی چیز ضرور مشترک ہوتی ہے اور یہ مشترک چیز گھوڑے کی "ہیئت" ہوتی ہے ۔ گھوڑے میں جو بھی امتیازی یا انفرادی چیز ہوتی ہے ' اس کا تعلق گھوڑے کے "مادے" سے ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم متعدد "خانے" بنا لیتے ہیں اور ہر چیز کو اس

ے مخصوص "خانے" میں رکھتے جاتے ہیں۔ ہم گائیں باڑوں میں، گھوڑے اصطبلوں میں، خنزیر سور خانوں میں اور مرغیاں دڑبوں میں رکھتے ہیں۔ جب سوفی امنڈسین اپنے کمرے کی صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتی ہے، تب بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ وہ اپنی عام کتابیں بک شیلف میں، درسی کتابیں بستے میں اور رسالے دراز میں رکھتی ہے۔ پھر وہ اپنے ملبوسات کی قرینے سے تہیں لگاتی اور انہیں الماری کے الگ الگ خانوں میں ـــــ انڈر ویئر ایک خانے میں، سویٹر دوسرے میں، جرابیں تیسرے میں ـــــ رکھتی جاتی ہے۔ ذرا سوچو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم اپنے دماغوں میں بھی یہی کام کرتے ہیں۔ ہم پتھر کی بنی ہوئی، اون کی بنی ہوئی اور ربر کی بنی ہوئی اشیا کے مابین امتیاز کرتے ہیں۔ ہم جان دار اور بے جان اشیا کے مابین امتیاز کرتے ہیں، اور ہم پودوں، جانوروں اور انسانوں کے مابین امتیاز کرتے ہیں۔

کیا سمجھیں، سوفی؟ ارسطو فطرت کے "کمرے" کی سلیقے اور مہارت سے مکمل صفائی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دکھانے کی کوشش کی تھی کہ ہر چیز کا تعلق مختلف زمروں اور ضمنی زمروں سے ہے۔ (ہرمیز زندہ مخلوق ہے، زیادہ تخصیصی طور پر وہ جانور ہے، اور زیادہ تخصیصی طور پر وہ ریڑھ دار جانور ہے، مزید تخصیصی طور پر وہ دودھ پینے پلانے والا جانور ہے، اور مزید تخصیصی طور پر وہ لیبرے ڈور ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ نر لیبرے ڈور ہے۔)

سوفی، اپنے کمرے میں جاؤ اور جو چیز بھی ہاتھ لگے، فرش سے اٹھاؤ۔ تم جو کچھ بھی اٹھاؤ گی، تمہیں معلوم ہوگا کہ اس کا تعلق نسبتاً اعلیٰ زمرے سے ہے۔ جس روز تمہیں کوئی ایسی چیز مل گئی جس کی تم درجہ بندی نہیں کرسکتیں، تمہیں بڑا ذہنی صدمہ پہنچے گا۔ مثلاً تمہیں کوئی چھوٹی سی چیز نظر آجاتی ہے اور تمہارے منہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے: "یہ کیا ہے؟" تم اس کے متعلق یقین سے نہ کہہ سکتیں کہ یہ نبات (plant) ہے: حیوان ہے یا کوئی جماد (mineral) ـــــ اگر ایسی صورت حال پیش آتی ہے تو میرا خیال ہے کہ تم اسے ہاتھ بھی لگانے کی جرات نہیں کرو گی۔

حیوان، نبات اور جماد کے ذکر سے مجھے وہ پارٹی گیم یاد آجاتی ہے جس میں نگیر کرے سے باہر بھیج دیا جاتا ہے اور جب وہ دوبارہ اندر آتا ہے تو اسے بوجھنا پڑتا ہے کہ کرے میں موجود لوگ کیا سوچ رہے ہیں ۔ سب لوگوں نے ایکا کرلیا ہے کہ وہ "کلغی" (Fluffy) کے متعلق سوچیں گے ۔ ("کلغی" دراصل بلی کا نام ہے جو اس وقت ہمسائے کے باغ میں پھر رہی ہے ۔) نگیر اندر آتا ہے اور قیاس آرائی کرنے لگتا ہے ۔ دوسروں کو اس کے سوالوں کا جواب صرف "ہاں" یا "نہ" میں دینا ہوتا ہے ۔ اگر نگیر سمجھ دار ہے اور ارسطو کے نقش قدم پر چلتا ہے ـــــ اور یوں وہ نگیر نہیں رہتا ـــــ لیکن وہ کچھ انداز سے پوچھے گا:

کیا یہ چیز ٹھوس ہے؟ (ہاں!) جماد؟ (نہیں!)، کیا یہ جاندار ہے؟ (ہاں!)، نبات؟ (نہیں!) حیوان؟ (ہاں!) یہ کوئی پرندہ ہے؟ (نہیں!) کوئی دودھ پلانے والا جانور ہے؟ (ہاں!) کیا یہ کوئی مکمل جانور ہے؟ (ہاں!) بلی ہے؟ (ہاں!)۔ کلغی کا سوچ رہے ہو؟ (بالکل! قہقہوں کی آوازیں...)

چنانچہ یہ کھیل ارسطو نے ایجاد کیا تھا ۔ آنکھ مچولی ایجاد کرنے کا سہرا افلاطون کے سر بندھتا ہے ۔ دیموکری توس کو تو ہم پہلے ہی خراج تحسین پیش کرچکے ہیں کہ لیگو (lego) کی ایجاد اس کے کھاتے میں جاتی ہے ۔

ارسطو دقیقہ رس اور باریک بین تنظیم کار تھا جو ہمارے تصورات کی دھندلاہٹ ہٹانا چاہتا تھا ۔ درحقیقت علم منطق کی بنیاد اسی نے رکھی تھی ۔ اس نے مثالوں کے ذریعے ایسے متعدد قوانین کی تشریح کی تھی جن کے ذریعے صحیح نتیجے یا ثبوت تک پہنچا جاسکتا ہے ۔ ایک مثال کافی رہے گی ۔ اگر میں یہ بات بطور حقیقت ثابتہ پیش کروں کہ "تمام جاندار مخلوقات فانی ہیں" (قضیہ اول) اور پھر بطور حقیقت ثابتہ یہ کہوں کہ "ہرمیز جان دار مخلوق ہے" (قضیہ دوم)، تو پھر میں بڑی شستگی سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہوں کہ "ہرمیز فانی ہے ۔"

اس مثال سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ارسطو کی منطق کی اساس اصطلاحات کے باہمی ربط پر تھی ۔ اس مثال میں یہ ربط "جاندار

مخلوق " اور " فانی " کے مابین ہے ۔ اگرچہ ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ مندرجہ بالا اخذ کردہ نتیجہ سو فیصد درست ہے ، ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس سے کسی نئی بات کا انکشاف نہیں ہوتا ۔ ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ ہرمیز " فانی " ہے ۔ (وہ " کتا " ہے اور تمام کتے " جاندار مخلوق " ہیں جو کوہ ایورسٹ کی چٹانوں کے برعکس " فانی " ہیں ۔) ۔ سولی ، ہمیں یقیناً یہ سب کچھ معلوم تھا ۔ لیکن اشیا کے مختلف طبقوں کے مابین تعلق ہمیشہ اتنا عیاں نہیں ہوتا ۔ وقتاً فوقتاً ہمارے تصورات کو ابہام سے پاک کرنا ضروری ہو جاتا ہے ۔

مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ ننھے منے چوہے اسی طرح اپنی ماؤں کا دودھ پیتے ہیں جس طرح کہ بلیے یا بچھڑے پیتے ہیں ؟ چوہیاں انڈے یقیناً نہیں دیتیں (کیا کبھی کسی نے چوہیا کا انڈا دیکھا ہے ؟) ۔ چنانچہ وہ گائیوں اور بھیڑوں کی طرح بچے پیدا کرتی ہیں ۔ لیکن ہم ان تمام جانوروں کو جو زندہ بچوں کو جنم دیتے ہیں ، میمل (mammals) کہتے ہیں —— اور میمل وہ جانور ہوتے ہیں جو اپنی ماؤں کے دودھ پہ پلتے ہیں ۔ یوں ہم صحیح بات تک پہنچ گئے ۔ جواب ہمارے اندر موجود تھا لیکن اس کے لیے ہمیں پوری طرح سوچنا پڑا ۔ ہم وقتی طور پہ بھول گئے تھے کہ چوہے واقعی اپنی ماؤں کا دودھ چوستے ہیں ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم نے کبھی کسی چوہے کو اپنی ماں کا دودھ چوستے نہیں دیکھا ۔ اس کی سیدھی سادھی وجہ محض یہ ہے کہ چوہیاں انسان کی موجودگی میں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے شرماتی ہیں ۔

فطرت کا پیمانہ

جب ارسطو زندگی کی " جھاڑ پونچھ " کرتا ہے ، وہ سب سے پہلے اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ فطرت کی ہر چیز کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ ایک طرف پتھروں ، پانی کے قطروں اور مٹی کے ڈھیلوں جیسی بے جان اشیا ہیں ۔ ان چیزوں میں تبدیلی کا امکان نہیں ہوتا ۔ ارسطو کے مطابق بے جان

اشیا میں تبدیلی صرف خارجی اثرات کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ صرف جان دار اشیا میں تبدیلی کا امکان ہوتا ہے۔

ارسطو "جاندار اشیا" کو دو مختلف زمروں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک زمرہ نباتات پر اور دوسرا مخلوقات پر مشتمل ہوتا ہے۔ آخر میں یہ "مخلوقات" بھی دو ذیلی زمروں یعنی حیوانوں اور انسانوں میں منقسم ہو جاتی ہیں۔

ہمیں ماننا ہوگا کہ ارسطو کے زمرے سیدھے سادے اور غیر مبہم ہیں۔ جاندار اور بے جان شے کے مابین فیصلہ کن فرق ہوتا ہے۔ مثلاً گلاب کے پھول اور گھوڑے کے مابین فیصلہ کن فرق پایا جاتا ہے۔ میں تو یہ دعویٰ بھی کروں گا کہ انسان اور گھوڑے کے مابین بھی یقیناً فرق ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک کیا فرق ہے؟ کیا تم بتا سکتی ہو؟

بدقسمتی سے میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں بیٹھا انتظار کرتا رہوں کہ کب تم اس کا جواب لکھتی ہو، کب اسے شکر کی ڈلی کے ساتھ گلابی لفافے میں ڈالتی ہو اور کب یہ میرے پاس پہنچتا ہے۔ چنانچہ میں خود ہی جواب دے دیتا ہوں۔ جب ارسطو فطری مظاہر کو مختلف زمروں میں تقسیم کرتا ہے تو اس کی کسوٹی چیز کے اوصاف ہوتے ہیں یا زیادہ واضح انداز سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ چیز کیا کر سکتی ہے یا کیا کرتی ہے۔

تمام جاندار اشیا (پودوں، جانوروں اور انسانوں) میں غذا کو جذب کرنے، نشوونما پانے اور اپنی نسل کو آگے بڑھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ مزید برآں تمام "جاندار مخلوقات" (جانوروں اور انسانوں) میں اپنے گرد و پیش کی دنیا کا ادراک کرنے اور (ایک جگہ سے دوسری جگہ) حرکت کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ انسانوں میں اس کے علاوہ سوچنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے — یا یوں کہو کہ وہ جن چیزوں کا ادراک کرتا ہے، وہ انہیں مختلف طبقوں اور زمروں میں تقسیم کر سکتا ہے۔

چنانچہ دنیائے فطرت میں حقیقتاً کوئی واضح حد بندیاں نہیں۔ ہم سیدھی سادی نباتات کو پیچیدہ پودوں میں اور سیدھے

سادے جانوروں کو پیچیدہ جانوروں میں تبدیل ہوتے دیکھتے ہیں ۔ اس "پیمانے" کی چوٹی پر انسان متمکن ہے ___ جو ارسطو کے خیال کے مطابق فطرت کی مکمل زندگی بسر کرتا ہے ۔ انسان پودوں کی طرح غذا جذب کرتا اور نشوونما پاتا ہے، وہ جانور کی طرح محسوس کرتا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتا ہے لیکن اس کا اپنا خاص وصف ہوتا ہے جو صرف انسانوں میں پایا جاتا ہے اور وہ وصف یہ ہے کہ اس میں عقلی انداز سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے ۔

چنانچہ، سوفی، انسان کے اندر الوہی عقل کی چنگاری ہوتی ہے ۔ تم ٹھٹھک کیوں گئیں ؟ میں نے الوہی ہی کہا ہے ۔ ارسطو بار بار ہمیں یاد دلاتا ہے کہ خدا لازماً موجود ہوگا کیونکہ دنیائے فطرت میں یہ ساری چہل پہل اسی نے ہی تو شروع کی تھی ۔ چنانچہ فطرت کے پیمانے میں خدا لازماً سب سے اونچی سیڑھی پر ہوگا ۔

ارسطو کا خیال تھا کہ ستاروں اور سیاروں کی حرکت زمین پر ہر قسم کی حرکت کی رہنمائی کرتی ہے ۔ لیکن اجرام فلکی کو حرکت دینے والی چیز بھی تو لازماً ہونا چاہیے ۔ ارسطو اس چیز کو اولین "حرکت دہندہ" (mover) یا خدا (God) کہتا ہے ۔ اولین حرکت دہندہ خود غیر متحرک رہتا ہے لیکن وہ تمام اجرام فلکی اور یوں فطرت کی ساری حرکت کی "ہیئتی علت" ہوتا ہے ۔

اخلاقیات

آؤ، سوفی، اب ہم واپس انسان کی طرف چلتے ہیں ۔ ارسطو کے مطابق انسان کی ہیئت روح پر مشتمل ہوتی ہے جس کے تین اجزا ___ نباتاتی، حیوانی اور عقلی ___ ہوتے ہیں ۔ اب وہ سوال کرتا ہے: ہمیں زندگی کیسے گزارنا چاہیے؟ اچھی زندگی گزارنے کے لیے کیا درکار ہے؟ اس کا جواب ہے: انسان صرف اپنی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کو بروئے کار لا کر ہی مسرت حاصل کرسکتا ہے ۔

ارسطو کا دعویٰ تھا کہ مسرت کی تین صورتیں (forms) ہوتی ہیں ۔ مسرت کی پہلی صورت لذت (pleasurs) اور لطف اندوزی (enjoyment) کی زندگی ہے ۔ مسرت کی دوسری صورت آزاد اور فرض شناس شہری کی زندگی ہے ۔ مسرت کی تیسری صورت مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے زندگی ہے۔

اس کے بعد ارسطو زور دے کر کہتا ہے کہ اگر آدمی مسرت کا جویا ہے اور اپنی ذاتی امنگوں کی تکمیل کرنا اور اپنی امکانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر شانت ہونا چاہتا ہے تو اس میں یہ تینوں چیزیں بیک وقت موجود ہونا چاہئیں ۔ وہ عدم توازن کی تمام صورتیں مسترد کردیتا ہے ۔ اگر وہ آج زندہ ہوتا تو شاید وہ کہتا کہ جو شخص محض اپنے جسم کو پالتا ہے ، وہ بالکل اسی قسم کی غیرمتوازن زندگی گزارتا ہے جس طرح کی کہ وہ شخص جو صرف اپنا سر (دماغ) استعمال کرتا ہے ۔ دونوں انتہائیں کج رو طرز حیات کی مظہر ہیں۔

انسانی تعلقات پر بھی ، جہاں ارسطو " اعتدال " Golden) (Mean کی پر زور وکالت کرتا ہے ، اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے ۔ ہمیں بزدل ہونا چاہیے نہ جلد باز (کم حوصلگی بزدلی اور ضرورت سے زیادہ جرات مندی جلدبازی ہے) ، بخیل یا کھ ٹ نہیں بلکہ فراخ دل ہونا چاہیے (کافی فراخ دل نہ ہونا کنجوسی اور ضرورت سے زیادہ فراخ دلی فضول خرچی ہے) ۔ یہی اصول خورونوش پر صادق آتا ہے ۔ ضرورت سے کم کھانا اور ضرورت سے زیادہ کھانا دونوں ہی خطرناک ہیں ۔ افلاطون اور ارسطو دونوں کی اخلاقیات پر یونانی طب کی چھاپ لگی ہوئی ہے ۔ صرف توازن اور اعتدال کے ذریعے آدمی پرمسرت یا "ہم آہنگ "زندگی گزار سکتا ہے۔

سیاسیات

ارسطو نے معاشرے کے متعلق اپنا جو نقطہ نظر پیش کیا ہے اس میں بھی انتہا پسندی کو ناقابل قبول قرار دیا ہے ۔ اس کا

کہنا ہے کہ انسان فطرتاً "سیاسی جانور" ہے ۔ اس کا دعوٰی ہے کہ جب تک ہمارے گردوپیش معاشرہ نہ ہو ہم صحیح انسان نہیں بن سکتے ۔ اس نے اس طرف توجہ دلائی کہ خاندان اور گاؤں ہماری خوراک، حرارت، شادی اور بچوں کی پرورش جیسی بنیادی ضروریات پوری کرتے ہیں لیکن انسانی رفاقت کی بہترین صورت صرف مملکت میں دستیاب ہوسکتی ہے۔

اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ مملکت کی تنظیم کیسے کی جانا چاہیے ۔ (تمہیں افلاطون کی "فلسفیانہ مملکت" یاد ہے؟) ارسطو مملکت کی تین اچھی صورتیں بیان کرتا ہے۔

پہلی صورت تو بادشاہت یا ملوکیت کی ہے ـــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت کا صرف ایک سربراہ ہوتا ہے ۔ اس قسم کا آئین تبھی اچھا ہوسکتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہ ہو اور یہ کسی صورت میں بھی ظالم و جابر مطلق العنانیت میں تبدیل نہ ہو ـــــ یعنی جب حکمران مملکت پر محض اپنی منفعت کے لیے حکومت کرنے لگتا ہے ۔ آئین کی دوسری اچھی صورت حکومت اشرافیہ ہے ۔ اس طرز حکومت میں اختیارات چھوٹے یا بڑے گروہوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں ۔ اس آئینی صورت میں اس بات کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے کہ یہ کسی حالت میں بھی روبہ انحطاط ہوکر عدیدیہ (oligarchy) نہ بننے پائے ـــــ یعنی اختیارات محض چند گنے چنے نفوس کے ہاتھوں میں مرکوز نہ ہوجائیں ۔ اس کی ایک مثال وہ ہے جسے junta (حکومت کا تختہ الٹ کر ملک پر قبضہ کرنے والے فوجی افسروں کا گروہ) کہا جاتا ہے ۔ آئین کی تیسری اچھی صورت وہ ہے جسے ارسطو polity (منظم معاشرہ اور اس کا معین طرز حکومت) کا نام دیتا ہے ۔ سیدھے سادے الفاظ میں اس کا مطلب جمہوریت یا جمہوری طرز حکومت ہے ۔ لیکن اس آئینی صورت کا بھی اپنا منفی پہلو ہوتا ہے ۔ جمہوریت بہت جلد "بھیڑ کی حکومت" (mob rule) میں تبدیل ہوسکتی ہے ۔ (اگر مطلق السنان اور جابر ہٹلر جرمنی کا سربراہ مملکت نہ بھی بنتا، تب بھی بونے نازی دہشت ناک بھیڑ کی حکومت بنا لیتے۔)

عورتوں کے متعلق خیالات

آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ عورتوں کے متعلق ارسطو کی کیا رائے تھی ۔ بدقسمتی سے وہ اتنا روشن خیال نہیں تھا جتنا کہ افلاطون تھا ۔ ارسطو یہ ماننے کی طرف زیادہ مائل تھا کہ عورتیں کسی نہ کسی لحاظ سے نامکمل ہیں ۔ اس کا خیال تھا کہ عورت "نامکمل مرد" ہے ۔ عمل تناسل میں عورت منفعل (passive) اور وصول کنندہ (receptive) ہوتی ہے جب کہ مرد فاعل (active) اور تولید کنندہ (productive) ہوتا ہے کیونکہ ارسطو کا دعویٰ تھا کہ بچہ ورثے میں صرف مرد کے خصائص پاتا ہے ۔ اس کا ایقان تھا کہ بچے کے تمام خصائص مرد کے نطفے میں مکمل ہوچکے ہوتے ہیں ۔ عورت محض کھیتی ہوتی ہے جو بیج وصول کرتی اور اس کی تولید کرتی ہے جب کہ مرد "بیج بوتا ہے ۔" ارسطو کی زبان میں اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ مرد "ہیئت" فراہم کرتا ہے جب کہ عورت "مادا" مہیا کرتی ہے۔

بہرحال یہ بات انتہائی تعجب انگیز بھی ہے اور قابل افسوس بھی کہ ایک ایسا شخص جو اتنا ذہین و فطین تھا ، مردوزن کے تعلقات کے بارے میں اس قسم کی غلطی کا مرتکب ہوا ۔ لیکن اس سے دو چیزیں ثابت ہوتی ہیں ۔ اول : ارسطو کو عورتوں اور بچوں کی زندگیوں کے متعلق کوئی خاص عملی تجربہ نہیں ہوگا ۔ دوم : جب مردوں کو فلسفے اور سائنس کے شعبوں میں بالادستی حاصل ہوجاتی ہے ، گڑبڑ کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔

مردوزن کے تعلقات کے سلسلے میں ارسطو کے غلط نظریات کا دوہرا نقصان ہوا کیونکہ قرون وسطیٰ کے دوران میں افلاطون کی بجائے لوگوں نے اس کی باتوں پر زیادہ دھیان دیا ۔ چنانچہ عیسائی مسلک کو عورتوں کے متعلق ورثے میں ایک ایسا نقطہ نظر ملا جس کا انجیل میں کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔ یسوع عورتوں سے یقیناً نفرت نہیں کرتے تھے ۔

میں مزید کچھ نہیں کہوں گا لیکن تمہیں بہت جلد میرا
اگلا خط مل جائے گا ۔

جب سوفی ارسطو کے متعلق باب ڈیڑھ مرتبہ پڑھ چکی ، اس نے اسے دوبارہ خاکی لفافے میں رکھ دیا اور بیٹھی خلا میں گھورتی رہی ۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ کمرے میں ہر چیز بے ترتیب پڑی ہے ۔ کتابیں اور باکس فائلیں فرش پر بکھری پڑی تھیں ۔ جرابیں اور سویٹر ، تنگ پتلونیں (1) (tights) اور جینیں (Jeans) آدھی آدھی الماری کے اندر اور آدھی آدھی الماری کے باہر لٹک رہی تھیں ۔ لکھنے کی ڈیسک کے سامنے ایک کرسی پر دھلائی کے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ۔

سوفی میں تمام چیزوں کو ترتیب اور سلیقے سے رکھنے کی ناقابل مقاومت خواہش پیدا ہوگئی ۔ اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اس نے تمام کپڑے الماری سے باہر نکال لئے اور انہیں فرش پر رکھ دیا ۔ تمام اشیا نئے سرے سے رکھنا ضروری ہوگیا تھا ۔ اس نے آغاز کپڑوں سے کیا ۔ اس نے ان سب کی سلیقے سے تہیں لگائیں اور پھر انہیں صاف ستھرے انداز سے الماری میں رکھنے لگی ۔ اس کی الماری میں سات خانے تھے ۔ ایک خانہ زیر جاموں کے لیے ، دوسرا جرابوں اور تنگ پتلونوں کے لیے اور تیسرا جین کی پتلونوں کے لیے تھا ۔ اس نے بتدریج تمام خانے بھر دئے ۔ کون سی چیز کہاں رکھنا تھی ، اس کے بارے میں اس کے دل میں قطعاً کوئی شبہ پیدا نہ ہوا ۔ اس نے گندے کپڑے پلاسٹک کے بیگ میں ڈال دئے جو اسے نچلے خانے سے مل گیا تھا ۔ ایک چیز کے متعلق اسے واقعی کوفت اٹھانا پڑی ـــــ اور یہ گھٹنوں تک پہنچنے والی سفید جراب تھی ۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کے ساتھ کی دوسری کہیں نہیں مل رہی تھی ۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ یہ جراب سوفی کی تھی ہی نہیں ۔

اس نے اس کا بغور جائزہ لیا ۔ اس پر کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے اس کی مالکہ کی شناخت ہوسکتی ۔ اس کی مالکہ کون ہوسکتی تھی ، اس کے بارے میں سوفی کے ذہن میں مضبوط شبہ ضرور تھا ۔ اس نے اسے اوپر کے خانے میں پھینک دیا جہاں لیگو (lego) ، ویڈیو کیسٹ اور ریشمی رومال پڑا تھا ۔

اب سوفی کی توجہ فرش کی طرف مبذول ہوگئی ۔ اس نے کتابوں ، باکس فائلوں ، رسالوں اور پوسٹروں کو علیحدہ علیحدہ کیا ـــــ بالکل اسی طریقے سے جس طرح

اس کے فلسفے کے استاد نے ارسطو کے باب میں بیان کیا تھا ۔جب وہ اس کام سے فارغ ہوئی 'اس نے اپنا بستر ٹھیک کیا اور پھر لکھنے کی ڈیسک درست کرنے لگی ۔

اس نے آخری کام یہ کیا کہ ارسطو کے متعلق جتنے اوراق تھے ' انہیں خوش اسلوبی سے ترتیب وار ایک دوسرے کے اوپر رکھا ' پھر ایک خالی باکس فائل اور سوراخ کرنے والی مشین (پنچ) نکالی ۔ اس نے مشین سے اوراق میں سوراخ کئے اور انہیں باکس فائل میں ایک دوسرے کے اوپر کلپ میں پرو دیا ۔ اس نے سوچا کہ اسے اسی روز کسی وقت خفیہ ٹھکانے جانے اور وہاں سے بسکٹوں کا ڈبا اٹھا کر لانا ہوگا (جس میں فلسفے کے متعلق دوسرے کاغذات تھے) ۔

اس نے تہیہ کرلیا کہ آئندہ صاف ستھرے انداز سے چیزیں رکھنا اس کا معمول بن جائے گا ۔ اس کا ارادہ اپنے کمرے تک ہی محدود نہیں تھا ۔ ارسطو کو پڑھنے کے بعد اسے احساس ہوگیا تھا کہ اسے اپنے خیالات کو بھی باترتیب بنانا ہوگا ۔ اس نے الماری کا اوپر کا خانہ محض اس قسم کی چیزوں کے لیے مخصوص کردیا تھا ۔ کمرے میں یہ واحد جگہ تھی جس پر اسے ابھی تک مکمل تسلط حاصل نہیں ہوا تھا ۔

دو گھنٹوں سے اوپر گزر چکے تھے لیکن اسے ابھی تک اپنی ماں میں زندگی کی کوئی علامت دکھائی نہیں دی تھی ۔سوفی نچلی منزل پر چلی گئی لیکن اپنی امی کو جگانے سے پہلے اس نے اپنے پالتو جانوروں کو کچھ کھلانے کا فیصلہ کرلیا ۔

وہ باورچی خانے میں سنہری مچھلیوں کے مرتبان پر جھک گئی ۔ ایک مچھلی سیاہ ' ایک نارنجی اور ایک سرخ و سفید تھی ۔یہی وجہ ہے کہ اس نے ان کے نام بلیک جیک ' گولڈ ٹاپ (Gold top) اور ریڈ رائیڈ نگ ہڈ (Red Ridinghood) رکھ دئے تھے ۔

جب وہ پانی میں مچھلیوں کی خوراک بکھیر رہی تھی 'اس نے کہا:

" تمہارا تعلق فطرت کی جان دار مخلوق سے ہے ' تم غذا ہضم کرسکتی ہو ' پھل پھول سکتی ہو اور اپنی نسل بڑھا سکتی ہو ۔ زیادہ تخصیص برتی جائے تو کہا جائے گا کہ تمہارا تعلق حیوانی مملکت سے ہے ۔یوں تم ادھر ادھر گھوم پھر اور دنیا دیکھ سکتی ہو ۔ اگر بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کرنا ہو تو کہا جائے گا کہ تم مچھلیاں ہو ' تم اپنے گلپھڑوں کے ذریعے سانس لیتی ہو اور زندگی کے پانیوں میں ادھر ادھر تیر سکتی ہو ۔"

سوفی نے مچھلیوں کے خوراک کے مرتبان پر دوبارہ ڈھکن رکھ دیا ۔ اس نے گولڈ فش کو فطرت کے جس پیمانے میں رکھا تھا ' اس پر وہ خاصی مطمئن تھی اور خاص

طور پر اسے خوشی " زندگی کے پانیوں " کی ترکیب پر ہو رہی تھی ۔ اب باری آسٹریلوی نسل کے طوطوں کی تھی جنہیں بجری گار (budgerigar) کہا جاتا ہے ۔

سوفی نے ان کی پیالیوں میں پرندوں کے کھانے کے بیج ڈال دئے اور کہا:

" ڈیرسمٹ (Smit) اور سموے (Smule) ' تم پیارے پیارے ننھے ننھے بجری گار بن گئے ہو کیونکہ تم پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے بجری گاروں کے انڈوں سے پیدا ہوئے تھے ' اور چونکہ ان انڈوں میں بجری گار بننے کی ' ہیئت ' تھی ' چنانچہ تم ٹائیں ٹائیں کرنے والے طوطے نہیں بنے ۔ "

اس کے بعد سوفی غسل خانے میں چلی گئی جہاں سست الوجود کچھوا بڑے ڈبے میں لیٹا ہوا تھا ۔ جب کبھی کبھار اس کی امی غسل کرتی وہ چیخ چیخ کر کہتی " میں کسی روز اس کا گلا گھونٹ دوں گی ۔ " لیکن ابھی تک یہ محض خالی خولی دھمکی ثابت ہوئی تھی ۔ سوفی نے جام کے بڑے مرتبان سے کاہو کا پتا نکالا اور کچھوے کے ڈبے میں ڈال دیا ۔

" ڈیر گوبند ' " اس نے کہا ۔ " تمہارا شمار تیز ترین جانوروں میں تو نہیں ہوتا لیکن جس وسیع و عریض دنیا میں ہم رہتے ہیں ' تم اس کا چھوٹا سا حصہ اپنے حواس سے ضرور دریافت کر سکتے ہو ۔ تمہیں اس حقیقت پر قناعت کرنا ہو گا کہ تم دنیا کی واحد مخلوق نہیں ہو جو اپنی بساط سے بڑھ کر کام نہیں کر سکتی ۔ "

شیری کان شاید باہر کہیں چوہے پکڑنے چلی گئی تھی ــــــ آخر بلی کی فطرت ہی یہی ہے ۔ سوفی نشستی کمرے میں سے گزرتی اپنی ماں کی خواب گاہ کی طرف چل پڑی ۔ راستے میں کافی کی میز پر ڈیفوڈل (daffodil) کے پھولوں کا گل دان پڑا تھا ۔ کچھ یوں نظر آرہا تھا کہ جب سوفی ان کے قریب سے گزری ' انہوں نے احترام سے اپنے سر جھکا دئے ہوں ۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک گئی ۔ پھر وہ اپنی انگلیاں ان کے ملائم سروں پر پھیرنے لگی ۔ " تمہارا تعلق بھی فطرت کے جان دار حصے سے ہے ۔ " اس نے کہا ۔ " فی الحقیقت تم جس گل دان میں پڑے ہو ' اس کے مقابلے میں تم کہیں زیادہ مراعات یافتہ ہو ۔ لیکن بدقسمتی سے تم اپنی خوش نصیبی کی قدر کرنا نہیں جانتے ۔ "

پھر سوفی پنجوں کے بل چلتی اپنی ماں کے کمرے میں چلی گئی ۔ اگرچہ اس کی امی بے سدھ پڑی تھی ' اس نے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا ۔

" آپ خوش قسمت ترین مخلوق میں شامل ہیں " اس نے کہا " کیونکہ آپ نہ

صرف باغیچے کے پھولوں کی طرح زندہ ہیں ' اور آپ نہ صرف شیری کان اور گوبند کی طرح زندہ ہیں ' بلکہ آپ انسان ہیں اور آپ غور و فکر کی نایاب صلاحیت سے بہرہ ور ہیں ۔"

"سوفی ' یہ تم کیا کہہ رہی ہو ؟"

اس کی امی معمول کی نسبت کہیں زیادہ تیزی سے جاگ گئی تھی ۔

"میں صرف یہ کہہ رہی تھی کہ آپ سست الوجود کھوے کی طرح نظر آ رہی ہیں۔ ورنہ میں آپ کو مطلع کر سکتی ہوں کہ میں نے فلسفیانہ مہارت کے ساتھ کمرے کی جھاڑ پونچھ کر دی ہے اور تمام چیزیں سلیقے سے رکھ دی ہیں ۔"

اس کی ماں نے سر اوپر اٹھایا۔

"میں ابھی ادھر آتی ہوں ۔ "اس نے کہا ۔ " کیا تم چولہے پر کافی کا پانی رکھ دو گی ؟"

سوفی نے ماں کے حکم کی تعمیل کر دی اور چند منٹ بعد وہ دونوں کافی ' جوس اور چاکلیٹ کے سامنے باورچی خانے میں بیٹھ گئیں ۔

اچانک سوفی نے کہا۔ " آپ نے کبھی سوچا کہ ہم زندہ کیوں ہیں ؟"

"خدا کے لیے دوبارہ شروع نہ جاؤ !"

"بالکل ہوں گی کیونکہ اب مجھے جواب مل گیا ہے ۔ انسان اس سیارے میں اس لیے موجود ہیں تاکہ ان میں سے کوئی ہر چیز کو کوئی نام دے سکے ۔"

"تم نے جو کچھ کہا کیا وہ صحیح ہے ؟ مجھے کبھی اس قسم کا خیال نہیں آیا۔"

"پھر آپ کو خاصا بڑا مسئلہ درپیش ہے کیونکہ انسان سوچنے والا جانور ہے ۔ اگر آدمی سوچتا نہیں ' پھر وہ صحیح معنوں میں انسان نہیں ۔"

"سوفی !"

"ذرا سوچیں ۔ اگر دنیا میں صرف پودے اور جانور ہی ہوتے ' پھر ؟ پھر کوئی بھی ' کتے ' اور ' بلی ' ' گلاب ' اور ' صنوبر ' کے مابین فرق نہ بتا سکتا ۔ نباتات اور حیوانات دونوں کا شمار ذی حیات چیزوں میں ہوتا ہے ' لیکن صرف ہم واحد مخلوق ہیں جو فطرت کو مختلف گروہوں اور زمروں میں تقسیم کر سکتی ہے ۔"

"تم جیسی عجیب لڑکی سے میرا واسطہ کبھی نہیں پڑا ۔"اس کی ماں نے کہا۔

"میرا بھی کچھ یہی خیال ہے ۔ "سوفی نے کہا ۔ "ہر شخص تھوڑا بہت عجیب و غریب ہوتا ہی ہے ۔میں بندہ بشر ہوں ' اس لیے میں تھوڑی بہت عجیب و غریب ہوں ۔

چونکہ میں آپ کی اکلوتی بیٹی ہوں، اس لیے میں انتہائی عجیب و غریب ہوں۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ جب تم اس قسم کی نئی باتیں کرنے لگتی ہو، مجھ پر خوف طاری ہونے لگتا ہے۔"

"پھر آپ آسانی سے ڈر جاتی ہیں۔"

اس سہ پہر بعد ازاں سوفی واپس اپنے خفیہ ٹھکانے چلی گئی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی ماں کی نگاہوں سے چھپتی چھپاتی بسکٹوں کا بڑا ڈبا اپنے کمرے میں لے آئی۔

سب سے پہلے اس نے تمام کاغذات ترتیب سے رکھے۔ پھر اس نے پنچ (punch) سے ان میں سوراخ کئے اور انہیں ارسطو کے باب کے نیچے باکس فائل میں رکھ دیا۔ آخر میں اس نے ہر صفحے کا نمبر اوپر کے دائیں کونے میں لکھا۔ کل پچاس صفحات بنے۔ سوفی نے فلسفے کے متعلق اپنی کتاب مرتب کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ اس کی اپنی تصنیف تو نہیں تھی لیکن تصنیف خاص طور پر اسی کے لیے کی گئی تھی۔

اس نے سوموار کے لیے گھر پر سکول کا جو کام کرنا تھا، اس کے لیے اسے وقت ہی نہ مل سکا۔ غالباً اس روز انہیں مذہبیات کا امتحان دینا تھا، لیکن ان کا استاد یہی کہتا تھا کہ وہ کیا مانتے ہیں اور کیا نہیں مانتے، اس کا فیصلہ وہ خود کریں۔ وہ جس نتیجے پر بھی پہنچیں، وہ اس کی قدر کرے گا۔ سوفی کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان معاملے میں اسے نئی بنیاد مل رہی ہے۔

12 - یونانیت

* * *

... آگ کی چنگاری ...

اگرچہ فلسفے کے استاد نے اپنے خطوط براہ راست باڑ میں بھیجنا شروع کر دئے تھے، تاہم سوفی نے سوموار کو کسی دوسری چیز کی نسبت محض عادتاً ڈاک ڈبے میں جھانک کر دیکھا۔

اسے یہ دیکھ کر کوئی تعجب نہ ہوا کہ ڈبا خالی تھا۔ وہ کلوور کلوز پر چلنے لگی۔

اچانک اسے ایک فوٹوگراف نظر آیا جو فٹ پاتھ پر پڑا تھا۔ اس پر سفید جیپ اور نیلے جھنڈے کی تصویر تھی۔ نیلے جھنڈے پر UN (اقوام متحدہ) کے حروف نقش تھے۔ کیا یہ اقوام متحدہ کا جھنڈا تو نہیں؟

سوفی نے تصویر الٹائی۔ اس نے دیکھا کہ یہ باقاعدہ پوسٹ کارڈ ہے اور اس پر پتا لکھا ہے: "ہلڈے مولر کنیگ بتوسط سوفی امنڈسین ..." اس پر ناروے کی ٹکٹ چسپاں تھی اور ڈاک مہر تھی: "یو این بٹالین، جمعہ، 15 جون 1990۔"

پندرہ جون! اس روز تو سوفی کی سال گرہ تھی!

کارڈ پر یہ عبارت تحریر تھی۔

ڈیر ہلڈے۔ میرا خیال ہے کہ تم اپنی سالگرہ پندرہ جون ہی کو منانے کی تیاریاں کر رہی ہوگی۔ یا اگلے روز تک ملتوی

کرنے کا ارادہ تو نہیں ؟ بہرحال اس سے تمہارے تحفے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک لحاظ سے یہ زندگی بھر تمہارا ساتھ دے گا۔ لیکن میں ایک بار پھر تمہیں سالگرہ کی مبارکباد دینا چاہوں گا۔ شاید اب تم سمجھ گئی ہوگی کہ میں کارڈ سوفی کے پتے پر کیوں بھیجتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انہیں تم تک پہنچا دے گی۔

پس تحریر:

تمہاری امی نے بتایا ہے کہ تمہارا بٹوا کہیں کھو گیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں بطور تلافی تمہیں ڈیڑھ سو کراؤن بھیج دوں گا۔ رہا سکول کا شناختی کارڈ، تمہیں غالباً گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے نیا مل جائے گا۔ پاپا کی طرف سے پیار۔

سوفی جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔ سابقہ کارڈ پر کون سی تاریخ کی مہر تھی؛ معلوم ہوتا تھا کہ جس کارڈ پر تفریحی ریتلے ساحل کی تصویر تھی، اس پر بھی جون کی تاریخ کی مہر تھی ــــــ حالانکہ ابھی اس تاریخ میں ایک مہینہ باقی تھا۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اسے توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور واپس گھر کے اندر بھاگ گئی۔ آج وہ یقیناً دیر سے سکول پہنچے گی!

اندر داخل ہوتے ہی وہ سیڑھیاں پھلانگتی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اسے ہلڈے کے نام پہلا پوسٹ کارڈ سرخ ریشمی سکارف کے نیچے مل گیا۔ بالکل! اس پر بھی پندرہ جون کی تاریخ ثبت تھی۔ یہی سوفی کی سال گرہ کا دن تھا اور یہی چھٹیوں سے پہلے سکول کا آخری دن تھا۔

جب وہ جوآنا کو اپنے ساتھ لینے سپر مارکیٹ کی طرف بھاگی جا رہی تھی، ا کے دماغ میں بھی دوڑ جاری تھی۔

یہ ہلڈے کون ہے؟ اس کے باپ نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ سوفی اسے تلاش کرلے گی؟ بہرحال اس کے باپ نے اپنی بیٹی کو براہ راست کارڈ بھیجنے کی بجائے انہیں سوفی کے پتے پر ارسال کرکے کوئی عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ اسے اپنی بیٹی کا پتا معلوم نہ ہو۔ یہ کوئی عملی مذاق ہے؟ کیا وہ کسی اجنبی لڑکی سے سراغ رساں اور ڈاکیے کا کام لے کر اپنی بیٹی کو اس کی سالگرہ پر حیران کرنا

چاہتا ہے؟ کیا سوفی کو ایک مہینے کا وقفہ اسی لیے دیا گیا ہے؟ کیا وہ اسے بچولی کے طور پر استعمال کرکے اپنی بیٹی کو بطور تحفہ نئی سہیلی دینا چاہتا ہے؟ کیا سوفی کوئی ایسا تحفہ ہے جو "زندگی بھر ساتھ دے گا"؟

اگر یہ مسخرا واقعی لبنان میں ہے، پھر اسے سوفی کا پتا کیسے معلوم ہوگیا؟ پھر سوفی اور ہلڈے کے مابین کم از کم دو باتیں مشترک ہیں۔ اگر ہلڈے کی سال گرہ پندرہ جون کو آتی ہے، پھر وہ دونوں ایک ہی روز پیدا ہوئی ہوں گی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ دونوں کے باپ کرہ ارض کے دوسرے کونے میں ہیں۔

سوفی کو محسوس ہونے لگا کہ اسے کسی غیر فطری دنیا میں کھینچا جارہا ہے۔ تاہم ـــــ اسے نتائج اخذ کرنے میں جلدبازی نہیں کرنا چاہیے ـــــ ممکن ہے کہ ان تمام باتوں کی کوئی فطری وضاحت موجود ہو۔ لیکن اگر ہلڈے للے سینڈ رہتی ہے، پھر البرٹو کنوکس کو اس کا بٹوا کیسے مل گیا؟ للے سینڈ سینکڑوں میل دور ہے۔ اور سوفی کو یہ پوسٹ کارڈ فٹ پاتھ پر کیوں ملا؟ جب ڈاکیا اس کے ڈاک ڈبے کے قریب پہنچا تھا کیا کارڈ اس کے تھیلے سے نیچے گر گیا تھا؟ اگر یہ بات درست ہے، پھر یہی کارڈ کیوں گرا؟

"کیا تم بالکل ہی پاگل تو نہیں ہوگئیں؟" جب سوفی بالآخر سپر مارکیٹ پہنچی، جو آنا پھٹ پڑی۔

"ساری!"

جو آنا کی استانی کی طرح بھویں تن گئیں اور وہ اسے گھور گھور کے دیکھنے لگی

"کوئی ڈھنگ کا بہانہ بناؤ۔" اس نے سخت لہجے سے کہا۔

"اس معاملے کا اقوام متحدہ سے کوئی تعلق ہے۔" سوفی نے کہا۔ "مجھے لبنان میں دشمن کے فوجیوں نے روک لیا تھا۔"

"یقیناً ...... تمہیں کسی سے محبت ہوگئی ہے!"

وہ پوری قوت سے سکول کی طرف بھاگنے لگیں۔

مذہبیات کا امتحان، جس کی تیاری کے لیے سوفی کو وقت نہیں ملا تھا، تیسرے پیریڈ میں ہوا۔ پرچے پر لکھا تھا:

زندگی اور رواداری کا فلسفہ

1۔ ان اشیا کی فہرست بناؤ جنہیں ہم جان سکتے ہیں۔ پھر ان اشیا کی فہرست بناؤ جن پر ہم صرف ایمان لا سکتے ہیں۔

2۔ چند ایک ایسے عناصر کی نشان دہی کرو جو آدمی کے فلسفہ حیات میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کرتے ہیں۔

3۔ ضمیر کا مفہوم کیا ہے؟ آپ کے خیال میں سب لوگوں کا ضمیر ایک جیسا ہوتا ہے؟

4۔ اقدار کی ترجیح سے کیا مراد ہے؟

پرچہ شروع کرنے سے پہلے سوفی کافی دیر بیٹھی سوچتی رہی۔ اس نے البرٹو کنوکس سے جو کچھ سیکھا تھا' کیا وہ اس میں سے چند خیالات استعمال کر سکتی ہے؟ اسے کرنا ہی پڑیں گے کیونکہ اس نے مذہبیات کی کتاب کئی دن سے نہیں کھولی تھی۔ جب اس نے لکھنا شروع کیا' الفاظ خود بخود اس کے قلم سے ٹپکنے لگے۔

اس نے لکھا: "ہم جانتے ہیں کہ چاند سبز پنیر سے نہیں بنا اور یہ کہ اس کے تاریک رخ پر شہاب ثاقب کے گرنے سے بڑے بڑے گڑھے بن چکے ہیں' یہ کہ سقراط اور یسوع دونوں کو سزائے موت ہوئی تھی' یہ کہ ہر شخص کو جلد یا بدیر مرنا ہے' یہ کہ ایکروپولس کے عظیم معبد پانچویں صدی قبل مسیح میں اہل فارس کے ساتھ جنگوں کے بعد تعمیر ہوئے تھے اور یہ کہ قدیم یونان کا اہم ترین ہاتف غیبی ڈیلفی کا ہاتف غیبی تھا۔"

جن باتوں پر ہم صرف ایمان لا سکتے ہیں' ان کی مثالوں کے سلسلے میں سوفی نے ان سوالات کا ذکر کیا: "کیا دوسرے ستاروں پر زندگی موجود ہے یا نہیں؟ خدا کا وجود ہے یا نہیں؟ کیا حیات بعد از ممات ہے؟ کیا یسوع خدا کا بیٹا تھا یا محض کسی عقل مند انسان کا؟" "ہمیں یہ یقیناً معلوم نہیں کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ہے!" اس نے اپنی فہرست مکمل کرتے ہوئے لکھا۔ "کائنات کا موازنہ کسی عظیم الجثہ خرگوش سے کیا جا سکتا ہے جسے کسی ناپ ہیٹ سے باہر نکال لیا گیا ہو۔ فلسفی خرگوش کی پوستین کے باریک بالوں

یہ بڑا مسئلہ ہی کی کوشش کرتے اور ساحر عظیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہتے ہیں۔ کیا وہ اس مسائل میں کامیاب ہو جائیں گے؟ اس سوال کا مختلف لوگوں نے مختلف جواب دیا ہے۔ لیکن صحیح جواب کیا ہے؟ اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اگر ہر فلسفی دوسرے فلسفی کے کندھوں پر سوار ہو جائے تو وہ خرگوش کی پوستین پر مزید اوپر چڑھ جائیں گے اور پھر میرے خیال میں انہیں کسی روز کامیاب ہونے کا موقع مل جائے گا۔

"یہی تحریر: انجیل میں ایک ایسی چیز کا ذکر موجود ہے جو خرگوش کی پوستین کا باریک بال ہو سکتی ہے۔ اس بال کو مینار بابل کہا جاتا تھا اور اسے اس لیے تباہ کر دیا گیا کیونکہ ساحر عظیم نہیں چاہتا تھا کہ ننھے انسانی کیڑے مکوڑے رینگتے رینگتے سفید خرگوش سے جسے اس نے ابھی ابھی تخلیق کیا تھا، اتنا اوپر نکل جائیں۔"

اگلا سوال تھا: "چند ایک ایسے عناصر کی نشان دہی کرو جو آدمی کے فلسفہ حیات میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کرتے ہیں۔" "یہاں پرورش، تربیت اور ماحول اہم ہیں۔ افلاطون کے زمانے کے لوگوں کا فلسفہ حیات آج کے بے شمار لوگوں کے فلسفہ حیات سے مختلف تھا کیونکہ وہ مختلف زمانے اور مختلف ماحول میں رہتے تھے۔ ایک اور عنصر وہ تجربہ ہے جس میں سے لوگ گزرنا چاہتے ہیں۔ عقل سلیم ماحول کی دین نہیں ہوتی۔ یہ ہر شخص میں موجود ہوتی ہے۔ غالباً ماحول اور معاشرتی صورت حال کا موازنہ ان حالات سے کیا جا سکتا ہے جو افلاطون کے زیر زمین غار میں پائے جاتے تھے۔ اپنی ذہانت کو بروئے کار لا کر افراد اپنے آپ کو ظلمت سے باہر نکال سکتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے سفر کے لیے ذاتی حوصلے اور جرات کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سقراط اس قسم کے شخص کی عمدہ مثال ہے جس نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اپنے آپ کو اپنے زمانے کے مروجہ نظریات سے آزاد کرانے کا اہتمام کر لیا تھا۔" آخر میں اس نے لکھا: "آج کل مختلف علاقوں اور مختلف ثقافتوں کے لوگوں کا باہمی اختلاط بڑھتا جا رہا ہے۔ عیسائی، مسلمان اور بدھ مت کے پیروکار ایک ہی عمارت کے فلیٹوں میں مل جل کر رہ سکتے ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو جائے پھر یہ پوچھنا اتنا اہم نہیں رہتا کہ سب لوگ ایک ہی چیز پر ایمان کیوں نہیں لے آتے، بلکہ ایک دوسرے کے عقائد کو تسلیم کرنا زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔"

"خاص برا جواب نہیں۔" سوفی نے سوچا۔ اسے یقیناً محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے فلسفے کے استاد سے جو کچھ سیکھا تھا، اس کی مدد سے وہ کچھ نہ کچھ لکھنے میں

کامیاب رہی ہے۔ اور اس نے دوسروں سے جو کچھ پڑھا اور سنا ہے، اس کی اور اپنی عقل سلیم کی کچھ مقدار شامل کرکے وہ اس میں مزید اضافہ کرسکتی ہے۔

اب اس نے اپنی توجہ کا مرکز تیسرا سوال بنایا۔ "ضمیر کا مفہوم کیا ہے؛ آپ کے خیال میں سب لوگوں کا ضمیر ایک جیسا ہوتا ہے؟" اس سوال پر ان کی کلاس میں کافی بحث ہوچکی تھی۔ سوفی نے لکھا: "ضمیر انسانوں کی اچھائی اور برائی کے متعلق اپنا ردعمل ظاہر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ میری ذاتی رائے میں ہر شخص کو یہ صلاحیت ودیعت ہوئی ہے۔ چنانچہ دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ صلاحیت طلقی ہے۔ سقراط بھی یہی بات کہتا۔ لیکن ضمیر آخر کس چیز کا حکم دیتا ہے، یہ مختلف اشخاص میں مختلف ہوسکتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوفطائیوں نے اس ضمن میں جو کچھ کہا تھا اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا خیال تھا کہ اچھائی اور برائی وہ باتیں ہیں جن کا تعین وہ ماحول کرتا ہے جس میں فرد کی پرداخت ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس سقراط کا خیال تھا کہ سب لوگوں کا ضمیر ایک جیسا ہوتا ہے۔ شاید دونوں ہی نقطہ ہائے نظر درست تھے۔ دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو بے لباس پیش کرنے پر ہر شخص اپنے آپ کو مجرم نہ بھی سمجھتا ہو، لیکن اگر دوسروں کے ساتھ کمینگی برتی جائے، تو اس قسم کا رویہ اختیار کرنے پر اکثر لوگوں کا ضمیر انہیں کچوکے ضرور دے گا۔ تاہم یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ باضمیر ہونا اور ضمیر کو استعمال کرنا ایک ہی چیز نہیں۔ بعض اوقات بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ لوگ بے ایمانی یا غیر اخلاقی حرکت کرنے میں ذرا عار محسوس نہیں کرتے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کے باطن میں دور کہیں کسی نہ کسی قسم کا ضمیر ضرور ہوتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح بعض لوگوں کو دیکھ کر بظاہر یہی احساس ہوتا ہے کہ عقل ان کے قریب بھی نہیں گزری۔ لیکن اصل بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ عقل ان لوگوں میں بھی ہوتی ہے لیکن وہ اسے استعمال نہیں کرتے۔ پس نوشت: عقل اور ضمیر دونوں کا موازنہ انسانی پٹھوں سے کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ اپنا کوئی پٹھا استعمال نہیں کریں گے، یہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتا جائے گا۔"

اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا تھا۔ "اقدار کی ترجیح سے کیا مراد ہے؟" یہ ایک اور بات تھی جس پر ان کی حال ہی میں خاصی بحث ہوچکی تھی۔ مثلاً کار چلانا اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک کم سے کم وقت میں پہنچنا قابل قدر ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر ڈرائیونگ کا نتیجہ جنگلات کی تباہی اور ماحول کی آلودگی کی صورت میں نکلتا ہے، پھر آپ

کو اقدار کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے ۔ بڑے انہماک سے غور و فکر کے بعد سوفی کو محسوس ہوا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ کم سے کم وقت میں کام پر پہنچنے کی نسبت صحت مند جنگلات اور پاکیزہ ماحول کہیں زیادہ قابل قدر ہیں ۔ اس نے متعدد مزید مثالیں دیں ۔ آخر میں اس نے لکھا : " ذاتی طور پر میں سمجھتی ہوں کہ انگلش گرامر کی نسبت فلسفہ کہیں زیادہ اہم مضمون ہے ۔ چنانچہ اقدار کی سمجھدارانہ ترجیح یہی ہونا چاہیے کہ فلسفہ نصاب میں شامل کیا جائے اور انگریزی کے اسباق کی تعداد ذرا کم کردی جائے ۔"

آخری وقفے کے دوران میں سوفی کا استاد اسے ایک طرف لے گیا۔

" میں تمہارا مذہبیات کا پرچہ پڑھ چکا ہوں ۔ "اس نے کہا ۔ "یہ پرچوں کے ڈھیر میں تقریباً سب سے اوپر پڑا تھا ۔"

" مجھے امید ہے کہ اسے پڑھ کر آپ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے ۔"

"بالکل اسی قسم کی بات میں تم سے کرنا چاہتا تھا ۔ کئی اعتبار سے تمہارے پرچے میں بڑی بالغ نظری کا مظاہرہ کیا گیا ہے ۔ آدمی کو واقعی تعجب ہوتا ہے ۔ پھر تم نے دوسروں سے کچھ نہیں لیا ، جو کچھ لکھا ہے خود لکھا ہے ۔ لیکن سوفی ، تم نے تیاری کی تھی ؟"

سوفی کچھ کچھ مضطرب ہو گئی اور یونہی اپنی انگلیوں سے کھیلنے لگی ۔

"خیر ، آپ نے خود فرمایا تھا کہ یہ بات بہت اہم ہے کہ آدمی کا کوئی اپنا نقطہ نظر ہو ۔"

"ہاں ، میں نے کہا تھا. . . لیکن اس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ۔"

سوفی نے اپنی نگاہیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں ۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے حال ہی میں جس تجربے میں سے گزرنا پڑا تھا ، اس کے بعد وہ اس قسم کی حرکت کرسکتی ہے ۔

" میں نے فلسفہ پڑھنا شروع کردیا ہے ۔ "اس نے کہا ۔ "یہ ذاتی رائے بنانے کے لیے اچھا پس منظر مہیا کرتا ہے ۔"

" لیکن اس سے مجھے تمہارا پرچہ جانچنے میں آسانی نہیں رہتی ۔ میں یا تو تمہیں A گریڈ دوں گا یا پھر D ۔"

"شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ یا تو میرا جواب بالکل صحیح ہوگا یا پھر بالکل غلط ۔ آپ کا مطلب یہی ہے ؟"

"اس مرتبہ تو میں نے تمہیں اے گریڈ دے دیا ہے لیکن اگلی مرتبہ کتاب سے تیاری کر کے آنا!"

جب اس سہ پہر سوفی سکول سے گھر پہنچی ، اس نے اپنا بستہ باہر کی سیڑھیوں پر پھینک دیا اور اپنے مخفیہ ٹھکانے کی طرف بھاگ پڑی ۔ تڑی مڑی اور عمر رسیدہ جڑوں پر خاکی لفافہ پڑا تھا ۔ اس کے کنارے بالکل خشک تھے ، چنانچہ اسے کافی دیر پہلے یہاں پھینکا گیا ہو گا ۔

سوفی نے لفافہ پکڑا اور گلی کے سامنے کے دروازے سے اپنے مکان کے اندر چلی گئی ۔ اس نے جانوروں کو دانہ دنکا کھلایا اور پھر اوپر اپنے کمرے کا رخ کیا ۔ وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی ، اس نے البرٹو کا خط کھولا اور پڑھنے لگی ۔

یونانیت

تو سوفی ، ایک بار پھر ہمارا ناکرا ہوگیا ۔ فطرتی فلسفیوں اور سقراط ، افلاطون اور ارسطو کا مطالعہ کرنے کے بعد تم یورپی فلسفے کی بنیادوں سے واقف ہوچکی ہو ۔ چنانچہ اب ان تمہیدی سوالات کی ضرورت نہیں رہی جو تمہیں سفید لفافوں میں ملا کرتے تھے ۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں غالباً استادوں سے گھر پر کرنے کے لیے کافی کام ملتا ہوگا اور تمہارے امتحان بھی ہوتے رہتے ہوں گے ۔

اب میں تمہیں اس طویل زمانے کے متعلق بتاؤں گا جو مسیح کی پیدائش سے تقریباً چار سو سال قبل ارسطو کے عہد سے شروع ہوتا ہے اور 400. کے لگ بھگ ، جب ابتدائی قرون وسطیٰ کا آغاز ہوتا ہے ، اختتام پذیر ہوتا ہے ۔ دیکھو اب ہم ق م اور سن عیسوی دونوں لکھ سکتے ہیں کیونکہ عیسائیت اس دور کی ایک اہم ترین اور پراسرار ترین عنصر تھی ۔

ارسطو کا انتقال 322 ق م میں ہوا ۔ اس وقت ایتھنز اپنے ہمہ مقتدر کردار سے محروم ہوچکا تھا ۔ سکندر اعظم (356 ق م تا

323 ق م) کی فتوحات کے نتیجے میں جو سیاسی اتھل پتھل ہوئی تھی ، اس کا بھی اس نئی صورت حال کے پیدا کرنے میں کم حصہ نہیں تھا۔

سکندر اعظم مقدونیہ کا بادشاہ تھا ۔ ارسطو کا تعلق بھی مقدونیہ سے تھا اور کچھ عرصہ تو وہ نوجوان سکندر کا اتالیق بھی رہا تھا ۔ یہ سکندر ہی تھا جسے اہل فارس پر آخری اور فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی ۔ اور مزید برآں ، سوفی ، اس نے اپنی متعدد فتوحات کے ذریعے دونوں مصر اور ہندوستان تک مشرق کو یونانی تہذیب کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔

یہاں سے انسانی تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ۔ اب ایک ایسی تہذیب وجود میں آئی جس میں یونانی ثقافت اور یونانی زبان نے قائدانہ کردار ادا کیا ۔ یہ دور ، جو تقریباً تین سو سال پر محیط ہے ، یونانیت (Hellenism) کہلاتا ہے ۔ یونانیت یا Hellenism کی اصطلاح ایک عہد کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے اور اس ثقافت کے لیے بھی جس پر یونانیوں کی چھاپ لگی ہوئی تھی اور جو تین یونانی مملکتوں ـــــ مقدونیہ ، شام اور مصر ـــــ میں مروج تھی۔

تاہم مسیح کی پیدائش سے تقریباً پچاس سال قبل عسکری اور سیاسی امور میں روم کو تغلب حاصل ہوگیا ۔ نئی سپر پاور (super power) نے بتدریج تمام یونانی سلطنتوں کو مسخر کرلیا اور اس کے بعد مغرب میں ہسپانیہ سے لے کر مشرق وسطیٰ تک رومی ثقافت اور لاطینی زبان کا پلہ بھاری ہوگیا ۔ یہ رومی عہد کا آغاز تھا ۔ اسے ہم اکثر متاخر عہد عتیق (Late Antiquity) کہتے ہیں ۔ لیکن تمہیں ایک بات یاد رکھنا چاہیے ـــــ رومیوں کے یونانی دنیا کو مسخر کرنے سے پہلے خود روم یونانی ثقافت کا ایک صوبہ تھا۔ چنانچہ یونانیوں کے سیاسی اثرورسوخ کے قصہ پارینہ کے بننے کے بعد بھی یونانی ثقافت اور یونانی فلسفہ اہم کردار ادا کرتے رہے۔

مذہب، فلسفہ اور سائنس

یونانیت کا ایک وصف یہ حقیقت تھی کہ مختلف ملکوں اور ثقافتوں کے مابین حدبندیاں نیست ونابود ہوگئیں۔ اس سے پہلے یونانی، رومی، مصری، شامی اور اہل فارس اس چیز کے اندر، جسے عام طور پر "قومی مذہب" کہا جاتا ہے، اپنے اپنے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ اب مختلف ثقافتیں یوں آپس میں گھل مل گئیں جیسے مختلف مذہبی، سائنسی اور فلسفیانہ خیالات کو کسی عظیم جادوگرنی کے کڑھاؤ میں پکا اور یک جان کردیا گیا ہو۔

ہم شاید کہہ سکتے ہیں کہ شہری چوک کی جگہ عالمی اکھاڑے نے لے لی تھی۔ شہروں کے قدیم چوک بھی متنوع آوازوں سے بھنبھناتے رہتے تھے۔ یہاں دنیا بھر کی اشیا اور خیالات کی یلغار ہوتی رہتی تھی۔ ہر ملک اور ہر قوم کی زبان سننے کو ملتی تھی۔

ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں کہ یونانی نکرحیات یونان کے سابقہ ثقافتی علاقوں تک محدود نہیں رہی تھی، بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہوچکا اور یہ بہت دور دور تک پھیل چکا تھا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، بحیرہ روم کے ساحلوں پر واقع ممالک میں مشرقی دیوتاؤں کی پرستش بھی شروع ہوگئی۔ مذہب کی نئی نئی صورتیں نمودار ہونے لگیں جو متعدد قدیم اقوام کے دیوتاؤں اور عقاید کو جب جی چاہتا، اپنا جزو بنا لیتیں۔ اسے اختلاط عقاید (syncretism) کہتے ہیں۔

اس سے پہلے لوگوں کو اپنی برادری اور اپنی شہری مملکت کے ساتھ مضبوط ناتے کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن جب سرحدیں اور حد بندیاں نابود ہوگئیں، بے شمار لوگوں کو اپنے فلسفہ حیات کے متعلق شکوک اور بے یقینی کا تجربہ ہونے لگا۔ متاخر عہد عتیق کی عمومی خصوصیات مذہبی شکوک، ثقافتی شکست و ریخت اور قنوطیت ہیں۔ یہ کہا جانے لگا کہ "دنیا بوڑھی ہوگئی ہے۔

یونانیت کے عہد کے دوران میں جو آئے روز نئے نئے مذہبی رجحانات اور فرقے تشکیل پا رہے تھے، ان میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ اکثر اپنی تعلیمات میں اس چیز پر زور دیتے رہتے تھے کہ انسان موت سے کس طرح نجات حاصل کرسکتا ہے۔ ان کی تعلیمات کا یہ حصہ عموماً رازدارانہ ہوتا تھا۔ ان تعلیمات کو تسلیم کرنے اور بعض رسوم کی ادائیگی کرنے کے بعد معتقد کو بقائے روح اور ابدی زندگی کی امید ہوسکتی تھی۔ روح کی نجات کے لیے جتنی رسوم کی ادائیگی لازمی تھی اتنی ہی یہ بات بھی ضروری تھی کہ آدمی کائنات کی صحیح فطرت کے متعلق خاص قسم کی بصیرت حاصل کرے۔

سوفی، نئے مذاہب کے متعلق اتنا ہی کافی ہے۔ لیکن فلسفہ بھی روز بروز "نجات" اور شانتی کی سمت میں قدم بڑھا رہا تھا۔ اب یہ سمجھا جانے لگا کہ فلسفیانہ بصیرت نہ صرف اپنا اجر آپ ہے، بلکہ اسے بنی نوع کو قنوطیت اور خوف مرگ سے بھی چھٹکارا دلانا چاہیے۔ یوں فلسفے اور مذہب کے مابین حدبندیاں بتدریج خارج کردی گئیں۔

عمومی اعتبار سے یونانیت کے فلسفے میں کوئی ایسی نئی بات یا اپج نہیں تھی کہ آدمی اس پر دنگ رہ جائے۔ کوئی نیا افلاطون یا ارسطو منظرعام پر نہ آیا۔ اس کے برعکس ایتھنز کے تینوں عظیم فلسفیوں کے افکار نے متعدد فلسفیانہ رجحانات کو ہوا دی جن کا میں ابھی اجمالی خاکہ پیش کروں گا۔

یونانی سائنس بھی مختلف ثقافتوں سے حاصل کردہ علوم کے امتزاج سے متاثر ہوئی۔ یہاں سکندریہ کے شہر نے، کہ یہ مغرب اور مشرق کے مابین نقطہ اتصال تھا، کلیدی کردار ادا کیا۔ ایتھنز فلسفے کے مرکز کی حیثیت سے ضرور موجود رہا کیونکہ یہاں افلاطون اور ارسطو کے بعد بھی فلسفے کے مدرسے چلتے رہے، لیکن سائنس کا مرکز سکندریہ بن گیا۔ اپنی وسیع و عریض لائبریری کی بنا پر یہ ریاضی، فلکیات، حیاتیات اور طب کے علوم کی تدریس و تحقیق کا مرکز بن گیا۔

یونانی ثقافت کا موازنہ بخوبی آج کی دنیا سے کیا جاسکتا

ہے ۔ بیسویں صدی بھی ایک ایسی تہذیب سے متاثر ہوئی ہے جو روز بروز نئے نئے خیالات کو اپنے اندر سمو رہی ہے اور ان نئے نئے خیالات کی یلغار کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ مذہب اور فلسفہ بے پناہ اتھل پتھل کا شکار ہونے لگے ہیں ۔ اور جس طرح مسیحی دور کے آغاز میں یونانی ، مصری اور مشرقی مذاہب کے پیروکار روم میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلتے نظر آتے تھے ، بعینہٖ آج جب ہم بیسویں صدی کے اختتام کو چھونے لگے ہیں ، ہمیں یورپ کے سارے چھوٹے بڑے شہروں میں دنیا کے تمام خطوں کے مذاہب کے پیروکار مل جاتے ہیں۔

آج ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ پرانے اور نئے مذہبوں ، فلسفوں اور سائنسوں کا اختلاط کس طرح " زندگی کا نقطہ نظر " کی منڈی میں نئی پیشکشوں کی بنیاد تشکیل دے سکتا ہے ۔ دراصل اس " نئے علم " کا بیشتر حصہ پرانے خیالات ہی کے ، جن میں سے چند ایک کی جڑیں واپس یونانیت تک پہنچتی ہیں ، بچے کھچے آثار ہیں جو نابود ہونے سے بچ گئے تھے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ سقراط ، افلاطون اور ارسطو نے جو سوالات اٹھائے تھے ، یونانیت کا فلسفہ انہی سے برسر پیکار رہا ۔ ان سب مکاتب فکر میں مشترک بات ان کی یہ خواہش تھی کہ یہ دریافت کیا جائے کہ انسان کس بہترین طریقے سے زندگی گزار سکتا اور موت قبول کرسکتا ہے ۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی درد سری اخلاقیات تھی ۔ نئی تہذیب میں یہ مرکزی فلسفیانہ پراجیکٹ بن گئی ۔ بڑا زور اس بات پر تھا کہ کسی طرح یہ معلوم کیا جائے کہ سچی خوشی کیا ہے اور اس کا حصول کیسے ممکن ہے ۔ ہم ان میں سے چار فلسفیانہ رجحانات کا جائزہ لیں گے ۔

کلبی

کہانی کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز سقراط کسی ریہڑے کے سامنے ، جس پر دنیا جہان کی اشیا برائے فروخت

رکھی ہوئی تھیں ، کھڑا اسے بغور دیکھ رہا تھا ۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ پکار اٹھا : "یہاں کتنی اشیا ہیں جن کی مجھے کوئی ضرورت نہیں!"

سقراط کا یہ بیان کلبی (Cynic) دبستان فلسفہ کا ماٹو (motto) کہا جاسکتا ہے ۔ اس دبستان کی بنیاد انتیس تھینس (Antisthenes) نے مسیح کی پیدائش سے تقریباً چار سو سال پہلے ایتھنز میں رکھی تھی ۔

انتیس تھینس سقراط کا شاگرد تھا اور اسے اس کی کفایت شعاری میں خاص طور پر دلچسپی پیدا ہوگئی تھی ۔

کلبی اس بات پر زور دیتے تھے کہ سچی خوشی مادی تعیشات ، سیاسی قوت یا اچھی صحت جیسے خارجی فوائد سے نہیں ملتی ۔ سچی خوشی کا انحصار اس قسم کی انگل بچو اور عارضی اشیا پر نہیں ہوتا ۔ اور چونکہ سچی خوشی اس طرح کے مفادات کے تابع نہیں ہوتی ، اس تک ہر شخص کی رسائی ہوسکتی ہے ۔ مزید برآں ، اگر یہ ایک مرتبہ دستیاب ہوجائے ، پھر اس کے چھننے کا کبھی امکان نہیں رہتا ۔

مشہور ترین کلبی دیوجانس (Diogenes) تھا ۔ وہ انتیس تھینس کا شاگرد تھا اور مشہور ہے کہ وہ مدور پیپے (barrel) میں رہتا تھا ۔ اس کے پاس ایک چغے ، چھڑی اور روٹیوں کے تھیلے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا ۔ (چنانچہ اس کی خوشی چرانا کوئی آسان کام نہیں تھا !) ایک روز جب وہ اپنے پیپے کے پاس بیٹھا دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا ، سکندر اعظم اس سے ملاقات کے لیے آیا ۔ امپراطور اس کے سامنے کھڑا ہوگیا اور پوچھنے لگا : "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں ؟ آپ کو جس چیز کی بھی خواہش ہو ، آپ کو پیش کردی جائے گی ۔ " "ہاں ، مجھے ایک چیز چاہیے ۔ "دیوجانس نے جواب دیا " ذرا ہٹ کر کھڑے ہوجائیں ، آپ نے دھوپ روک رکھی ہے ۔ "یوں دیو جانس نے اپنے جواب سے جتا دیا کہ وہ اس عظیم انسان سے ، جو اس کے سامنے کھڑا تھا ، کم خوش اور مرفہ الحال نہیں ۔ اسے جو کچھ چاہیے تھا وہ سب اس کے پاس موجود تھا ۔

کلبیوں کا عقیدہ تھا کہ لوگوں کو اپنی صحت کے بارے میں مشوش ہونے کی ضرورت نہیں ۔ دکھ اور موت سے بھی انہیں کسی قسم کی پریشانی لاحق نہیں ہونا چاہیے اور نہ انہیں دوسروں کے مصائب کے متعلق فکر کرکے اپنی جان ہلکان کرنا چاہیے ۔

آج کل " کلبی " اور " کلبیت " کا مفہوم تبدیل ہوگیا ہے ۔ اب " کلبی " اس شخص کو کہتے ہیں جو انسانی خلوص پر شک و شبے کا اظہار کرتا اور دوسروں کے دکھ درد کے معاملے میں بے نیاز اور بے حس ہوتا ہے ۔

رواقی

کلبی رواقی (Stoic) دبستان فلسفہ کی ، جو ایتھنز میں لگ بھگ تین سو سال قبل از مسیح پروان چڑھا ، ترویج کا وسیلہ بنے ۔ اس کا بانی زینو (Zeno) (تقریباً 334 ق م تا تقریباً 262 ق م) تھا ۔ وہ اصل میں قبرص سے آیا تھا ۔ اس کا جہاز سمندر میں تباہ ہوگیا تھا اور وہ کسی طرح بچتا بچاتا ایتھنز پہنچ گیا ۔ یہاں وہ کلبیوں میں شامل ہوگیا ۔ وہ اپنے پیروکاروں کو ایک پورٹیکو (portico = پورچ یا برآمدہ) کے نیچے اکٹھا کرلیا کرتا تھا ۔ "رواقی" کا ہم معنی انگریزی لفظ stoic یونانی لفظ stoa سے مشتق ہے جس کا مطلب پورٹیکو ہے ۔ رواقیت (stoicism) نے بعد ازاں رومی ثقافت کے لیے بڑی اہمیت اختیار کرنا ہے ۔

ہیراکلی توس کی طرح رواقیوں کا بھی عقیدہ تھا کہ ہر شخص یکساں عقل سلیم ——— یا logos (1) کا جزو ہے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر شخص اپنی ذات میں عالم صغیر (microcosmos) ہے جو عالم کبیر (macrocosmos) کی پرچھائیاں ہے ۔

اس سے یہ تصور ابھرا کہ کوئی آفاقی راستی (universal rightness) یا نام نہاد قانون فطرت موجود ہے ۔ چونکہ یہ آفاقی قانون وقت کی قید سے ماورا (timeless) انسانی اور آفاقی عقل پر مبنی ہے ، یہ زمان و مکان کو تبدیل نہیں کرتا ۔ اس معاملے میں

رواقی سوفسطائیوں کے برعکس ارسطو کے طرف دار تھے۔

قانون فطرت تمام بنی نوع انسان پر، جن میں غلام بھی شامل ہیں، حاوی ہے۔ رواقی سمجھتے تھے کہ مختلف ملکوں کے قانونی قواعد وضوابط اس "قانون" کی نامکمل نقول ہیں جو خود فطرت میں جبلی سے گزرا ہوا ہے۔

جس طرح رواقیوں نے فرد اور کائنات کے مابین تمیز مٹا دی، اسی طرح وہ اس بات سے بھی انکاری تھے کہ "روح" (spirit) اور "مادے" (matter) کے مابین کوئی کشمکش ہوسکتی ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ فطرت صرف ایک ہے۔ اس قسم کے تصور کو احدیت (monism) (2) کہا جاتا ہے۔ (اس کے مقابلے میں افلاطون واضح طور پر ثنویت (dualism) یا دوہری حقیقت کا قائل تھا۔)

اپنے عہد کے سچے فرزند ہونے کی حیثیت سے رواقی واضح طور پر "وسیع المشرب" (cosmopolitan) تھے کیونکہ وہ "بیرل فلسفیوں" (یعنی کلبیوں) کی نسبت معاصر ثقافت کو قبول کرنے کے لیے زیادہ آمادہ تھے۔ وہ اس طرف توجہ دلاتے تھے کہ تمام انسان ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ وہ سیاست میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیتے تھے اور ان میں سے کئی ایک، خاص طور پر رومی امپراطور مارکس اوریلئس (Marcus Aurelius) (121 تا 180ء)، فعال مدبر تھے۔ انہوں نے روم میں یونانی فلسفے اور ثقافت کی حوصلہ افزائی کی۔ ان میں سے ایک خوش بیان مقرر، فلسفی اور مدبر گرویا سسرو (Cicero) (106 ق م تا 43 ق م) تھا۔ سسرو ہی وہ شخص ہے جس نے "انسان دوستی" (humanism) کا ــــــ یعنی زندگی کے بارے میں ایک ایسا نقطہ نظر جس میں توجہ کا مرکز فرد ہوتا ہے ــــــ تصور پیش کیا تھا۔ چند سال بعد روم کے رواقی فلسفی سینیکا (Seneca) (04 تا 65ء) نے کہا: "بنی نوع انسان کے نزدیک بنی نوع انسان مقدس ہے۔" تب سے یہ "انسان دوستوں" کا نعرہ چلا آرہا ہے۔

مزید برآں رواقی اس بات پر زور دیتے تھے کہ تمام فطری عمل کاریاں (processes) (جیسے موت یا بیماری) فطرت کے

ناقابل شکست قوانین کی پابندی کرتی ہیں - چنانچہ انسان کو اپنی تقدیر قبول کرنا سیکھنا چاہیے - کوئی بھی چیز اتفاقاً ظہور پذیر نہیں ہوتی - ہر چیز کے وقوع پذیر ہونے میں جبر کا عمل دخل ہوتا ہے - چنانچہ جب قسمت دروازے پر دستک دیتی ہے، شکایت کرنا لاحاصل ثابت ہوتا ہے - ان کا خیال تھا کہ آدمی کو زندگی کے پرمسرت وقوعے بھی ذہنی توازن کھوئے بغیر قبول کرنا چاہئیں - اس معاملے میں وہ کلبیوں کے بھائی بند معلوم ہوتے ہیں جن کا دعویٰ تھا کہ تمام خارجی واقعات غیر اہم ہیں - آج بھی ہم ایک ایسے شخص کے لیے، جو جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے، stoic calm (مشکلات و مصائب کو شکایت کئے بغیر پرسکون انداز سے برداشت کرنا) کی ترکیب استعمال کرتے ہیں -

اپی قور

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سقراط کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ انسان اچھی زندگی کیسے گزار سکتا ہے - کلبیوں اور رواقیوں دونوں نے اس کے فلسفے کی جو تشریح کی، اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ انسان کو مادی تعیشات سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے - لیکن سقراط کا ایک اور شاگرد بھی تھا - اس کا نام ارستی پوس (Aristippus) (تقریباً 435 ق م تا 356 ق م) تھا - اس کا ایقان تھا کہ زندگی کا مقصد یہ ہے کہ حواس کے ذریعے ممکن حد تک اعلیٰ ترین لذت حاصل کی جائے - "اعلیٰ ترین اچھائی لذت ہے -" اس کا مقولہ تھا - "اور بدترین برائی دکھ ہے -" چنانچہ وہ ایک ایسے طرز حیات کو پروان چڑھانا چاہتا تھا جس کا مقصد دکھ اور تکلیف کی تمام صورتوں سے بچنا ہے - (کلبی اور رواقی ہر قسم کی تکلیف اور دکھ برداشت کرنے میں یقین رکھتے تھے - یہ دکھ سے بچنے کی کوشش کرنے سے مختلف چیز ہے -)

مسیح کی پیدائش سے تقریباً تین سو سال قبل اپی قورس (Epicurus) (341 ق م تا 270 ق م) نے ایک فلسفے کے

مدرسے کی بنیاد رکھی ۔ اس کے پیروکاروں کو ایپی قور (-Epicur eans) کہا جاتا ہے ۔ اس نے ارستی پوس کے فلسفہ لذت کو آگے بڑھایا اور اسے دیموکری توس کے ایٹم کے نظریے کے ساتھ ملا دیا۔

کہانی یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایپی قور کسی باغ میں رہتے تھے ۔ چنانچہ انہیں "گلستان کے فلسفی" کہا جاتا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ باغ کے دروازے پر ایک کتبہ آویزاں تھا ۔ اس پر لکھا تھا : "اجنبی ، تم یہاں اچھی زندگی گزارو گے ۔ یہاں لذت اعلیٰ ترین اچھائی سمجھی جاتی ہے ۔"

ایپی قور ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ کسی فعل کے پرلذت نتائج کو اس کے ممکنہ ناگوار ضمنی اثرات کے مقابلے میں رکھ کر دیکھنا چاہیے ۔ اگر تم نے کبھی چاکلیٹ کے معاملے میں حرص کا مظاہرہ کیا ہو ، تو تم میرا مطلب سمجھ جاؤ گی ۔ اگر نہیں ، پھر یہ کام کرکے دیکھو ۔ تم نے اپنے جیب خرچ سے جو کچھ بچایا ہے ، اس میں سے دو سو کراؤن کے چاکلیٹ خرید لو ۔ (ہم نے فرض کرلیا ہے کہ تمہیں چاکلیٹ پسند ہیں ۔) اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ تم سارے چاکلیٹ ایک ہی بار کھا جاؤ ۔ جب تم سارے چاکلیٹ کھا چکی ہوگی ، اس کے آدھ گھنٹے بعد تمہیں محسوس ہوگا کہ ایپی قور کا ناگوار ضمنی اثرات سے کیا مطلب تھا۔

ایپی قوروں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ قلیل مدت میں جو پرلذت نتیجہ حاصل ہوتا ہے اس کا موازنہ اس امکان سے کیا جانا چاہیے کہ شاید طویل مدت میں کہیں بڑھ کر ، زیادہ دیرپا اور زیادہ شدید لطف حاصل ہوجائے (ممکن ہے تم پورا سال چاکلیٹ کھانے سے پرہیز کرو کیونکہ تم اپنا جیب خرچ بچانا اور بائیسکل خریدنا یا کسی غیر ملک میں مہنگی تعطیلات منانا چاہتی ہو ۔) جانوروں کے برعکس ہم اپنی زندگیاں منصوبے کے مطابق بسر کرنے پر قادر ہیں ۔ ہم میں " لذت کا تخمینہ " لگانے کی صلاحیت ہے ۔ چاکلیٹ مزے دار چیز ہے لیکن بائیسکل خریدنے یا انگلستان کی سیر کرنے میں اس سے بھی زیادہ مزہ آتا ہے۔

تاہم اپیی قور اس بات پر زور دیتا تھا کہ "لذت" کا لازماً مطلب جسمانی یا جنسی خواہشات کی ـــــ مثلاً چاکلیٹ کھانا ـــــ تکمیل نہیں ہے ۔ دوستی یا آرٹ کی تحسین جیسی اقدار بھی اہمیت کی حامل ہیں ۔ مزید برآں قدیم یونانی معیار ـــــ ضبطِ نفس، (کھانے پینے میں) اعتدال اور طمانیت قلب ـــــ پیش نظر رکھنا لازمی ہیں ۔ خواہشات کو لگام دی جانا چاہیے اور طمانیت ہمیں دکھ برداشت کرنے میں مدد دے گی۔

متعدد لوگوں کو دیوتاؤں کا خوف اپیی قور کے باغ میں کھینچ لایا ۔ اس سلسلے میں دیموکری توس کا ایٹم کا نظریہ مفید تریاق تھا ۔ اچھی زندگی گزارنے کے لیے موت کے خوف پر غالب آنا غیر اہم نہیں ۔ اس مقصد کے لیے اپیی قور نے دیموکری توس کے "روحی ایٹموں" (soul atoms) کے نظریے کو استعمال کیا ۔ تمہیں شاید یاد ہوگا کہ دیموکری توس کا عقیدہ تھا کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں کیونکہ جب ہمارا انتقال ہوجاتا ہے، "روحی ایٹم" فضا میں چاروں طرف منتشر ہوجاتے ہیں۔

"موت ہمارا معاملہ نہیں ۔" اپیی قور بڑی سادگی سے کہتا تھا ۔ "کیونکہ جب تک ہم یہاں موجود ہیں موت عدم موجود ہے اور جب یہ آتی ہے، پھر ہم موجود نہیں رہتے ۔" (اور اگر تم اس بارے میں سوچو، تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ مردہ کبھی نہیں بتاتا کہ وہ اپنی موت پر پریشان ہے ۔)

اپیی قور نے اپنے بے جا قدغنوں سے نجات دلانے والے فلسفے کا خلاصہ ان اشیا کے حوالے سے بیان کیا جنہیں وہ علاج معالجے کی چار جڑی بوٹیاں کہتا تھا:

دیوتاؤں سے خوف نہیں کھانا چاہیے ۔ موت سے پریشانی نہیں ہونا چاہیے ۔ اچھائی کا حصول آسان ہے ۔ ہیبت ناک صورت حال یا چیز کو برداشت کرنا سہل ہے ۔

یونانی نقطہ نظر سے فلسفیانہ افکار کا طبی افکار سے موازنہ کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی ۔ نیت محض یہ تھی کہ انسان کو چاہیے

کہ وہ اپنے آپ کو " فلسفیانہ ادویات کے صندوقچے " سے مسلح کرے جس میں وہ چاروں اجزا موجود ہوں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

رواقیوں کے مقابلے میں ایپی قوروں کو سیاست میں دلچسپی یا تو مطلق نہیں تھی یا برائے نام تھی۔ ایپی قور کا مشورہ تھا: "عزلت کی زندگی گزارو!" ہم شاید اس کے "باغ" کا موجودہ زمانے کے کمیونوں (communes) سے موازنہ کرسکتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں جنھوں نے معاشرے سے دور "محفوظ پناہ گاہیں" ڈھونڈ لی ہیں۔

ایپی قور کے بعد بے شمار ایپی قوروں نے لذت پرستی پر ضرورت سے زیادہ زور دینا شروع کردیا۔ ان کا ماٹو تھا: "صرف لمحہ حال میں زندہ رہو!" آج کل لفظ "ایپی قور" (epicurean) منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو محض تلذذ کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔

نو افلاطونیت

جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ کلبیت، رواقیت اور ایپی قوریت سب کی جڑیں سقراط کی تعلیمات میں پیوست تھیں۔ انھوں نے قبل از سقراط کے زمانے کے بعض فلسفیوں (مثلاً ہیراکلی توس اور دیموکری توس) کی تعلیمات سے بھی استفادہ کیا تھا۔

لیکن یونانیت کے متاخر زمانے کے اہم ترین فلسفیانہ رجحان نے سب سے زیادہ افلاطون کے فلسفے سے فیضان حاصل کیا تھا۔ چنانچہ ہم اس رجحان کو "نو افلاطونی" کہتے ہیں۔

نو افلاطونی فلسفے کی اہم ترین شخصیت پلوتی نوس (Plotinus) (تقریباً 205 تا 270ء) کی تھی۔ اس یونانی فلسفی نے فلسفے کی تعلیم سکندریہ میں پائی تھی لیکن بعد ازاں وہ روم میں آباد ہوگیا۔ جاننے کی اہم بات یہی ہے کہ وہ سکندریہ سے آیا تھا اور سکندریہ

وہ شہر تھا جو کئی صدیوں سے یونانی فلسفے اور مشرقی سریت (mysticism) کے اتصال کا مرکزی مقام تھا ۔ پلوتی نوس اپنے ساتھ نجات کا ایک ایسا نظریہ لایا جس نے بعد ازاں عیسائیت کا ، جب اس کا وقت آیا ، حریف بننا تھا ۔ تاہم نو افلاطونیت نے عیسائیوں کے اس فلسفہ مذہب پر ، جس کی اکثریت پیروی کرتی تھی ، گہرا اثر ڈالا۔

سوفی ، تمہیں افلاطون کا نظریہ امثال اور اس نے جس انداز سے دنیائے امثال اور دنیائے حواس کے مابین خط امتیاز کھینچا تھا ، یاد ہے ؟ اس کا مطلب روح اور جسم کے مابین واضح تقسیم قائم کرنا تھا ۔ یوں انسان ثنوی (dual) مخلوق بن گیا : دنیائے حواس کی ہر دوسری چیز کی طرح ہمارا جسم مٹی اور خاک پر مشتمل ہے لیکن ہمارے اندر غیر فانی روح بھی موجود ہے ۔ افلاطون کے عہد سے بھی بہت پہلے یونان میں بے شمار لوگ اس عقیدے کو مانتے رہے تھے ۔ ایشیا میں اس سے مماثل جو خیالات مروج تھے ، پلوتی نوس ان سے آگاہ تھا۔

پلوتی نوس کا عقیدہ تھا کہ دنیا اس فاصلے کا نام ہے جو دو قطبین کے مابین پایا جاتا ہے ۔ایک سرے پر وہ الوہی نور (divine light) ہے جسے وہ احد (One) کہتا ہے ۔بعض اوقات وہ اسے خدا (God) کہتا ہے ۔ دوسرے سرے پر مطلق ظلمت (absolute darkness) ہے جس تک احد کے نور کی کوئی شعاع نہیں پہنچتی۔ لیکن پلوتی نوس کا نکتہ یہ ہے کہ ظلمت کا حقیقتاً کوئی وجود نہیں ۔ یہ محض نور کی عدم موجودگی ہے ــــ دوسرے الفاظ میں یہ عدم موجود ہے ۔ جو کچھ موجود ہے خدا یا احد ہے ، لیکن جس طرح روشنی کی شعاع بتدریج مدھم سے مدھم تر ہوتی جاتی ہے اور یوں آہستہ آہستہ بجھ جاتی ہے ، اسی طرح کہیں نہ کہیں ایسا مقام بھی آجاتا ہے جہاں تک الوہی نور پہنچ نہیں پاتا۔

پلوتی نوس کے مطابق روح احد کے نور سے منور ہوتی ہے ، جب کہ مادہ ظلمت ہے جس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ۔ لیکن فطرت کی ہیئتوں (forms) میں احد کی ہلکی سی تجلی ہوتی ہے ۔

کھلی فضا میں بہت بڑے الاؤ کا تصور ذہن میں لاؤ ۔ رات کا عالم ہے ۔ شعلے بھڑک رہے اور چنگاریاں چاروں طرف اڑ رہی ہیں ۔ الاؤ کی روشنی کے وسیع و عریض دائرے کے اندر ان حصوں میں جو آگ کے قریب ترین ہیں ، رات دن میں تبدیل ہوجاتی ہے ، لیکن آگ کی روشنی کئی میل دور تک نظر آتی ہے ۔ اگر ہم مزید آگے چلے جائیں ، ہمیں روشنی کی ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی رہے گی جیسے کہیں دور کوئی لالٹین جل رہی ہو اور اگر ہم مزید آگے چلتے جائیں ، ایک مقام ایسا آجائے گا جہاں یہ روشنی پہنچ نہیں پائے گی ۔ کہیں نہ کہیں روشنی کی کرنیں رات میں غائب ہوجائیں گی اور جب مکمل تاریکی چھا جاتی ہے ، ہمیں کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔ شکلیں اور سائے سبھی اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں ۔

اب تصور کرو کہ حقیقت اس الاؤ کی مانند ہے ـــــ وہ جو جل رہا ہے ، خدا ہے ـــــ اور آگے جو ظلمت ہے وہ سرد مادہ ہے جس سے انسان اور جانور بنے ہیں ۔ خدا کے قریب ترین ابدی امثال (ideas) ہیں جو تمام مخلوق کی اولین ہیئتیں ہیں ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسانی روح " آگ کی چنگاری " ہے ۔ تاہم پوری کائنات میں ہر جگہ کچھ نہ کچھ الوہی نور چمک رہا ہے ۔ ہم اسے تمام جان دار مخلوقات میں دیکھ سکتے ہیں ، جہاں تک کہ گلاب اور بلیو بیل (blue bell) کے پھولوں میں بھی اپنی الوہی تجلی ہوتی ہے ۔ زندہ خدا سے دور ترین فاصلے پر مٹی ، پانی اور پتھر ہیں ۔

میں کہہ یہ رہا ہوں کہ ہر چیز جو موجود ہے ، اس میں کچھ نہ کچھ الوہی بھید ہے ۔ ہم اسے سورج مکھی کے پھول یا گل لالہ میں ضوفگن ہوتے دیکھ سکتے ہیں ۔ ہمیں اس اتھاہ راز کا اس سے زیادہ احساس اس تتلی کو دیکھ کر ہوتا ہے جو کسی شاخ پر اپنے پر پھڑپھڑا رہی ہے ـــــ یا اس سنہری مچھلی کا مشاہدہ کرکے ہوتا ہے جو اپنے برتن میں تیرتی پھر رہی ہے ۔ لیکن ہم خدا کے قریب ترین اپنی روح میں ہوتے ہیں ۔ صرف وہیں ہم زندگی کے عظیم راز کے ساتھ یکجا ہوتے ہیں ۔ سچی بات یہ ہے کہ صرف انتہائی خال خال مواقع پر ہمیں یہ تجربہ ہوسکتا ہے کہ ہم خود یہ الوھی راز

ھیں۔

پلوتی نوس کا استعارہ افلاطون کے غار کے استعارے کی مانند ہے : ہم غار کے دہانے کے جتنا قریب جاتے ہیں ، ہم اتنا ہی اس چیز کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں جس سے تمام زندگی پھوٹتی ہے ۔ لیکن افلاطون کی صاف شفاف دوہری حقیقت کے برعکس پلوتی نوس کے نظریے کی خصوصی بات کلیت (wholeness) کا تجربہ ہے ۔ (اس میں) ہر چیز واحد ہے —— کیونکہ ہر چیز خدا ہے ۔ بلکہ افلاطون کے غار میں جو پرچھائیاں ہیں ، ان میں بھی کہیں دور احد کی ہلکی سی تجلی نظر آجاتی ہے۔

پلوتی نوس کو اپنی زندگی کے دوران میں بعض مواقع پر ، جو اگرچہ خال خال ہیں ، کچھ اس قسم کا تجربہ ہوا جیسے اس کی روح خدا کی ذات میں مدغم ہوگئی ہو ۔ ہم اس قسم کے تجربے کو عام طور پر سری تجربہ کہتے ہیں ۔ تاہم پلوتی نوس واحد شخص نہیں جسے اس قسم کا تجربہ ہوا ۔ ہر عہد اور ہر ثقافت کے لوگ ان کا ذکر کرتے رہے ہیں ۔ تفصیلات مختلف ہوسکتی ہیں لیکن ضروری خصوصیات یکساں ہیں ۔ آؤ ، اب ہم ان میں سے چند ایک خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔

سریت

سری تجربہ خدا یا "روح کائنات" میں مدغم ہونے کا تجربہ ہے ۔ متعدد مذاہب خدا اور مخلوق کے مابین خلیج پر زور دیتے ہیں ، لیکن سریت پسندوں (یا صوفیوں) کو اس قسم کی خلیج کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا ۔ مردوں اور عورتوں دونوں کو "خدا کے ساتھ یک جان" ہونے یا اس کی ذات میں "مدغم" ہونے کا تجربہ ہو چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جسے ہم عام طور پر "میں" کہتے ہیں ، وہ صحیح "میں" نہیں ہوتا ۔ قلیل المدت جھلک کے دوران میں ہمیں عظیم تر "میں" کے ساتھ تطبیق (identification) کا تجربہ ہوسکتا ہے ۔ بعض سریت پسند اس عظیم تر "میں" کو خدا اور دوسرے روح کائنات ، فطرت یا کائنات کہتے ہیں ۔ جب ادغام ہوجاتا ہے ،

سریت پسند کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ "اپنے آپ کو کھو رہا" ہے۔ وہ اسی طرح خدا میں کھو یا غائب ہوجاتا ہے جس طرح پانی کا قطرہ اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے جب وہ سمندر میں مدغم ہوتا ہے۔ ایک ہندوستانی سریت پسند نے اسے ایک مرتبہ اس طرح بیان کیا تھا: "جب میں تھا ایشور نہیں تھا، جب ایشور ہے میں نہیں رہا۔" عیسائی سریت پسند انجیلس سائلیسس (Angelus Silesius) (1624 تا 1677ء) نے اسے ایک اور انداز سے بیان کیا تھا: "ہر قطرہ جب بحر کی طرف بڑھتا ہے، بحیرہ بن جاتا ہے، بالکل اسی طرح روح عالم بالا کی طرف پرواز کرتی ہے اور خدا بن جاتی ہے۔"

تم شاید محسوس کرو کہ "اپنے آپ کو کھو دینا" کوئی اتنی خوشگوار بات نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا مطلب کیا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ تم نے کھویا ہے وہ اس سے کہیں کم ہے جو تم نے پایا ہے۔ تم اپنے آپ کو صرف اس ہیئت میں کھوتی ہو جس میں تم اس لمحے ہوتی ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی تمہیں احساس ہوتا ہے کہ تم پہلے سی کہیں بڑی چیز بن گئی ہو۔ تم کائنات بن گئی ہو، بلکہ سوفی، تم خود روح کائنات بن چکی ہو۔ یہ تم ہو جو خدا ہے۔ اگر تمہیں اپنے آپ کو سوفی امنڈسین کی حیثیت سے کھونا پڑ رہا ہے، تمہاری یہ جان کر تشفی ہوسکتی ہے کہ یہ "ہر روز کا میں" ایک ایسی چیز ہے جو ایک نہ ایک روز تم بہرحال کھو دو گی۔ سریت پسندوں کے مطابق تمہارا اصل "میں" ——— جس کا تمہیں صرف تبھی تجربہ ہوسکتا ہے اگر تم اپنے آپ میں اپنے آپ کو کھونے کی صلاحیت پیدا کرسکو ——— کسی پراسرار آگ کی مانند ہے جو تاابد فروزاں رہے گی۔

لیکن اس قسم کا سری تجربہ اپنے آپ وارد نہیں ہوتا۔ خدا کے ساتھ اپنے وصال کے لیے سریت پسند کو "روحانی تعلیم اور تزکیۂ نفس" کا راستہ تلاش کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ یہ راستہ سادہ زندگی اختیار کرنے اور مراقبے یا گیان دھیان کے مختلف طریقوں پر عمل پیرا ہوکر مل سکتا ہے۔ پھر ایکا ایکی سریت پسند یا صوفی کو اپنی منزل مل جاتی ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے: "انا الحق" یا

"من تو شدم"۔

سری رجحانات دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں پائے جاتے ہیں ۔ اور سریت پسندوں نے سری تجربوں کی جو رودادیں بیان کی ہیں ، تمام ثقافتوں کے اندر ان میں حیران کن حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے ۔ یہ تو محض سریت پسند کی اپنے سری تجربے کی مذہبی یا فلسفیانہ توضیح ہے جس سے اس کے خود ثقافتی پس منظر کا انکشاف ہوتا ہے ۔

مغربی سریت میں ـــــ یعنی یہودیت ، عیسائیت اور اسلام کے اندر ـــــ سریت پسند یا صوفی اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس کا وصال ذاتی خدا سے ہوتا ہے ۔ اگرچہ خدا فطرت اور انسانی روح دونوں میں موجود ہے ، وہ دنیا سے بلند اور ماورا بھی ہے ۔ مشرقی سریت میں ـــــ یعنی ہندو مت ، بدھ مت اور چینی مذاہب کے اندر ـــــ عام طور پر زور اس بات پر ہوتا ہے کہ سریت پسند کو بھگوان یا "جگت آتما" (روح کائنات) کے ساتھ مکمل ادغام کا تجربہ ہوتا ہے ۔

"میں ہی روح کائنات ہوں ۔ "سریت پسند پکار سکتا ہے یا وہ اپنے آپ کو "اناالحق" کہہ سکتا ہے ، کیونکہ خدا دنیا میں صرف موجود ہی نہیں بلکہ کوئی اور جگہ ہے ہی نہیں جہاں وہ موجود ہو ۔

ہندوستان میں افلاطون کی پیدائش سے کہیں بہت پہلے سری تحریکوں کا سلسلہ چل نکلا تھا ۔ سوامی وویکا نند نے ، جس کے ذریعے ہندو مت مغرب میں پہنچا ، ایک مرتبہ کہا تھا : "جس طرح بعض عالمی مذاہب کہتے ہیں کہ وہ لوگ جو اپنی ذات سے باہر کسی ذاتی خدا میں یقین نہیں رکھتے ، ملحد ہیں ، اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ جو شخص اپنی ذات پر یقین نہیں رکھتا ، ناستک ہے ۔ اپنی آتما کے جلال و جمال میں یقین نہ رکھنے کو ہم دہریت کہتے ہیں ۔"

سری تجربے کی اخلاقی معنویت بھی ہوسکتی ہے ۔ بھارت کے ایک سابق صدر سار وے پلی رادھا کرشنن نے ایک مرتبہ کہا تھا : "اپنے پڑوسی سے ایسے ہی پیار کرو جیسے تم اپنے آپ سے کرتے ہو ۔ یہ سمجھنا کہ تمہارا پڑوسی تمہارے علاوہ کوئی اور شخص

ہے، محض التباس ہے۔"

ہمارے اپنے عہد کے لوگ بھی، جو کسی خاص مذہب کے ساتھ وابستہ نہیں۔۔ سری تجربوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اچانک کسی ایسی چیز کا تجربہ ہوتا ہے جسے وہ "کائناتی شعور" یا "بحر کی طرح عمیق اور بے پایاں احساس" کہتے ہیں۔ انہیں یوں محسوس ہوا ہے جیسے انہیں کسی نے جھٹکا دے کر وقت کی قید سے آزاد کردیا ہو اور انہیں "ابدیت کے تناظر سے" دنیا کا تجربہ ہوا ہو۔

سوفی اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے آپ کو ٹٹول کر دیکھنا پڑا کہ اس کا ابھی تک کوئی جسم ہے بھی یا نہیں۔ جب وہ افلاطون اور سریت پسندوں کے متعلق مزید اور مزید پڑھ رہی تھی اسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ بے اختیار اپنے کمرے میں، دریچے سے باہر اور شہر کے کہیں بہت اوپر تیر رہی ہو۔ وہاں سے اس نے نیچے چوک میں سب لوگوں کو دیکھا تھا اور وہ بحیرہ شمالی، صحرائے اعظم اور افریقہ کے استوائی خطوں کے اوپر ہی اوپر اور پھر سارے کرہ ارض کے اوپر فضا میں پیرتی رہی تھی۔

ساری دنیا تقریباً کسی زندہ شخص کی مانند دکھائی دینے لگی تھی اور سوفی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ زندہ شخص وہ خود ہو۔ "دنیا میں ہوں۔" اس نے سوچا۔ وسیع و عریض عظیم کائنات جو اسے اکثر بے پایاں، ناقابل تفہیم اور دہشت ناک محسوس ہوتی رہی تھی ـــــ وہ اس کا اپنا "میں" تھی۔ کائنات اب بھی بے پایاں اور پرشکوہ تھی، لیکن اب اس کی اپنی ذات تھی جو اتنی بڑی بن گئی تھی۔

یہ غیر معمولی احساس زودگزر تھا لیکن سوفی کو یقین تھا کہ وہ اسے کبھی فراموش نہیں کرسکے گی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اندر سے کوئی چیز اس کی پیشانی پھاڑ کر باہر نکل آئی ہو اور باقی تمام اشیا کے ساتھ اس طرح مدغم ہوگئی ہو جیسے رنگ کا ایک قطرہ جگ کے سارے پانی کو رنگین بنا دیتا ہے۔

جب یہ احساس ختم ہوگیا اسے یوں لگا کہ اس نے کوئی سہانا خواب دیکھا ہو اور جب اس کی آنکھ کھلی، اس کے سر میں درد ہو رہا ہو۔ سوفی کو جب احساس ہوا کہ اس کا ایک جسم ہے جو بستر پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ جس التباس کی لپیٹ میں آگئی تھی، اب اس کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور مایوسی اس کے چہرے پر پڑھی جاسکتی تھی۔ بیٹ

کے بل لیٹ کر البرٹو کونکس کے کاغذات کا مطالعہ کرنے سے اس کی کمر میں درد ہونے لگا تھا لیکن اسے کسی ناقابل فراموش چیز کا تجربہ ہوچکا تھا۔

آخر کار اس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی - پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اوراق میں سوراخ کئے اور انہیں دوسرے اسباق کے ساتھ فائل میں پرودیا۔ پھر وہ باغ میں چلی گئی -

پرندے یوں چہچہا رہے تھے جیسے دنیا ابھی ابھی وجود میں آئی ہو - خرگوشوں کے کہنہ دڑبوں کے پیچھے برچ کے درختوں کا زردی مائل سبز رنگ اتنا چمکیلا تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے خالق نے ابھی تک ان پر رنگ کرنے کا کام ختم نہیں کیا۔

کیا وہ واقعی یقین کرسکتی ہے کہ ہر چیز واحد الوہی "میں" ہے ؟ کیا وہ یقین کرسکتی ہے کہ وہ اپنے اندر کوئی روح لیے پھر رہی ہے جو "آگ کی چنگاری" ہے ؟ اگر یہ ٹھیک ہے پھر وہ واقعی الوہی مخلوق ہے -

13۔ پوسٹ کارڈ

* * *

. . . میں اپنے اوپر سخت سنسر شپ نافذ کر رہا ہوں . . .

کئی روز گزر گئے لیکن فلسفے کے استاد کا کوئی خط موصول نہ ہوا ۔ کل جمعرات ہے اور مئی کی سترہ تاریخ ہے ـــــ اور یہ ناروے کا یوم استقلال ہے ۔سکول اٹھارہ تاریخ کو بھی بند رہے گا ۔ جب وہ چھٹی کے بعد گھر واپس جا رہی تھیں ' اچانک جوآنا نے کہا : " آؤ چھٹی گھر سے باہر منائیں ' جنگل میں کیمپ لگائیں گے اور رات وہیں گزاریں گے !"

سوفی کا فوری ردعمل تو یہ تھا کہ وہ کہہ دے وہ زیادہ دیر گھر سے باہر نہیں رہ سکتی ۔ تاہم پھر اس نے کہا :"بالکل 'بالکل ۔ضرور چلیں گے ۔"

دو گھنٹے بعد جوآنا خاصا بڑا پشتی تھیلا (1) (rucksack) اٹھائے سوفی کے گھر پہنچ گئی ۔سوفی بھی اسی قسم کا تھیلا تیار کر چکی تھی اور اس کے پاس خیمہ بھی تھا ۔ دونوں کے پاس سفری بستر (2) (bed rolls) اور سویٹر ' زمین پر بچھانے کی چادریں اور بیٹریاں (flash lights) ' بڑے سائز کی تھرموس بوتلیں اور خاصی مقدار میں اپنے اپنے پسندیدہ کھانے تھے ۔

جب سوفی کی ماں پانچ بجے گھر پہنچی ' وہ انہیں تلقین کرنے لگی کہ انہیں کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے ۔ اس نے بالاصرار یہ بھی پوچھا کہ وہ اپنا کیمپ کہاں لگائیں گی ۔

انہوں نے بتایا کہ وہ گراؤس ٹاپ (Grouse top) (3) جانا چاہتی ہیں ۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو شاید وہ نرگراؤس کو جفتی کے لیے اپنی مادہ کو پکارتے بھی سن لیں ۔

اس خاص مقام کے انتخاب میں سوفی کی اپنی غرض بھی شامل تھی ۔ اس کا خیال تھا کہ گراؤس ٹاپ لازماً میجر کی کٹیا کے قریب ہوگا ۔ کوئی چیز اسے اکسا رہی تھی کہ وہ ایک بار پھر وہاں کا چکر لگائے لیکن اسے وہاں اکیلے جانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا ۔

سوفی کے باغ کے گیٹ سے ذرا آگے بند گلی سے جو پگڈنڈی نکلتی تھی ، دونوں لڑکیاں اس پر چلنے لگیں ۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں اور سوفی خوش تھی کہ اسے ان تمام چیزوں سے ، جن کا تعلق فلسفے سے بنتا تھا ، وقتی طور پر دور جانے کا موقع مل گیا ہے ۔

آٹھ بجے تک وہ گراؤس ٹاپ کے قریب ایک جگہ ، جہاں کوئی درخت یا جھاڑی نہیں تھی ، اپنا خیمہ گاڑ چکی تھیں ۔ وہ شب بسری کی تیاری کر چکی اور اپنے سفری بستر کھول چکی تھیں ۔ جب وہ اپنے سینڈوچ کھا چکیں ، سوفی نے پوچھا : "تم نے کبھی میجر کی کٹیا کے بارے میں سنا ہے ؟"

"میجر کی کٹیا ؟"

"یہاں سے کچھ ہی دور ایک چھوٹا سا مکان ہے . . . چھوٹی جھیل کے قریب ۔ وہاں کسی زمانے میں ایک عجیب قسم کا شخص رہا کرتا تھا ۔ وہ میجر تھا ۔ اس لیے اسے میجر کی کٹیا کہا جاتا ہے ۔"

"اب بھی وہاں کوئی رہتا ہے ؟"

"جانا اور دیکھنا چاہتی ہو ؟"

"یہ ہے کہاں ؟"

سوفی نے درختوں کے بیچ میں سے اشارہ کیا ۔

جوآنا نے کسی خاص اشتیاق کا اظہار نہ کیا لیکن بالآخر وہ چل پڑیں ۔ سورج افق پر خاصا نیچے آچکا تھا ۔

شروع میں وہ چیڑ کے بلند و بالا درختوں کے بیچوں بیچ چلتی رہیں لیکن جلد ہی انہیں جھاڑیوں اور گھنے پودوں کے مابین اپنا راستہ بنانا پڑا ۔ انجام کار انہیں پگڈنڈی مل گئی ۔ "کیا یہ وہی پگڈنڈی ہے جو میں نے اتوار کی صبح اختیار کی تھی ؟" سوفی سوچ رہی

تھی۔

یہ لازماً وہی ہوگی ـــــ کیونکہ تقریباً اسی وقت وہ پگڈنڈی کی دائیں جانب درختوں کے بیچ کسی چمکتی دمکتی چیز کی طرف ہاتھ ہلا کر اشارے کرنے لگی تھی۔

"وہ رہی۔" اس نے کہا۔

کچھ ہی دیر میں وہ چھوٹی جھیل کے کنارے پر کھڑی تھیں۔ سوفی نے پانی کے پار کٹیا پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اب تمام کھڑکیوں کے پٹ بند تھے۔ اس نے مدتوں سے اتنا اجاڑ مکان کبھی نہیں دیکھا تھا جتنی کہ یہ سرخ رنگ کی عمارت نظر آ رہی تھی۔

جو آنا اس سے مخاطب ہوئی: "پانی پر چلنا ہوگا؟"

"بالکل نہیں۔ ہم کشتی میں جائیں گی۔"

سوفی نے سرکنڈوں کی طرف اشارہ کیا۔ بالکل پہلے کی طرح وہاں کشتی پڑی تھی۔

"تم پہلے بھی ادھر آ چکی ہو؟"

سوفی نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس نے اپنے گزشتہ پھیرے کی وضاحت کی کوشش کی تو معاملہ خاصا پیچیدہ ہو سکتا ہے۔ اور پھر اسے اپنی سہیلی کو البرٹو کنوکس اور فلسفے کے نصاب کے متعلق بھی بتانا پڑے گا۔

وہ کشتی کھے رہی، ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہی اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ جب وہ دوسرے کنارے پر پہنچیں، سوفی نے اس بات کا پکا اہتمام کر لیا کہ کشتی پانی سے بالکل باہر نکال لی جائے۔

وہ سامنے کے دروازے کے قریب پہنچ گئیں۔ چونکہ بظاہر کٹیا میں کوئی شخص نہیں تھا، جو آنا نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔

"تالا لگا ہوا ہے۔ . . تمہارا خیال تھا یہ کھلا ہوگا؟"

"شاید کہیں چابی مل جائے۔" سوفی نے کہا۔

وہ پتھر کی بنیادوں کے شگافوں میں ڈھونڈنے لگی۔

"چھوڑو، واپس اپنے خیمے میں چلتے ہیں۔" چند منٹ بعد جو آنا نے کہا۔

لیکن عین اسی لمحے سوفی پکار اٹھی: "مل گئی، مل گئی! یہ رہی!"

اس نے فاتحانہ انداز سے چابی لہرائی، تالے میں ڈالی اور دروازہ کھل گیا۔

دونوں سہیلیاں یوں دبے پاؤں اندر داخل ہوئیں جیسے وہ کوئی مجرمانہ حرکت

کرنا چاہتی ہوں۔ کٹیا سرد اور اندھیری تھی۔

"کچھ بھی تو نظر نہیں آرہا!" جو آننا نے کہا۔

لیکن سوفی اس سلسلے میں پہلے ہی سوچ چکی تھی۔ اس نے جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی اور ایک تیلی جلائی۔ تیلی کے بجھنے سے پہلے انہیں صرف اتنا دیکھنے کا موقع ملا کہ کوٹھڑی ویران پڑی ہے۔ سوفی نے ایک اور تیلی جلائی اور اس مرتبہ اسے سٹوو (stove) کے اوپر خالص لوہے کے شمع دان میں ایک نیم سوختہ موم بتی نظر آگئی۔ اس نے تیسری تیلی سے اسے جلایا اور تنگ و تاریک کمرے میں اتنی روشنی ضرور ہوگئی کہ وہ اپنے ارد گرد دیکھ سکتی تھیں۔

"کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اتنی چھوٹی سی موم بتی اتنی تاریکی میں روشنی پھیلا سکتی ہے؟" سوفی نے کہا۔

اس کی سہیلی نے اتفاق میں سر ہلا دیا۔

"لیکن کہیں نہ کہیں روشنی تاریکی میں گم ہو جاتی ہے۔" سوفی کہتی رہی۔ "فی الحقیقت تاریکی کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا، یہ محض روشنی کا فقدان ہے۔"

جو آننا پر کپکپی طاری ہوگئی۔ "تمہاری باتیں ڈراؤنی ہیں! آؤ، چلیں یہاں سے..."

"نہیں، پہلے ہم اس آئینے میں دیکھیں گی۔"

سوفی نے پیتل کے فریم کے اندر آئینے کی طرف اشارہ کیا جو پہلے کی طرح درازدار الماری کے اوپر لٹک رہا تھا۔

"یہ تو واقعی خوبصورت ہے!" جو آننا نے کہا۔

"لیکن یہ طلسمی آئینہ ہے۔"

"آئینے، آئینے، دیوار کے آئینے، حسین ترین کون ہے؟" (4)

"جو آننا، میں مذاق نہیں کر رہی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم اس کے اندر جھانکو گی تمہیں دوسری طرف ضرور کچھ نظر آئے گا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ تم یہاں پہلے کبھی نہیں آئیں؟ اور یہ تو تم مجھے ہر دم ڈرا رہی ہو، اس میں اتنا خوش ہونے کی کون سی بات ہے؟"

سوفی اس کا کوئی جواب نہ دے سکی۔

"سوری (sorry)۔"

اس مرتبہ جو آننا کو اچانک فرش پر کونے میں کوئی چیز پڑی دکھائی دی - یہ چھوٹا سا ڈبا تھا - جو آننا نے اسے اٹھالیا -

"پوسٹ کارڈ - " اس نے کہا -

سوفی کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی -

"مت چھوؤ! سنا تم نے ـــــ مت چھوؤ انہیں!"

جو آننا اچھل پڑی - اس نے ڈبا یوں نیچے گرا دیا جیسے اس کی انگلیاں جل گئی ہوں - پوسٹ کارڈ سارے فرش پر بکھر گئے - اگلے سیکنڈ وہ ہنسنے لگی -

"پوسٹ کارڈ ہی تو ہیں!"

جو آننا فرش پر بیٹھ گئی اور انہیں اٹھانے لگی - کچھ دیر بعد سوفی بھی اس کے پاس بیٹھ گئی -

"لبنان . . . لبنان . . . لبنان . . . سب پر لبنان کی مہر لگی ہوئی ہے ؟ " جو آننا نے دریافت کیا -

"مجھے معلوم ہے - "

جو آننا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور سوفی کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر دیکھنے لگی -

"تو تم پہلے بھی یہاں آچکی ہو!"

"ہاں - میرا خیال ہے - "

اچانک اسے خیال آیا کہ اگر وہ مان لے کہ وہ پہلے بھی یہاں آچکی ہے ، خاصی آسانی رہے گی - گزشتہ چند دنوں کے دوران میں اسے جن پر اسرار چیزوں کا تجربہ ہوا تھا اگر وہ ان کے متعلق اپنی سہیلی کو بتا دے تو کوئی خاص ہرج نہیں ہو گا -

"میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی تھی کہ ہم یہاں پہلے بھی آ چکے ہیں - "

جو آننا کارڈ پڑھنے لگی -

"یہ سب کے سب کسی ہلڈے مولر کنیگ کے نام ہیں - "

سوفی نے ابھی تک کارڈوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا -

"پتا کیا ہے ؟ "

جو آننا نے پڑھ کر سنایا : "ہلڈے مولر کنیگ بتوسط البرٹو کنوکس ، للے سینڈ ، ناروے - "

سوفی نے اطمینان کی سانس لی ۔ اسے ڈر تھا کہیں بتوسط سوفی امنڈسین نہ لکھا ہو ۔

وہ ان کا بغور جائزہ لینے لگی ۔

" 28 اپریل . . . 4 مئی . . . 6 مئی . . . 9 مئی . . . ان پر چند روز پہلے کی مہریں ہیں ۔ "

" لیکن ایک بات اور بھی ہے ۔ سب مہریں ناروے کی ہیں ! یہ دیکھو . . . یو این بٹالین . . . ٹکٹیں بھی ناروے کی ہیں ! "

"میرا خیال ہے کہ ان کا یہی طریقہ ہے ۔ انہیں ایک طرح سے غیر جانب دار رہنا پڑتا ہے ۔ چنانچہ ان کا وہاں اپنا ناروی ڈاک خانہ ہو گا ۔ "

" لیکن یہاں وطن میں ان کی ڈاک کیسے پہنچتی ہے ؟ "

" غالباً ایر فورس کے ذریعے ۔ "

سوفی نے شمع دان نیچے فرش پر رکھ لیا اور دونوں سہیلیاں پوسٹ کارڈ پڑھنے لگیں ۔ جو آنتا نے انہیں تاریخ وار ترتیب دی اور پہلا کارڈ پڑھنے لگی :

ڈیر ہلڈے ، مجھ سے لے سینڈ گھر پہنچنے کا انتظار نہیں ہوسکتا ۔ میرا جہاز وسط گرما (5) سے ایک روز پہلے شام کو کجیوک (Kjevik) کے ہوائی اڈے پر اترے گا ۔ میں چاہتا تو یہی تھا کہ میں تمہاری پندرھویں سال گرہ منانے وقت پر پہنچ جاتا لیکن کیا کروں ، میں عسکری کمان کے ماتحت ہوں ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کی تلافی یوں کردوں گا کہ اس موقع پر میں تمہیں جو ضخیم تحفہ بھیج رہا ہوں ؛ اس میں میں اپنی ساری محبت تم پر نثار کردوں گا ۔

اس کی طرف سے پیار جو ہمیشہ اپنی بیٹی کے مستقبل کے متعلق سوچتا رہتا ہے ۔

پس تحریر : میں اس خط کی نقل ہم دونوں کی مشترکہ دوست کو بھیج رہا ہوں ۔ ہلڈے ، مجھے معلوم ہے کہ تم میری بات سمجھ گئی ہو ۔ فی الحال میں رازداری سے کام لے رہا ہوں لیکن تم بہر حال سمجھ جاؤ گی ۔

سوئی نے اگلا کارڈ اٹھایا:

ڈیر ہلڈے، ہم یہاں جس قسم کی زندگی گزار رہے ہیں اس میں ہم ہر دن کو اپنی زندگی کا آخری دن سمجھ کر گزار رہے ہیں۔ میں نے لبنان میں جتنے مہینے گزارے ہیں، تو اس عرصے کے دوران میں جو واقعات پیش آئے، ان میں سے مجھے جو خاص طور پر یاد رہے گا، یہ ہے کہ یہ انتظار کی گھڑیاں کتنی طویل اور پر کوفت ہوتی ہیں۔ تاہم میں وہ سب کچھ کر گزروں گا جو میرے بس میں ہے تاکہ تم اپنی پندرھویں سالگرہ دھوم دھام سے منا سکو۔ فی الحال میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں اپنے آپ پر سخت سنسرشپ نافذ کر رہا ہوں۔ ابا کی طرف سے پیار۔

دونوں سہیلیوں پر اتنی ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی سانسیں رک گئی ہیں۔ کسی نے اپنی زبان سے ایک لفظ تک نہ کہا، بس کارڈوں پر جو کچھ لکھا تھا اسے پڑھتی رہیں:

پیاری بیٹی، جس کام کے کرنے کو میرا سب سے زیادہ جی چاہتا ہے، وہ یہ ہے کہ میں اپنے باطنی خیالات کسی سفید فاختہ کے ذریعے تم تک پہنچا دوں۔ لیکن یہاں لبنان میں کسی کے پاس سفید فاختہ نہیں۔ اس جنگ کے ستائے ہوئے ملک کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ سفید فاختائیں ہیں۔ میری دعا ہے کہ اقوام متحدہ کسی روز ساری دنیا میں صحیح معنوں میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوجائے۔

پس تحریر: ہوسکتا ہے کہ تمھارے سالگرہ کے تحفے میں دوسرے لوگوں کو بھی شریک کیا جاسکے۔ جب میں گھر پہنچوں گا، ہم اس کے متعلق بات کریں گے۔ لیکن تمھاری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا کہ میں کہہ کیا رہا ہوں، ٹھیک؟ ایک ایسے شخص کی طرف سے پیار جس کے پاس ہم دونوں کے متعلق سوچنے کے لیے

کافی وقت ہے۔

جب وہ چھ کارڈ پڑھ چکیں، صرف ایک باقی رہ گیا تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا :

ڈیر ہلڈے ، تمہاری سالگرہ سے متعلق ان تمام رازوں سے میرا سینہ اتنا لبریز ہو چکا ہے کہ اب مزید گنجائش نہیں رہی ۔ دن میں میرا کئی بار گھر ٹیلی فون کرنے اور سارا راز افشا کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے لیکن میں اپنے آپ کو بڑی مشکل سے روک پاتا ہوں ۔ یہ کچھ ایسی چیز ہے کہ اس کے حجم میں روز بروز نیا اضافہ ہوتا جارہا ہے ۔ اور جیسا کہ تم جانتی ہو کہ جب کوئی چیز حجم کے اعتبار سے بڑھتی ہی جائے ، اسے اپنے آپ تک محدود کرنا مشکل سے مشکل تر ہوجاتا ہے۔ پاپا کی طرف سے پیار۔

پس نوشت : کسی روز تمہاری ایک لڑکی سے ملاقات ہوگی ۔ اس کا نام سوفی ہے ۔ میں جو کارڈ تمہیں بھیجتا رہتا ہوں میں نے ان سب کی نقول اسے بھی ارسال کرنا شروع کردیا ہے تاکہ ملاقات سے پہلے تم ایک دوسرے کو جان سکو ۔ ہلڈے ، مجھے توقع ہے کہ وہ بہت جلد سارا معاملہ سمجھ جائے گی ۔ فی الحال جو کچھ تم جانتی ہو وہ اس سے زیادہ نہیں جانتی ۔ اس کی ایک سہیلی ہے ۔ اس کا نام جو آنا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی مدد کرسکے۔

آخری کارڈ پڑھنے کے بعد جو آنا اور سوفی کچھ دیر چپ چاپ بیٹھی پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو گھور گھور کر دیکھتی رہیں ۔ جو آنا نے سوفی کی کلائی مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے رکھی تھی۔

"میرے دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"اور میرے بھی۔"

"آخری کارڈ کی مہر کب کی ہے؟"

سوفی نے دوبارہ کارڈ پر نظر ڈالی۔

"سولہ مئی ۔" اس نے کہا۔ "یہ تو آج کی تاریخ ہے۔"

"یہ نہیں ہوسکتا!" جو آنا نے تقریباً آتش زیرپا ہو کر کہا۔

انھوں نے کارڈ کا دوبارہ احتیاط سے جائزہ لیا۔ وہاں کوئی غلطی نہیں تھی...
16.5.90۔

"یہ ناممکن ہے۔" جوآنا اصرار کر رہی تھی۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لکھا کس نے ہے۔ یہ شخص ضرور ہمیں جانتا ہوگا۔ لیکن اسے یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ ہم خاص طور پر آج ہی کے روز یہاں آئیں گی۔"

دونوں میں جوآنا کہیں زیادہ خوف زدہ تھی۔ سونی کے لیے بلڑے اور اس کے باپ کا معاملہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اس کا پینٹل کے آئینے سے کوئی تعلق ہے۔"

جوآنا دوبارہ اچھل پڑی۔

"تمہارا خیال ہے کہ جونہی کارڈوں پر لبنان میں مہر لگتی ہے وہ اسی دم پھڑپھڑاتے آئینے میں سے باہر ٹپک پڑتے ہیں؟"

"تمہارے پاس اس سے بہتر توضیح ہے؟"

"نہیں۔"

سونی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور اس نے موم بتی دیوار پر معلق دونوں تصویروں کے سامنے کر دی۔ جوآنا بھی ادھر آگئی اور ٹکٹکی باندھ کر انھیں دیکھنے لگی۔

"بار کلی اور بجار کلی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

موم بتی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔

"آؤ چلیں۔" جوآنا نے کہا۔

"ہمیں آئینہ اپنے ساتھ لے لینا چاہیے۔"

سونی آگے بڑھی اور اس نے دراز دار الماری کے اوپر دیوار سے آئینہ اکھاڑ لیا۔ جوآنا نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن سونی نے اس کی ایک نہ سنی۔

جب وہ باہر نکلیں فضا اتنی ہی تاریک تھی جتنی کہ مئی کی راتوں میں عام طور پر ہوتی ہے۔ آسمان پر اتنی روشنی ضرور تھی کہ جھاڑیوں اور درختوں کے ہیولے آسانی سے دیکھے جاسکتے تھے۔ بھولی جھیل یوں نظر آرہی تھی جیسے وہ اپنے اوپر آسمان کا عکس ہو۔ دونوں لڑکیاں اپنے اپنے خیالات میں غرق دوسرے کنارے کی طرف کشتی کھیتی رہیں۔

جب وہ اپنے خیمے کی طرف واپس جا رہی تھیں تب بھی انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی خاص بات نہ کی ' لیکن دونوں جانتی تھیں کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا ' وہ شدت سے اسی کے متعلق سوچ رہی ہیں ۔ کبھی کبھار کوئی ڈرا سہا پرندہ بدک جاتا اور دو مرتبہ انہیں الو کی چیخ سنائی دی ۔

خیمے میں پہنچتے ہی وہ اپنے اپنے بستروں میں گھس گئیں ۔ جوآنا نے آئینہ خیمے کے اندر رکھنے سے انکار کردیا ۔ سونے سے پہلے وہ دونوں اس بات پر متفق تھیں کہ یہ ہے بڑا ڈراؤنا کیونکہ یہ قریب ہی خیمے کے دروازے کے باہر پڑا تھا ۔ سوفی پوسٹ کارڈ بھی اٹھا لائی تھی اور یہ اس نے اپنے پشتی تھیلے کے ایک خانے میں رکھ دئیے تھے ۔

اگلے روز وہ صبح سویرے جاگ گئیں ۔ پہلے سوفی اٹھی ۔ اس نے بوٹ پہنے اور باہر نکل گئی ۔ آئینہ گھاس پر پڑا تھا اور وہ شبنم سے ڈھکا ہوا تھا ۔

سوفی نے اپنے سویٹر سے شبنم پونچھ ڈالی اور ٹکٹکی باندھ کر اپنا عکس دیکھنے لگی ۔ کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنا سر اور پاؤں بیک وقت دیکھ رہی ہو ۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے صبح سویرے کی ڈاک سے لبنان سے آمدہ کوئی پوسٹ کارڈ نہ ملا ۔

خیمے کے عقب میں درختوں سے پاک صاف فراخ جگہ کے اوپر صبح کی کٹی پھٹی دھند یونہی آوارہ پھر رہی اور روئی کے گالوں میں منقسم ہو رہی تھی ۔ ننھے منے پرندے چہچہا رہے تھے لیکن سوفی کو کوئی گراؤس نظر نہ آیا اور نہ اسے اس کی کوئی آواز سنائی دی ۔

لڑکیوں نے مزید سویٹر پہن لیے ۔ انہوں نے اپنا ناشتہ خیمے کے باہر کیا ۔ کچھ ہی دیر میں ان کی گفتگو کا رخ میجر کی کٹیا اور پراسرار کارڈوں کی طرف منتقل ہوگیا ۔

ناشتے کے بعد انہوں نے خیمہ لپیٹا اور گھر کی طرف چل پڑیں ۔ سوفی نے بھاری آئینہ اپنی بغل میں دبا رکھا تھا ۔ راستے میں وقتاً فوقتاً اسے ذرا آرام کرنا پڑتا تھا ____ جوآنا نے اسے ہاتھ لگانے سے بھی انکار کردیا تھا ۔

جب وہ قصبے کے قریب پہنچیں ' انہیں بے قاعدہ وقفوں سے چند گولیوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دیں ۔ سوفی کو یاد آیا کہ ہلڈے کے باپ نے جنگ گزیدہ لبنان کے بارے میں کیا لکھا تھا اور اب اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی خوش قسمت ہے کہ وہ ایک پرامن ملک میں پیدا ہوئی ہے ۔ جن گولیوں کی آوازیں انہوں نے سنی تھیں ' وہ دراصل بے ضرر پٹاخوں کی آوازیں تھیں جو قومی دن کی خوشی میں چلائے جا رہے تھے ۔

سوفی نے جو آنتا کو گرم گرم چاکلیٹ پینے کی دعوت دی ۔ اس کی امی یہ جاننے کے لیے بڑی متجسس تھی کہ انہیں آئینہ کہاں سے ملا ہے ۔ سوفی نے بتایا یہ کٹیا کے باہر پڑا تھا اور اس کی امی اپنی کہانی پھر دہرانے لگی کہ کٹیا کئی سالوں سے بے آباد چلی آ رہی ہے ۔

جب جو آنتا چلی گئی سوفی نے سرخ ڈریس پہن لیا ۔ ناروے کے قومی دن کا باقی حصہ بالکل عام دنوں کی طرح گزر گیا ۔ شام کو ٹی وی نے خبروں کے دوران میں ایک فلم دکھائی کہ ناروے کی یو این بٹالین نے لبنان میں اپنا قومی دن کیسے منایا تھا ۔ سوفی کی نگاہیں سکرین پر جمی ہوئی تھیں ۔ اسے جو فوجی نظر آ رہے تھے ان میں سے کوئی ہلڈے کا باپ ہو سکتا تھا۔

سترہ مئی کو سوفی نے آخری کام یہ کیا کہ اس نے وزنی آئینہ اپنے کمرے کی دیوار پر لٹکا دیا ۔ اگلی صبح صحنیہ لٹکانے میں نیا خاکی لفافہ پڑا تھا ۔ اس نے جھٹ پٹ اسے کھول لیا اور پڑھنے لگی ۔

14 ۔ دو ثقافتیں

* * *

... خلا میں پیرنے سے بچنے کا واحد طریقہ ...

ڈیر سوفی ، ہماری ملاقات میں اب کوئی زیادہ دن نہیں رہ گئے ۔ میرا خیال تھا کہ تم میجر کی کٹیا میں دوبارہ ضرور جاؤ گی ــــ یہی وجہ ہے کہ میں ہلڈے کے باپ کے کارڈ وہیں چھوڑ آیا تھا ۔ انہیں تم تک پہنچانے کا یہی واحد طریقہ تھا ۔ اسے یہ کیسے ملیں گے ، اس کے متعلق تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۔ پندرہ جون سے پہلے بہت کچھ ہو سکتا ہے ۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ یونانیت کے دور کے فلسفیوں نے اپنے پیش رو فلسفیوں کے خیالات کس طرح دوبارہ استعمال کئے تھے ۔ بعض نے تو انہیں مذہبی پیغمبروں میں بھی منقلب کرنے کی کوشش کی ۔ پلوتی نوس نے تو افلاطون کو قریب قریب انسانیت کا نجات دہندہ قرار دے دیا ۔ مگر جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اس عہد میں ، جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے ، ایک اور نجات دہندہ نے جنم لیا تھا ــــ اور یہ واقعہ یونانی / رومی علاقے کی حدود سے باہر رونما ہوا تھا ۔ میرا اشارہ ناصرہ کے یسوع مسیح کی طرف ہے ۔ اس باب میں ہم دیکھیں گے کہ کس طرح عیسائیت بتدریج یونانی / رومی دنیا میں نفوذ کر گئی ۔ یہ کم و بیش

بالکل اسی طرح ہوا جس طرح بدھ کی دنیا ہماری دنیا میں سرایت کرنے لگی ہے۔

یسوع یہودی تھے اور یہودیوں کا تعلق سامی ثقافت سے ہے - یونانیوں اور رومیوں کا تعلق ہند یورپی ثقافت سے ہے - یورپی تہذیب کی جڑیں دونوں ثقافتوں میں پیوست ہیں - عیسائیت جس طرح یونانی / رومی تہذیب پر اثرانداز ہوئی ' اس کا جائزہ لینے سے پیشتر ہمیں ان جڑوں کے بارے میں معلوم کرنا ہو گا۔

ہند یورپی اقوام

ہند یورپی سے ہماری مراد وہ تمام قومیں اور ثقافتیں ہیں جو ہند یورپی زبانیں استعمال کرتی ہیں - ان میں فنی / ہنگروی (لیپ لینڈ (1) ' فن لینڈ ' استونیا اور ہنگری کے باشندوں کی زبانیں) یا باسک (2) زبانوں کے بولنے والوں کے ماسوا یورپ کی تمام اقوام شامل ہیں - مزید برآں ایران اور برصغیر کی اکثر زبانوں کا تعلق بھی ہند یورپی زبانوں کے خاندان سے ہے۔

تقریباً چار ہزار سال قبل اجڈ اور غیرمتمدن ہندیورپی بحیرہ اسود اور بحیرہ کیسپئین کے ساحلوں کے ملحقہ علاقوں میں رہتے تھے - وہاں سے ان ہندیورپی باشندوں کے قبائل بھٹکتے بھٹکاتے موج در موج جنوب مشرق میں ایران اور برصغیر ' جنوب مغرب میں یونان ' اطالیہ اور ہسپانیہ ' وسطی یورپ میں سے گزرتے مغرب میں فرانس اور برطانیہ ' شمال مغرب میں سکنڈے نیویا اور شمال میں مشرقی یورپی ممالک اور روس میں داخل ہونے گئے - ہند یورپی جہاں بھی گئے ' وہ مقامی ثقافتوں میں مکمل مل گئے - تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کردار ہند یورپی زبانوں اور ہندیورپی مذہب نے ادا کیا۔

قدیم ہند کے وید اور یونانی فلسفہ بلکہ آئس لینڈ کے شاعر سنوری سترلوسن کی صنمیات بھی قرابت دار زبانوں میں تحریر کی

گئی ہے ۔ لیکن محض زبانیں ہی ایک دوسرے کی قرابت دار نہیں ۔ قرابت دار زبانوں سے قرابت دار خیالات بھی جنم لیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اکثر "ہندیورپی ثقافت" کا ذکر کرتے رہتے ہیں ۔

ہندیورپیوں کی ثقافت سب سے زیادہ ان کے ایک سے زیادہ خداؤں یا دیوتاؤں میں عقیدے سے متاثر ہوئی ۔ اس عقیدے کو کثرت پرستی (polytheism) کہا جاتا ہے ۔ ان دیوتاؤں کے ناموں اور ان سے منسلک مذہبی اصطلاحات سے ہمارا تمام ہندیورپی علاقے میں بار بار واسطہ پڑتا ہے ۔ میں تمہیں چند مثالیں دیتا ہوں :

قدیم ہندوستانی آکاش کے دیوتا دیوس (Dyaus) کی پوجا کرتے تھے ۔ سنسکرت میں دیوس کا مطلب آکاش ، واتمان ، دن ، آسمان یا سورگ ہے ۔ یونانی میں اس دیوتا کو زیوس (Zeus) ، لاطینی میں جوپیٹر (Jupiter) (جو دراصل iov-pater یا آسمانی باپ ہے) اور قدیم نورس میں ٹیر ، ٹیوتر یا ٹور (Tyr/Tyrr) ہے ۔ یہ سب نام ایک ہی لفظ کی مختلف لسانی صورتیں ہیں ۔

تم غالباً پڑھ چکی ہو کہ قدیم وائی کنگ جن دیوتاؤں کو مانتے تھے ، انہیں وہ آسیر (Aser) کہتے تھے ۔ یہ ایک اور لفظ ہے جو ہمیں ہندیورپی خطے میں بار بار ملتا ہے ۔ ہندوستان کی قدیم کلاسیکی زبان سنسکرت میں دیوتاؤں کو اسر (Asura) اور فارسی میں اھرمن (Ahura) کہا جاتا ہے ۔ سنسکرت میں دیوتا کے لیے ایک اور لفظ "دیو" ہے جو فارسی میں دائیو (daeva) ، لاطینی میں deus اور قدیم نورس میں tivurr کی شکل اختیار کرلیتا ہے ۔

وائی کنگز کے زمانے میں لوگ زرخیزی یا بارآوری کے دیوتاؤں کے ایک خاص گروہ (مثلاً نی اورڈ ، فریجا اور فریر) پر بھی اعتقاد رکھتے تھے ۔ ان دیوتاؤں کا ایک خاص اجتماعی نام وینر (Vaner) تھا ۔ اس لفظ کا تعلق بار آوری کی دیوی کے لاطینی نام وینس (Venus) سے بنتا ہے ۔ سنسکرت میں اس سے ملتا جلتا نام وانی ہے جس کے معنی "خواہش" ہیں ۔

بعض ہندیورپی اسطوروں میں بھی واضح قرابت نظر آتی

ہے ۔ قدیم نورس دیوتاؤں کے متعلق سنوری سترلوسن نے جو کہانیاں لکھی تھیں ان کے بعض اسطورے ہندی اسطوروں سے مماثل ہیں جو دو تین ہزار سال قبل وجود میں آئے تھے ۔ اگرچہ سنوری سترلوسن کے اسطورے نارڈی ماحول اور ہندی اسطورے ہندی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں ' ان میں سے کئی ایک میں مشترکہ ماخذ کی نشانیاں موجود ہیں ۔ ہمیں یہ نشانیاں ان مشروبات کے ' جن کا پینے والا دعوے کے مطابق امر ہوجاتا تھا ' اور افراتفری پھیلانے والے عفریتوں کے خلاف دیوتاؤں کی کشمکش کے متعلق اسطوروں میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

تمام ہندیورپی ثقافتوں میں ہمیں افکار کے اسالیب میں بھی واضح مماثلتیں ملتی ہیں ۔ ایک مخصوص مشابہت وہ انداز ہے جس سے دنیا کو کسی ڈرامے کے موضوع کی حیثیت سے دیکھا اور پیش کیا جاتا ہے ۔ اس قسم کے ڈرامے میں خیروشر کی قوتیں ایک دوسرے پر تخت یا تختہ کہہ کر ٹوٹ پڑتی ہیں ۔ چنانچہ ہند یورپی اکثر یہ "پیشگوئی" کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ خیر وشر کے مابین محاذ آرائی کا انجام کیا ہوگا۔

ہم قدرے ایمان داری سے کہہ سکتے ہیں کہ یونانی فلسفے کا جو آغاز ثقافت کے ہندیورپی دائرے میں ہوا اس میں اتفاق کو کوئی دخل نہیں تھا ۔ ہندی ' یونانی اور نورس سبھی اسطوریات میں دنیا کے متعلق جو نقطہ نظر اختیار کیا جاتا ہے اس میں واضح طور پر فلسفیانہ یا "قیاسی" رجحان پایا جاتا ہے۔

ہندیورپی تاریخ عالم میں "بصیرت" تلاش کرتے تھے ۔ ہم ساری ہندیورپی دنیا میں ایک ثقافت سے دوسری ثقافت تک "بصیرت" (insight) یا "علم" (Knowledge) کے لیے ایک خاص لفظ کا سراغ لگا سکتے ہیں ۔ سنسکرت میں یہ "ودیا" ہے ۔ یہ لفظ یونانی لفظ idea (3) سے مماثل ہے جس نے افلاطون کے فلسفے میں اتنی اہمیت اختیار کرلی تھی ۔ لاطینی میں اس سے ملتا جلتا ایک اور لفظ "وڈیو" (video) ہے لیکن رومیوں کے نزدیک اس کے معانی محض "دیکھنا" تھے ۔ ہمارے لیے "I see" (4) کے معانی "میں سمجھ گیا" ہوسکتے ہیں ' اور کارٹون فلموں میں وڈی ووڈ

پیکر (Woody woodpecker) کے سر پر ، جب اسے کوئی زبردست بات سوجھتی ہے ، بلب روشن ہوسکتا ہے ۔ (یہ صرف ہمارے زمانے میں ہوا کہ "seeing" ٹی وی سکرین پر احمقوں کی طرح ٹکٹکی باندھ کر نظریں جمانا کا مترادف بن گیا ۔) ہم انگریزی زبان کے الفاظ "wise" (5) اور "wisdom" سے آشنا ہیں ـــــ جرمن میں ان کا مترادف "wissen" (جاننا) ہے ۔ ناروی زبان میں یہ لفظ viten بن جاتا ہے اور اس کا مادہ وہی ہے جو ہندی لفظ " ودیا " ، یونانی لفظ "idea" اور لاطینی لفظ "video" کا ہے ۔

اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہندیورپیوں کے لیے بصارت تمام حواس میں اہم ترین تھی ۔ ہندیوں ، یونانیوں ، اہل فارس اور تیوتونوں (6) کے ادب کی نمایاں خصوصیت یکساں طور پر ان کے عظیم کائناتی وژن (cosmic visions) تھے ۔ (پھر وہی لفظ آگیا : vision لاطینی فعل "video" سے مشتق ہے ۔) دیوتاؤں اور اسطوری واقعات کو تصویروں اور مجسموں کی شکل میں ڈھالنا بھی ہندیورپی ثقافت کی اہم خصوصیت ہے ۔

اور آخری بات یہ ہے کہ ہندیورپیوں کا تاریخ کا نقطہ نظر دوری (cyclic) ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سال کے موسموں کی طرح تاریخ دائروں (circles) میں گھومتی رہتی ہے ۔ چنانچہ تاریخ کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا ، بس یہ مختلف تہذیبیں ہیں جو پیدائش اور موت کے باہمی عمل میں ، جو ازل سے جاری ہے ، عروج و زوال سے دوچار ہوتی رہتی ہیں ۔

دونوں عظیم مشرقی مذاہب ـــــ ہندومت اور بدھ مت ـــــ ماخذ کے اعتبار سے ہندیورپی ہیں ۔ یہی بات یونانی فلسفے پر صادق آتی ہے ، اور یوں ہم ایک طرف ہندومت اور بدھ مت اور دوسری طرف یونانی فلسفے کے مابین متعدد واضح مشابہتیں دیکھ سکتے ہیں ۔ آج بھی ہندو مت اور بدھ مت فلسفیانہ تفکر سے تحریک حاصل کرتے ہیں ۔

ہمیں ہندومت اور بدھ مت اکثر اس حقیقت پر زور دیتے

معلوم ہوتے ہیں کہ معبود تمام اشیا میں موجود ہے (کثرت پرستی)
اور یہ کہ انسان مذہبی بصیرت کے ذریعے بھگوان کے ساتھ یک جا
ہوسکتا ہے ۔ (سوفی ، تمہیں پلوتی نوس یاد ہے ؟) ۔ اس مقصد کے
لیے ضروری ہے کہ انسان گیان دھیان اور استغراقی سواد (10) کی
مشق کرے ۔ چنانچہ پورب میں انفعالیت (passivity) اور گوشہ
گیری دھرم کے آدرش ہوسکتے ہیں ۔ قدیم یونان میں بھی ایسے
لوگوں کی کمی نہیں تھی جو روح کی نجات کے لیے تپسوی طریقہ
زندگی اختیار کرنے یا مذہبی طور پہ دوسروں سے الگ تھلگ عزلت
کی زندگی بسر کرنے میں اعتقاد رکھتے تھے ۔ قرون وسطیٰ کی
خانقاہی زندگی کا سراغ ان عقاید میں لگایا جاسکتا ہے جن کی ابتدا
یونانی / رومی تہذیب سے ہوئی تھی۔

اسی طرح آواگون یا بار بار جنم لینے کا عقیدہ بھی متعدد
ہندیورپی ثقافتوں کا بنیادی عقیدہ ہے ۔ اڑھائی ہزار سال سے ہر
ہندو کے لیے زندگی کا بنیادی مقصد بار بار پیدا ہونے کے چکر
سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے ۔ افلاطون بھی تناسخ ارواح میں یقین
رکھتا تھا۔

سامی

سوفی ، آؤ ، اب ہم سامیوں کی طرف توجہ دیتے ہیں ۔ ان کا
تعلق بالکل مختلف ثقافت سے ہے اور ان کی زبان بھی بالکل
مختلف ہے ۔ سامیوں کی ابتدا جزیرہ نما عرب سے ہوئی تھی لیکن وہ
دنیا کے مختلف علاقوں کی طرف ہجرت بھی کرتے رہے ۔ یہودی
دو ہزار سال سے زیادہ مدت تک اپنے وطن سے دور رہے ۔ سامی
تاریخ اور ثقافت عیسائی دنیا کے ذریعے اپنے مصادر سے بعید ترین
علاقوں تک پہنچ گئی ، تاہم سامی ثقافت کو پھیلانے میں اسلام کا
بھی بڑا ہاتھ ہے۔

تینوں مغربی مذاہب ـــــ یہودیت ، عیسائیت اور
اسلام ـــــ کا مشترک سامی پس منظر ہے ۔ مسلمانوں کی مقدس

کتاب ــــ قرآن (مجید) ــــ اور پرانا عہدنامہ دونوں زبانوں کے سامی خاندان میں تحریر ہوئیں (7) ۔ پرانے عہدنامے میں خدا کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں ، ان میں سے ایک کا مادہ وہی ہے جو مسلمانوں کے اللہ کا ہے ۔ (لفظ "اللہ" (8) کا مطلب "خدا" ہے ۔)

جب ہم عیسائیت تک پہنچتے ہیں ، تصویر مزید پیچیدہ ہوجاتی ہے ۔ عیسائیت کا پس منظر بھی سامی ہے ، لیکن نیا عہدنامہ (9) یونانی میں تحریر کیا گیا تھا ۔ جب عیسائی دینیات (Theolo gy) یا مجموعہ عقاید (creed) مرتب ہوا ، یہ یونانی ، لاطینی اور متاخر یونانی (سکندر اعظم اور رومی شہنشاہ آگسٹس کے ، جس نے سن 14 میں انتقال کیا ، عہد ہائے حکومت کے درمیان کا زمانہ ہے جسے "یونانیت" کہا جاتا ہے) فلسفے سے متاثر ہوا ۔

ہندیورپی مختلف دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے ۔ اس کے برعکس سامیوں کا وصف یہ تھا کہ وہ قدیم ترین زمانے سے ہی ایک خدا کو مانتے چلے آرہے تھے اور اس بارے میں ان میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا ۔ ان کے اس عقیدے کو وحدانیت (mono- theism) کہا جاتا ہے ۔ یہودیت ، عیسائیت اور اسلام سب کا بنیادی تصور یہی ہے کہ خدا صرف ایک ہے ۔

سامیوں میں ایک اور بات مشترک تھی کہ تاریخ کے متعلق ان کا نقطہ نظر خطی یا خط دار (linear) تھی یعنی وہ یہ سمجھتے تھے کہ تاریخ دائرے میں نہیں گھومتی جیسا کہ ہندیورپیوں کا خیال تھا بلکہ مسلسل دراز ہوتی ہوئی لکیر (یا خط) کی طرح آگے بڑھتی ہے ۔ ابتدا میں خدا نے دنیا تخلیق کی اور یہیں سے تاریخ کا آغاز ہوا لیکن ایک روز تاریخ اپنے انجام کو پہنچ جائے گی اور یہی یوم حساب ہوگا جب خدا زندوں اور مردوں سے (ان کے اعمال کا) حساب لے گا ۔

تاریخ جو کردار (role) ادا کرتی ہے وہ ان تینوں مغربی مذاہب کا اہم وصف ہے ۔ عقیدہ یہ ہے کہ خدا تاریخ کے دھارے میں مداخلت کرتا ہے ــــ بلکہ تاریخ موجود ہی محض اس لیے ہے کہ خدا دنیا میں اپنے منشا (will) کا اظہار کرسکے ۔ جس طرح اس

نے ایک مرتبہ ابراہیم کی "موعودہ سرزمین" کی طرف رہنمائی کی تھی، بعینہٖ وہ تاریخ کے دوران میں بنی نوع انسان کے قدموں کی یوم حساب کی طرف رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ جب وہ دن آئے گا دنیا سے بدی نیست و نابود ہو جائے گی۔

تاریخ کے عمل میں زبردست زور دینے کے ساتھ ساتھ سامی ہزاروں سال تک تاریخ قلم بند کرنے میں مصروف رہے۔ اور یہ تاریخی جڑیں ان کی مقدس کتابوں اور صحیفوں کے مرکزی نکات کی تشکیل کرتی ہیں۔

آج بھی یروشلم کا شہر یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے یکساں انتہائی اہم اور بنیادی معنویت کا حامل مذہبی مرکز ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان تینوں کا کچھ نہ کچھ مشترکہ پس منظر ہے۔

شہر میں تینوں مذاہب کی بعض اہم ترین عبادت گاہیں ـــــ یہودیوں کے صومعے، عیسائیوں کے کلیسا اور مسلمانوں کی مساجد ـــــ موجود ہیں۔ چنانچہ یہ بات انتہائی الم ناک ہے کہ یروشلم ان تینوں مذاہب کے مابین فساد کا باعث بن گیا ہے ـــــ لوگ ہزاروں کی تعداد میں ایک دوسرے کو قتل کرتے چلے آ رہے ہیں کیونکہ وہ اس بات پر متفق نہیں ہو سکتے کہ اس "ابدی شہر" پر غلبہ کسے حاصل ہو۔ خدا کرے کہ اقوام متحدہ کسی روز اسے تینوں مذاہب کے ماننے والوں کے لیے مقدس زیارت گاہ بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ (فلسفے کے نصاب کا یہ جو زیادہ عملی حصہ ہے، ہم فی الحال اس کا مزید تذکرہ نہیں کریں گے۔ ہم یہ معاملہ سراسر ہلڈے کے باپ پر چھوڑ رہے ہیں۔ تم اب تک سمجھ چکی ہو گی کہ وہ لبنان میں اقوام متحدہ کے مبصر کی حیثیت سے تعینات ہے۔ بلکہ میں تمہیں صحیح تر بات بتا سکتا ہوں کہ وہ وہاں میجر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ اگر تمہیں کوئی تعلق نظر آنے لگا ہے تو خوشی کی بات ہے کیونکہ ہونا بھی یہی چاہیے۔ تاہم ہمیں واقعات کا منطقی اندازہ لگانے سے احتراز کرنا چاہیے!)

ہم کہہ چکے ہیں کہ ہندیورپیوں کے نزدیک حواس عمر

میں سے اہم ترین بصارت (کی حس) تھی ۔ اس کے برعکس سامی ثقافتوں میں سماعت (کی حس) کو جو اہمیت حاصل تھی ، اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ یہودیوں کے مجموعہ عقاید کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے : "اے اسرائیل ، سنو ۔" پرانے عہدنامے میں ہم پڑھتے ہیں کہ لوگوں نے کس طرح خدا کا کلام (word) "سنا" اور یہودی پیغمبر کس طرح اپنے وعظ کا آغاز عام طور پر ان الفاظ سے کرتے تھے : "یہو واہ (خدا) نے یہ کہا ۔" عیسائیت میں بھی خدا کا کلام "سننے" پر زور دیا جاتا ہے ۔ عیسائیت ، یہودیت اور اسلام سبھی کی مذہبی رسوم کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بلند آواز سے "پڑھا جاتا" یا "تلاوت" کی جاتی ہے ۔

میں نے یہ ذکر بھی کیا تھا کہ ہندیورپی ہمیشہ اپنے دیوتاؤں کی تصویریں ، شبیہیں اور بت بناتے رہتے تھے ۔ سامیوں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ یہ کام کبھی نہیں کرتے تھے ۔ ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جاتی تھی کہ وہ خدا یا "معبود" (deity) کی تصویریں تخلیق کریں گے ۔ پرانا عہدنامہ حکم دیتا ہے کہ خدا کی کوئی شبیہہ نہ بنائی جائے ۔ یہودیت اور اسلام دونوں میں آج بھی اسے قانون کا درجہ حاصل ہے ۔ مزید برآں اسلام میں فوٹوگرافی اور آرٹ دونوں کو عام طور پر سخت ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ کسی چیز کے "تخلیق" کرنے میں انسانوں کو خدا کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے ۔

تم غالباً سوچ رہی ہوگی کہ عیسائی گرجے تو یسوع اور خدا کی تصاویر سے بھرے پڑے ہیں ۔ سوفی ، یہ بات صحیح ہے لیکن یہ تو محض ایک مثال ہے کہ عیسائیت کس طرح دنیائے یونان و روم سے متاثر ہوئی ۔ (ویسے یونانی آرتھوڈوکس چرچ ـــــ یعنی یونان اور روس ـــــ میں آج بھی بائبل کی حکایتوں پر مبنی "منقش شبیہیں" ، مجسمے اور صلیبوں پر عیسیٰ کی تصویریں (cruci-cifixes) بنانے کی ممانعت ہے ۔)

یورپ کے عظیم مذاہب کے مقابلے میں تینوں مغربی مذاہب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ خدا اور اس کی مخلوق کے مابین فاصلہ حائل ہے ۔ مقصد تناسخ کے چکر سے چھٹکارا حاصل کرنا

نہیں بلکہ گناہ اور سرزنش سے نجات حاصل کرنا ہے ۔ مزید برآں مذہبی زندگی عبادت ، وعظوں اور صحائف کے مطالعے سے عبارت باتی ہے نہ کہ گیان دھیان اور اتمآتما سمواد (self-communion) سے (جیسا کہ مشرقی مذاہب سمجھتے ہیں)۔

اسرائیل

سوفی ، میرا تمہارے مذہبیات کے استاد کے ساتھ مقابلہ کرنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں ، لیکن مجھے عیسائیت کے یہودی پس منظر کا مختصر خلاصہ پیش کرنے کی ضرور اجازت دو۔

اس سب کا آغاز تب ہوا جب خدا نے دنیا تخلیق کی - یہ کیسے ہوا اس کے بارے میں تم بائبل کے پہلے ہی صفحے پر پڑھ سکتی ہو ۔ پھر انسان خدا کے خلاف بغاوت پر اتر آیا - اس کی سزا اسے صرف یہی نہیں ملی کہ آدم اور حوا کو بیک بینی و دوگوش باغ عدن سے نکال دیا گیا ـــــ بلکہ اس کی جلو میں موت بھی دنیا میں وارد ہوگئی۔

انسان کی خدا کی نافرمانی کا موضوع بائبل میں بار بار دہرایا گیا ہے ۔ اگر ہم " کتاب پیدائش " (بائبل کا پہلا باب) کا مزید مطالعہ کریں تو ہمیں طوفان اور نوح کی کشتی کا ذکر ملے گا ۔ پھر ہم پڑھتے ہیں کہ خدا نے ابراھیم اور ان کی آل کے ساتھ میثاق (covenant) باندھا - اس میثاق ـــــ یا معاہدے (pact)ـــــ کی رو سے ابراہیم اور ان کی آل نے خداوند کے احکام (commandments) کی تعمیل کرنا تھی ۔ اس کے عوض خداوند نے وعدہ فرمایا کہ وہ ابراہیم کی تمام اولاد کو اپنے حفظ وامان میں رکھے گا ۔ جب تقریباً بارہ سو سال قبل از مسیح موسیٰ کو کوہ طور پر دس احکام دئے گئے ، اس میثاق (11) کی ازسرنو تجدید کی گئی - اس وقت اسرائیلی کافی عرصے سے مصریوں کے غلام چلے آرہے تھے لیکن خداوند کی تائید ونصرت سے انہیں واپس اسرائیل کی سرزمین پر پہنچا دیا گیا۔

عیسیٰ کی پیدائش سے ایک ہزار سال قبل ـــــ چنانچہ اس چیز کے جسے ہم یونانی فلسفہ کہتے ہیں ، وجود میں آنے سے کہیں پہلے ـــــ ہم اسرائیل کے تین عظیم بادشاہوں کا ذکر سنتے ہیں ۔ سب سے پہلے ساؤل (12) (Saul) تھے ۔ ان کے بعد داؤد اور سلیمان آئے ۔ اس وقت تک تمام اسرائیلی ایک سلطنت میں متحد ہوچکے تھے اور داؤد کے عہد میں انہیں خاص طور پر سیاسی ، عسکری اور ثقافتی شکوہ کا تجربہ ہوا۔

جب بادشاہوں کا انتخاب عمل میں آتا تھا ، ان کا (تیل سے) مسح عوام کرتے تھے ۔ یوں انہیں مسیح کا ، جس کے معنی ہیں " وہ جس کا مسح کیا گیا " ، خطاب مل جاتا ۔ مذہبی مفہوم میں بادشاہ کو خدا اور اس کی رعایا کے مابین بچولا (go - between) سمجھا جاتا تھا ۔ چنانچہ بادشاہ کو " خدا کا بیٹا " اور ملک کو " خدا کی بادشاہی " کہا جاسکتا تھا۔

لیکن کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اسرائیل کی قوت زوال پذیر ہونے لگی اور مملکت دو حصوں ـــــ مملکت شمال (اسرائیل) اور مملکت جنوب (یہودیہ یا Judea) میں منقسم ہوگئی۔ 722 ق م میں شمالی مملکت کو آشوریوں نے تسخیر کرلیا اور یہ تمام سیاسی اور مذہبی اہمیت سے محروم ہوگئی ۔ جنوبی مملکت کا حال بھی کچھ اچھا نہ رہا ۔ اسے 586 ق م میں اہل بابل نے فتح کرلیا ۔ اس کا معبد مسمار کردیا گیا ۔ اس کے بیشتر باشندوں کو غلام بنا لیا گیا اور بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر بابل پہنچا دیا گیا ۔ بابل میں ان کی " اسیری " 539 ق م تک جاری رہی ۔ تب کہیں انہیں یروشلم واپس آنے کی اجازت ملی اور عظیم ہیکل کی دوبارہ تعمیر کی گئی ۔ لیکن ولادت عیسیٰ تک کے باقی عرصے کے دوران میں یہودی غیر ملکی تسلط کے زیر اثر زندگی گزارنے پر مجبور رہے۔

یہودی اپنے آپ سے جو سوال بار بار پوچھتے تھے ، وہ یہ تھا کہ جب خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اسرائیل کو اپنے ہاتھ میں رکھے گا ، پھر داؤد کی سلطنت کیوں تباہ ہوئی اور یہودیوں کو بار بار عظیم مصائب سے کیوں دوچار ہونا پڑا ؛ لیکن خود لوگوں نے بھی تو وعدہ کیا تھا کہ وہ خدا کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں گے ۔ چنانچہ

آہستہ آہستہ یہ بات عام تسلیم کی جانے لگی کہ خدا اسرائیلیوں کو ان کی نافرمانی کی سزا دے رہا ہے۔

تقریباً ساڑھے سات سو سال قبل از مسیح اور اس کے بعد ایسے پیغمبر آتے رہے جن کی تبلیغ کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ خدا اسرائیلیوں سے اس لیے ناراض ہے کیونکہ انہوں نے اس کے احکام کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ کہتے تھے کہ ایک دن آئے گا جب خدا ان سے حساب لے گا۔ ہم اس قسم کی پیش گوئیوں کو یوم حشر کی پیش گوئیاں کہتے ہیں۔

امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مزید پیغمبر آتے رہے۔ ان کی تعلیم یہ ہوتی تھی کہ خدا اپنے بندوں میں سے چند ایک منتخب ہستیوں کی بخشش کردے گا اور انہیں "شاہ امن" یا داؤد گھرانے کا کوئی بادشاہ بھیج دے گا۔ وہ داؤد کی قدیم سلطنت بحال کردے گا اور لوگوں کو ایک بار پھر خوشحال مستقبل مل جائے گا۔

"جو لوگ تاریکی میں پھرتے رہے ہیں انہیں عظیم روشنی نظر آنے گی۔" پیغمبر یسعیاہ (13) نے کہا تھا، "اور جو لوگ موت کے سائے میں رہتے رہے ہیں ان پر روشنی منوگن ہوگی۔" ہم اس قسم کی پیشینگوئیوں کو نجات کی پیشینگوئیاں کہتے ہیں۔ (عبرانی میں "یسعیاہ" کے معنی ہی "خدا کی نجات" ہیں۔ مترجم)

الغرض اسرائیل کی اولاد داؤد کے دور میں مسرت اور شادمانی کی زندگی گزارتی رہی لیکن بعد ازاں جب ان کے حالات خراب ہونے لگے، پیغمبر اعلان کرنے لگے کہ داؤد گھرانے کا کوئی فرد نیا بادشاہ بن کر آئے گا۔ یہ "مسیح" یا "خدا کا بیٹا (14)" لوگوں کو "نجات" دلائے گا، اسرائیل کی حشمت بحال کردے گا اور "خداوند کی بادشاہت" قائم کردے گا۔

یسوع

سوفی: میرا خیال ہے کہ تم ابھی تک میرے ساتھ ہو۔ کلیدی الفاظ "مسیح"، "خدا کا بیٹا" اور "خداوند کی بادشاہی" ہیں۔

ابتدا میں ان سب کو سیاسی مفاہیم پہنائے جاتے رہے ۔ یسوع کے زمانے میں ایسے بے شمار لوگ موجود تھے جن کا عقیدہ تھا کہ عنقریب نیا " مسیح " آنے گا جو ذہانت ، فطانت اور لیاقت کے اعتبار سے شاہ داؤد کا ہم پلہ سیاسی ، عسکری اور مذہبی رہنما ثابت ہوگا ۔ یوں اس " نجات دہندہ " کے متعلق سمجھا جانے لگا کہ یہودیوں کو رومی تسلط کے تحت جو مصائب بھگتنا پڑ رہے ہیں ، وہ ان کا خاتمہ کردے گا اور قومی رہنما کا روپ دھار لے گا۔

لیکن یہ نری بڑی خوش فہمیاں تھیں ۔ لیکن بعض اور لوگ بھی تھے ۔ وہ کہیں زیادہ دور اندیش تھے ۔ گزشتہ دو سو سالوں میں ایسے پیغمبروں کا ظہور ہوتا رہا جو سمجھتے تھے کہ " موعودہ مسیح " ساری دنیا کا نجات دہندہ ثابت ہوگا ۔ وہ محض اسرائیلیوں کو غیر ملکی تسلط سے نجات نہیں دلائے گا بلکہ وہ تمام بنی نوع انسان کو گناہ ، سرزنش ـــــ اور سب سے بڑھ کر ـــــ موت سے نجات دلائے گا ۔ خلاصی (redemption) کے معنوں میں " نجات " (salvation) کا تصور اس پورے علاقے میں دوروتزدیک پھیلا ہوا تھا جس پر یونانیت کا سکہ چلتا تھا۔

چنانچہ ناصریہ (Nazareth) کے یسوع آجاتے ہیں ۔ وہ واحد شخص نہیں تھے جنہوں نے اپنے آپ کو " موعودہ مسیح " کی حیثیت سے پیش کیا تھا ۔ یسوع بھی " خدا کا بیٹا " ،(15) " خدا کی بادشاہی " اور " خلاصی " جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ اس طریقے سے وہ پرانے پیغمبروں کے ساتھ اپنا تعلق جوڑتے ہیں ۔ وہ گدھی پر سوار یروشلم میں داخل ہوتے ہیں اور جب لوگ ان کی نجات دہندہ کی حیثیت سے ستائش کرتے ہیں ، وہ انہیں روکتے نہیں ، بلکہ اس کی کھلی اجازت دے دیتے ہیں اور یوں وہ براہ راست قدیم بادشاہوں کے طور طریقے اپنا لیتے ہیں جو وہ مخصوص " تخت نشینی کی رسم " کی ادائیگی کے دوران میں اختیار کرتے تھے ۔ وہ لوگوں سے اپنا مسح بھی کرا لیتے ہیں ۔ " وقت کی تکمیل ہوگئی ہے " وہ کہتے ہیں ، " اور خدا کی بادشاہی " آگئی ہے ۔

لیکن یہاں ایک اہم نکتہ ہے ۔ یسوع نے اپنے آپ کو دوسرے " مسیحوں " سے یوں ممیز کیا کہ انہوں نے صاف صاف

کہہ دیا کہ وہ کوئی سیاسی یا فوجی باغی نہیں ، ان کا مشن (رسالت) کہیں عظیم تر ہے ۔ وہ ہر شخص کی نجات اور خدا کی بخشش کی دعا کرتے تھے ۔ جن لوگوں سے ان کی راستے میں ملاقات ہوئی ، ان سے انہوں نے کہا : " اس کے ہم نام (16) کی وجہ سے تمہارے گناہوں کی بخشش کی جاتی ہے ۔"

اس طریقے سے " گناہوں کی معافی " کی تقسیم کا فعل ایک ایسی چیز تھی جو پہلے کبھی کسی نے سنی نہیں تھی ۔ اور اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ وہ خدا کو " باپ " (ابا / abba) کہہ کر پکارتے تھے ۔ اس زمانے کی یہودی قوم میں اس قسم کی قطعاً کوئی مثال نہیں ملتی تھی ۔ چنانچہ کوئی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ یہودی عالموں نے ان کے خلاف احتجاج شروع کردیا ۔

چنانچہ صورت حال کچھ یوں تھی : یسوع کے عہد میں بے شمار لوگ مسیح کے منتظر تھے جس نے (ان کے خیال کے مطابق) ترک وانتقام سے (یا دوسرے الفاظ میں آگ اور تلوار سے) خدا کی بادشاہی بحال کرنا تھی ۔ " خدا کی مملکت یا بادشاہی " (17) کی ترکیب یسوع کے وعظوں میں بار بار استعمال ہوئی ہے —— مگر اس کا مفہوم کہیں وسیع تر تھا ۔ یسوع کہتے تھے کہ " خدا کی بادشاہی " کا مطلب یہ ہے کہ اپنے پڑوسیوں سے محبت کی جائے ، کمزوروں اور مسکینوں پہ ترس کھایا جائے اور جنہوں نے غلطی کا ارتکاب کیا ہے ، انہیں معاف کردیا جائے ۔

" خدا کی مملکت یا بادشاہی " کی ترکیب کے صدیوں پرانے معانی میں ، جن میں جنگ جویانہ مضمرات شامل تھے ، یہ ڈرامائی تبدیلی تھی ۔ لوگ کسی عسکری رہنما کی (آمد کی) توقع باندھے ہوئے تھے جو بہت مختصر عرصے میں " خدا کی بادشاہی " کے قیام کا اعلان کردے گا لیکن آیا کون ؟ یسوع ، جو پہلی اور بعد پہنے انہیں بتاتے ہیں کہ " خدا کی بادشاہی " —— یا " نیا میثاق " —— یہ ہے : " اپنے پڑوسی سے اسی طرح محبت کرو جس طرح تم اپنے آپ سے کرتے ہو ۔ " لیکن ، سوال ، بات یہیں ختم نہیں ہوتی ۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا : " ہمیں اپنے دشمنوں سے محبت کرنا چاہیے ۔ جب وہ ہمارے تھپڑ ماریں ، ہمیں جوابی وار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنا

دوسرا گال بھی ان کے سامنے پیش کردینا چاہیے اور ہمیں چاہیے
کہ ہم معاف کردیں ـــ سات مرتبہ نہیں بلکہ ستر ضرب سات
مرتبہ۔"

یسوع نے خود اپنے عمل سے ثابت کردیا کہ انہیں
کسبیوں، بدعنوان سودخوروں اور سیاسی تخریب کاروں کے ساتھ کلام
کرنے میں کوئی عار نہیں۔ لیکن وہ اس سے بھی آگے چلے گئے۔
انہوں نے کہا: "خدا کی رحمت اتنی بےپایاں ہے کہ اگر کوئی
نکھٹو شخص، جس نے اپنے باپ کا ترکہ چٹکیوں میں اڑا دیا ہو
ـــ یا کوئی معمولی ٹیکس کلرک جس نے اپنی جیبیں سرکاری
رقوم سے بھر لی ہوں، توبہ کرلیتا ہے اور بخشش کے لیے گڑگڑا
کر دعا کرتا ہے، وہ خدا کی نگاہوں میں راست باز ٹھہرتا ہے۔"

ابھی اور سنو ـــ وہ ایک قدم مزید آگے چلے گئے
ـــ یسوع نے فرمایا کہ خدا کی نظروں میں اس قسم کے گنہگار
ان بے داغ فریسیوں (18) کی نسبت، جو اپنی نیکی اور فضیلت کا
ڈھنڈورا پیٹتے اور نمائش کرتے رہتے ہیں، کہیں زیادہ راست باز اور
خدا کی بخشش کے کہیں زیادہ مستحق ہیں۔

یسوع نے صاف صاف کہہ دیا کہ کوئی شخص محض اپنے
اعمال سے خدا کی رحمت کا امیدوار نہیں ہوسکتا۔ ہم اپنے آپ کو
خلاصی نہیں دلا سکتے (جیسا کہ اکثر یونانیوں کا عقیدہ تھا)۔

پہاڑ (19) پر اپنے وعظوں میں یسوع جن سخت اخلاقی
پابندیوں کا تذکرہ کرتے تھے، ان کا مطلب محض یہ بتانا نہیں تھا
کہ خدا کے منشا سے کیا مراد ہے بلکہ یہ جتانا بھی تھا کہ خدا کی
نگاہوں میں کوئی شخص راست باز نہیں ہوتا۔ وہ کہتے تھے کہ
بے شک خدا کی رحمت بےپایاں ہے، پھر بھی ہمیں خدا کی
طرف رجوع کرنا اور اس سے بخشش کی دعا کرنا ہوگی۔

میں یسوع اور ان کی تعلیمات کے تفصیلی مطالعے کا کام
تمہارے مذہبیات کے استاد کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ اسے خاصی
مشقت جھیلنا ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ وہ یہ سمجھانے میں کامیاب
ہوجائے گا کہ یسوع کتنے غیرمعمولی انسان تھے۔ انہوں نے بڑے
پرجودت اور اختراعی انداز سے پرانے جنگی نعروں کو بالکل نئے اور

وسیع معانی پہنا دئے تھے ۔ پھر اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ ان کا انجام صلیب (20) پر ہوا ۔ خلاصی اور نجات کے متعلق وہ جو کچھ کہتے تھے ' اس سے لوگوں کے مفادات اور اختیارات پر اتنی زد پڑتی تھی کہ ان کا راستے سے ہٹایا جانا ناگزیر ہوگیا۔

جب ہم سقراط کا مطالعہ کر رہے تھے ہم نے دیکھا تھا کہ لوگوں کی عقل کو اپیل کرنے کا انجام کتنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے ۔ یسوع کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مشروط برادرانہ محبت اور غیر مشروط عفو کے مطالبے کے عواقب کتنے بھیانک ہوسکتے ہیں ۔ اور یہ تو آج کی دنیا میں بھی ہمیں نظر آتا رہتا ہے کہ جب عظیم طاقتوں کو امن ' اخوت ' غریبوں اورمسکینوں کے لیے روٹی اور مملکت کے دشمنوں کے لیے عفو جیسے سیدھے سادے مطالبات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ بھی لرزہ براندام بلکہ منہدم ہوجاتی ہیں۔

تمہیں شاید یاد ہوگا کہ جب ایتھنز کے راست بازترین شخص کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے ' افلاطون کتنا برافروختہ ہوا تھا ۔ عیسائی تعلیمات کے مطابق اس دنیا میں جتنے بھی لوگ آئے ' ان میں مسیح واحد راست باز شخص تھے ' پھر بھی انہیں موت کی سزا ہوئی ۔ عیسائی کہتے ہیں کہ انہوں نے بنی نوع انسان کی خاطر اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی ۔ اسے عام طور پر عیسائی مسیح کی "اذیت" یا مسیح کے "مصائب" ("Passion") کہتے ہیں ۔ وہ "مرد غم ناک" (suffering servant) تھے ۔ انہوں نے بنی نوع انسان کے گناہوں کا بار اپنے کندھوں پر اٹھا لیا تاکہ ہماری طرف سے "کفارہ" ادا ہوسکے اور ہمیں خدا کے غضب سے بچایا جاسکے۔

پال

یسوع کے مصلوب اور مدفون کئے جانے کے بعد افواہیں پھیلنے لگیں کہ وہ قبر سے نکل گئے ہیں ۔ یوں انہوں نے ثابت

کردیا کہ وہ کوئی معمولی انسان نہیں تھے ۔ وہ صحیح معنوں میں "خدا کے بیٹے" تھے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی مسلک (Christian Church) کی بنیاد ایسٹر (21) کی صبح پڑی جب مسیح کے دوبارہ جی اٹھنے کی افواہیں پھیلیں ۔ اور پال اس کی پہلے ہی تصدیق کرچکے ہیں ۔ "اگر یسوع دوبارہ نہیں اٹھے ، پھر ہماری تبلیغ بیکار اور تمہارا ایمان بیکار ہے۔"

اب تمام انسان اپنے جسم کے دوبارہ جی اٹھنے کی امید کرسکتے تھے کیونکہ یسوع اس لیے مصلوب ہوئے تھے کہ ہماری نجات کا سامان فراہم کیا جاسکے ۔ لیکن ، ذیر سوفی ، یہودی نقطہ نظر کے مطابق "روح کی لافناپذیری" یا کسی بھی شکل میں "تناسخ" کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ یہ یونانی ـــــ اور یوں ہند یورپی ـــــ تصور تھا ۔ عیسائیت کے نقطہ نگاہ کے مطابق انسان میں ایک بھی چیز ـــــ مثلاً روح ـــــ ایسی نہیں جو فی نفسہ غیر فانی ہو ۔ اگرچہ عیسائی مسلک "جسم کے دوبارہ جی اٹھنے میں اور ابدی زندگی میں" یقین رکھتا ہے ، مگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف خدا کا اعجاز (miracle) ہے کہ ہمیں موت اور "ابدی لعنت" (damnation) سے چھٹکارا ملتا ہے ، اس میں ہماری کسی خوبی یا فطری ـــــ یا خلقی ـــــ صلاحیت کا کوئی دخل نہیں۔

چنانچہ اوائلی عیسائیوں نے اپنے وعظوں میں یہ "خوش خبری" سنانا شروع کردی کہ جو لوگ یسوع مسیح پر ایمان لے آئیں گے ، ان کی نجات ہوجائے گی ۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یسوع مسیح کے وسیلے سے "خدا کی بادشاہی" حقیقت کا روپ اختیار کیا چاہتی ہے ۔ (وہ سمجھتے تھے کہ) اب ساری دنیا کو مسیح کا مطیع و منقاد بنایا جاسکتا ہے ۔ یونانی لفظ "Christ" (22) عبرانی لفظ "Messiah" کا ترجمہ ہے ۔ "اور اس کے معنی "جس کا مسح کیا گیا" ہیں۔

یسوع کے انتقال کے چند سال بعد پال (23) نے ، جن کا تعلق فریسیوں سے تھا ، عیسائیت قبول کرلی ۔ انہوں نے ساری یونانی / رومی دنیا کے تبلیغی دورے کئے اور عیسائیت کو عالمی

مذہب بنا دیا۔ ہم ان دوروں کا احوال (نیا عہدنامہ کے باب " رسولوں کے اعمال " میں پڑھتے ہیں۔ پال جو وعظ کہتے تھے اور عیسائیوں کی جس طرح رہنمائی کرتے تھے، اس کا ذکر ان متعدد خطوط (نیا عہدنامہ) میں ملتا ہے جو انہوں نے ابتدائی عہد کے عیسائی عبادت گزاروں کی جماعتوں کو تحریر کئے تھے۔

پھر وہ ایتھنز میں نمودار ہوتے ہیں۔ وہ گھومتے پھرتے سیدھے اس فلسفی شہر کے مرکزی چوک میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ جب انہوں نے " اس شہر کو سرتاپا بت پرستی میں ڈوبا پایا، ان کی روح کلبلانے لگی۔ " وہ ایتھنز میں یہودیوں کے صومعہ (معبد) کے چکر لگاتے اور ایپی قوری اور رواقی فلسفیوں کے ساتھ مناظرے کرتے۔ وہ انہیں اریوپگس (Aeropagos) پہاڑی پر لے گئے اور ان سے دریافت کرنے لگے: " کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ تم جس نئے عقیدے کا ذکر کر رہے ہو، وہ ہے کیا؟ چونکہ تم نے ہمارے کانوں تک بعض عجیب وغریب باتیں پہنچائی ہیں، ہم جاننا چاہیں گے کہ ان کا مطلب کیا ہے؟"

سوفی، کیا تم تصور کرسکتی ہو؟ ایک یہودی اچانک ایتھنز کے بازار میں نمودار ہوتا ہے اور کسی نجات دہندہ کے متعلق گفتگو شروع کردیتا ہے جو پہلے تو مصلوب ہوا لیکن بعد میں قبر سے دوبارہ جی اٹھا۔ پال کے ایتھنز کے اس دورے سے ہی ہمیں اس تصادم کا احساس ہوجاتا ہے جو یونانی فلسفے اور خلاصی کے مسیحی نظریے کے مابین برپا ہونا تھا۔ لیکن پال واضح طور پر اہل ایتھنز کو اپنی باتیں سنوانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اریوپگس پہاڑی کے اوپر ــــ اور ایکروپولس کے باوقار معبدوں کے نیچے ــــ وہ مندرجہ ذیل تقریر کرتے ہیں:

اے ایتھنز والو! میں دیکھتا ہوں کہ تم ہر بات میں دیوتاؤں کے بڑے ماننے والے ہو۔ چنانچہ میں نے سیر کرتے اور تمہارے معبدوں پر غور کرتے وقت ایک ایسی قربان گاہ بھی پائی جس پر لکھا تھا کہ نامعلوم خدا کے لیے۔ پس جس کو تم بغیر معلوم کئے پوجتے ہو میں تم کو اسی کی خبر دیتا ہوں۔

جس خدا نے دنیا اور اس کی سب چیزوں کو پیدا کیا وہ آسمان اور زمین کا مالک ہوکر ہاتھ کے بنائے ہوئے مندروں میں نہیں رہتا - نہ کسی چیز کا محتاج ہوکر آدمیوں کے ہاتھوں سے خدمت لیتا ہے کیونکہ وہ تو خود سب کو زندگی اور سانس اور سب کچھ دیتا ہے - اور اس نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر قوم تمام روئے زمین پر رہنے کے لیے پیدا کی اور ان کی میعادیں اور سکونت کی حدیں مقرر کیں - تاکہ خدا کو ڈھونڈیں - شاید کہ ٹٹول کر اسے پائیں ہرچند وہ ہم میں سے کسی سے دور نہیں - کیونکہ اسی میں ہم جیتے اور چلتے پھرتے اور موجود ہیں - جیسا تمہارے شاعروں میں سے بھی بعض نے کہا ہے کہ ہم تو اس کی نسل بھی ہیں - پس خدا کی نسل ہو کر ہم کو یہ خیال کرنا مناسب نہیں کہ ذات الٰہی اس سونے یا روپے یا پتھر کی مانند ہے جو آدمی کے ہنر اور ایجاد نے گھڑے ہوں - پس خدا جہالت کے وقتوں سے چشم پوشی کرکے اب سب آدمیوں کو ہر جگہ حکم دیتا ہے کہ توبہ کریں۔

کیونکہ اس نے ایک دن ٹھہرایا ہے جس میں وہ راستی سے دنیا کی عدالت اس آدمی کی معرفت کرے گا جسے اس نے مقرر کیا ہے اور اسے مردوں میں سے جلا کر یہ بات سب پر ثابت کردی ہے - (نیا عہد نامہ : رسولوں کے اعمال : باب 17 : آیات 23 تا 31۔ ترجمہ از بائبل اردو ایڈیشن ،لاہور)

سوفی ، سوچ ، پال اور ایتھنز میں ا ایپی قوری ، رواقی ، یا نواافلاطونی فلسفے سے بالکل مختلف عیسائیت ایک اور ہی چیز کی حیثیت سے یونانی / رومی مملکت میں در انداز ہونا شروع ہوگئی ہے - تاہم پال کو اس ثقافت میں کچھ مشترک باتیں مل جاتی ہیں - وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ خدا کی تلاش تمام انسانوں میں فطری ہے - یونانیوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی - لیکن پال کی تبلیغ میں جو نئی بات تھی ، وہ یہ تھی کہ خدا نے اپنے آپ کو اپنے بندوں کے سامنے منکشف بھی کردیا ہے اور فی الحقیقت ان تک پہنچ بھی گیا ہے - چنانچہ وہ اب " فلسفی " خدا نہیں رہا جس تک

لوگ اپنی تفہیم کے ذریعے رسائی حاصل کر سکتے ہیں ۔ نہ ہی وہ "سونے ، چاندی یا پتھر کی مورتی " ہے ـــــ اس قسم کی مورتیاں اوپر ایکروپولس میں اور نیچے بازار میں کثیر تعداد میں موجود تھیں ۔ وہ وہ خدا ہے جو " ہاتھوں سے بنائے ہوئے معبدوں میں نہیں رہتا ۔ " وہ ذاتی خدا ہے جو تاریخ کے دھارے میں مداخلت کرتا ہے اور بنی نوع انسان کی خاطر صلیب پر جان دے دیتا ہے۔

ہم " رسولوں کے اعمال " میں پڑھتے ہیں کہ جب پال اریوپگس پر اپنا وعظ ختم کر چکے تو بعض لوگوں نے ان کی اس بات کا " ٹھٹھا " اڑایا ۔ لیکن بعض نے ان سے کہا ۔ " یہ بات ہم تم سے پھر کبھی سنیں گے ۔ " تاہم چند ایسے بھی تھے جو ان کے ساتھ مل گئے اور (عیسائیت) پر ایمان لے آئے ۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایمان لانے والوں میں ایک عورت بھی شامل تھی ۔ اس کا نام دمارس (Damaris) تھا ۔ اس کا شمار انتہائی جوشیلے عیسائیوں میں ہوتا ہے۔

یوں پال نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں ۔ یسوع کی موت کے چند دہائیوں بعد تمام اہم یونانی اور رومی شہروں ـــــ ایتھنز ، روم ، سکندریہ ، ایفی سس (24) اور کورنتھ (25) ـــــ میں عیسائی جماعتیں وجود میں آگئی تھیں ۔ اس کے بعد تین چار سو سال کے عرصے میں یونانیت کے زیر اثر ساری مغربی دنیا عیسائیت کی حلقہ بگوش ہو گئی۔

عقاید

عیسائیت میں پال کو جو بنیادی اہمیت حاصل ہے ، اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ وہ مبلغ تھے ۔ انہیں عیسائی جماعتوں میں بھی گہرا اثر و رسوخ حاصل تھا کیونکہ انہیں روحانی رہنمائی کی شدید ضرورت تھی۔

یسوع کے بعد ابتدائی سالوں کے دوران میں ایک اہم

سوال یہ تھا: کیا غیر یہودی یہودیت قبول کئے بغیر عیسائی بن سکتے ہیں؟ مثلاً، کیا کسی یونانی کو (یہودیوں کے) غذائی قوانین کی پابندی کرنا چاہیے؟ پال کا عقیدہ تھا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ کہتے تھے عیسائیت محض یہودی فرقہ نہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر ہے، نجات کے ہمہ گیر پیغام کی حیثیت سے یہ ہر ایک سے مخاطب ہے، اور خدا اور اسرائیلیوں کے مابین "پرانے میثاق" کی جگہ "نئے میثاق" نے لے لی ہے جو یسوع نے خدا اور انسانوں کے مابین استوار کیا ہے۔

تاہم عیسائیت اس زمانے کا واحد مذہب نہیں تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یونانیت (Hellenism) کس طرح مذاہب کے ادغام سے متاثر ہوئی تھی۔ چنانچہ کلیسا کے لیے یہ نہایت ضروری تھا کہ وہ آگے بڑھتا اور عیسائی عقاید کی مختصر مگر جامع تعریف کرتا تاکہ اپنے اور دوسرے مذاہب کے درمیان فاصلہ قائم کیا جاسکتا اور خود عیسائی مسلک میں تفرقے کی روک تھام کی جاسکتی۔ چنانچہ عقاید کا پہلا مجموعہ مرتب کیا گیا جس میں عیسائیت کے بنیادی اصولوں اور عقیدوں کی تلخیص شامل تھی۔

ان مرکزی اصولوں میں ایک یہ تھا کہ یسوع انسان بھی ہیں اور "خدا" بھی۔ وہ محض اپنے اعمال کی بنا پر "خدا کے بیٹے" نہیں تھے۔ وہ خود "خدا" تھے۔ لیکن وہ "سچے انسان" بھی تھے جو بنی نوع انسان کے مصائب میں شریک رہے اور انہوں نے حقیقتاً صلیب پر مصائب بھگتے۔

بظاہر یہ تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن صحیح معنوں میں کلیسا کا پیغام یہ تھا کہ خدا انسان بن گیا ہے۔ یسوع "نیم خدا" (demigod) یعنی نصف خدا اور نصف انسان نہیں تھے۔ اس قسم کے "نیم خداؤں" یا "نیم دیوتاؤں" کا عقیدہ یونان اور یونانیت سے متاثر علاقوں میں عام تھا۔ کلیسا کا خیال تھا کہ یسوع "کامل خدا، کامل انسان" تھے۔

پس نوشت

مائی ڈیر سوفی ، یہ سب کچھ ایک مربوط شکل کیسے اختیار کرتا ہے ، مجھے اس کے متعلق چند الفاظ کہنے دو ۔ جب یونانی / رومی دنیا میں عیسائیت کا نفوذ شروع ہوتا ہے ، ہمیں دو ثقافتوں کے مابین ڈرامائی "ملاقات" کا منظر دکھائی دیتا ہے ۔ ہم تاریخ کے ایک عظیم ثقافتی انقلاب کا بھی نظارہ کرتے ہیں ۔

اب ہم عہد عتیق سے باہر نکل رہے ہیں ۔ ابتدائی یونانی فلسفیوں کے عہد کے بعد تقریباً ایک ہزار سال کی مدت گزر چکی ہے ۔ اب ہمارے آگے عیسائی قرون وسطیٰ ہے ۔ اس کا عرصہ بھی تقریباً ایک ہزار سال پر محیط ہے ۔

جرمنی کے شاعر گوئٹے نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "جو شخص تین ہزار سال سے استفادہ نہیں کرسکتا ، وہ بمشکل اپنا گزارہ کرسکتا ہے ۔" میں نہیں چاہتا کہ تمہارا انجام بھی اتنا ہی افسوس ناک ہو ۔ تمہیں تمہاری تاریخی جڑوں سے آشنا کرانے کے لیے مجھ سے جو کچھ بن پڑا ، میں کروں گا ۔ انسان بننے کا یہی واحد طریقہ ہے ۔ بے لباس بوزنے سے بڑھ کر کچھ بننے کا یہی واحد طریقہ ہے ۔ اگر آدمی خلا (vacuum) میں بے مقصد پھرنے سے بچنا چاہتا ہے ، تو اس کے لیے یہی واحد طریقہ ہے ۔

"انسان بننے کا یہی واحد طریقہ ہے ۔ بے لباس بوزنے سے بڑھ کر کچھ بننے کا یہی واحد طریقہ ہے . . . "

سوفی کچھ دیر بیٹھی باڑ کے چھوٹے موٹے شگافوں میں سے باغ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی ۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ اپنی تاریخی جڑوں سے واقف ہونا کیوں اتنا ضروری ہے ۔ اسرائیل کی اولاد کے لیے یہ بات یقیناً اہم تھی ۔

وہ بذات خود محض عام انسان تھی ۔ لیکن اگر وہ اپنی تاریخی جڑوں سے آشنا ہوگئی ، پھر وہ نسبتاً کم عام انسان رہے گی ۔

اسے اس کرہ ارض پر رہتے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا ، یہ صرف چند سالوں

پر محیط تھا۔ لیکن اگر بنی نوع انسان کی تاریخ اس کی اپنی تاریخ ہے، پھر اس کی عمر ہزاروں سال ہے۔

15۔ قرونِ وسطیٰ

* * *

... جزوی طور پر راستہ طے کرنا غلط راستے پر چلنے کے مترادف نہیں ...

ایک ہفتہ گزر گیا لیکن سوفی کو البرٹو کنوکس کا کوئی خط نہ ملا۔ لبنان سے بھی کوئی مزید کارڈ موصول نہ ہوا حالانکہ وہ اور جوآنا ان کارڈوں کے متعلق، جو انہیں میجر کی کٹیا میں ملے تھے، مسلسل گفتگو کرتی رہتی تھیں۔ جوآنا کو اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی اتنا خوف محسوس نہیں ہوا تھا، لیکن چونکہ مزید کوئی واقعہ پیش آتا نظر نہیں آ رہا تھا، فوری دہشت کا احساس آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگا اور ہوم ورک اور بیڈمنٹن میں غرقاب ہونے لگا تھا۔

سوفی البرٹو کے خطوط بار بار پڑھتی رہی شاید کوئی ایسا سراغ مل جائے جس سے ہلڈے کے معمے پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ ان خطوط کے دوبارہ مطالعے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسے کلاسیکی فلسفے کو ہضم کرنے کا کافی موقع مل گیا۔ اسے اب دیموکری توس اور سقراط یا افلاطون اور ارسطو کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔

25 مئی بروز جمعہ وہ اپنی امی کے گھر پہنچنے سے پہلے باورچی خانے میں ڈنر تیار کر رہی تھی۔ یہ ان کا جمعے کا باقاعدہ معاہدہ تھا۔ آج وہ مچھلی کا سوپ (soup)، مچھلی کے کوفتے (fish balls) اور گاجروں کا سالن بنا رہی تھی۔ سادہ اور غیر چٹ پٹا۔

باہر خاصی تیز ہوا چلنے لگی تھی - ہانڈی میں چمچہ پھیرتے پھیرتے اس کی توجہ دریچے کی طرف مبذول ہو گئی - برچ کے درخت مکئی کے پودوں کی طرح لہرا رہے تھے۔

اچانک کوئی چیز دریچے سے ٹکرائی - سوفی نے دوبارہ اس طرف دیکھا - اسے دریچے پر ایک کارڈ چسپاں نظر آیا۔

یہ پوسٹ کارڈ تھا - کھڑکی کے شیشے میں وہ اس پر درج پتا پڑھ سکتی تھی: "ہلڈے مولر کنیگ بتوسط سوفی امنڈسین۔"

اس کے دل میں بھی یہی خیال آیا تھا! اس نے کھڑکی کھولی اور کارڈ اٹھا لیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ کارڈ ہوا کے دوش پر اڑتا خود بخود یہاں پہنچ جائے؟" وہ سوچ رہی تھی۔

اس کارڈ پر بھی پندرہ جون کی تاریخ ثبت تھی - سوفی نے سٹوو سے ہانڈی اٹھائی اور خود باورچی خانے کی میز پر بیٹھ گئی - کارڈ پر تحریر تھا:

ڈیر ہلڈے، مجھے معلوم نہیں کہ جب تم یہ کارڈ پڑھ رہی ہو گی، تمہاری سالگرہ کا دن ابھی تک چل رہا ہو گا یا نہیں - ایک لحاظ سے تو مجھے یہی امید ہے کہ یہ چل رہا ہو گا یا اسے بیتے کوئی زیادہ دن نہیں گزرے ہوں گے - ایک دو ہفتے ہمیں جتنے طویل معلوم ہوتے ہیں، ضروری نہیں کہ سوفی کو بھی یہی محسوس ہوتا ہو - میں وسط گرما سے ایک روز پہلے گھر پہنچ جاؤں گا تاکہ، ہلڈے، ہم اکٹھے گلائیڈر میں بیٹھ کر گھنٹوں سمندر کا نظارہ کر سکیں - ہمیں کتنی ہی باتیں کرنا ہیں - پاپا کی طرف سے پیار جو بعض اوقات یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی باہمی ہزار سالہ کشمکش سے بہت پژمردہ ہو جاتا ہے - مجھے بار بار اپنے آپ کو یاد دلانا پڑتا ہے کہ ان تینوں مذاہب کا سلسلہ ابراہیم تک پہنچتا ہے - چنانچہ میرا خیال ہے کہ وہ ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں - ادھر یہاں ہابیل اور قابیل ابھی تک ایک دوسرے کو ہلاک کرنے میں مصروف ہیں۔

پس نوشت: سوفی کو سلام کہنا - بیچاری بچی! اسے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ سب چکر کیا ہے - شاید تمہیں معلوم

ہو؟

سوفی بالکل نڈھال ہو گئی اور اس نے اپنا سر میز پر نیوڑا دیا۔ وہ ایک بات وثوق سے کہہ سکتی تھی ـــــ اسے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ یہ سب چکر کیا ہے۔ شاید ہلڈے کو معلوم ہو۔

اگر ہلڈے کے باپ نے اس سے کہا ہے کہ وہ اس کا سلام سوفی کو پہنچا دے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنا سوفی ہلڈے کو جانتی ہے' اس سے کہیں زیادہ ہلڈے سوفی کے متعلق جانتی ہے۔ یہ سب کچھ اتنا گنجلگ تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے سوچنا ترک کیا اور دوبارہ ڈنر تیار کرنے لگی۔

لیکن سوچیں تھیں کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ پوسٹ کارڈ خود بخود کھڑکی کے ساتھ آ ٹکرائے' یہ ہوائی ڈاک کا کرشمہ تو نہیں ہو سکتا!

ابھی اس نے ہانڈی دوبارہ سٹوو پر رکھی ہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

کہیں یہ پاپا کا تو نہیں؟ اس کی کتنی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جائیں تاکہ ان تین ہفتوں کے دوران میں جو کچھ گزرا ہے' وہ انہیں اس کے متعلق سب کچھ بتا سکے۔ نہیں' نہیں' یہ پاپا نہیں ہو سکتے' شاید جوآنا یا امی ہو۔ سوفی نے تیزی سے لپک کر ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا۔

"سوفی امنڈسین۔" وہ ٹیلی فون پر بولی۔

"میں ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

سوفی کو تین باتوں کا یقین تھا: یہ آواز اس کے پاپا کی نہیں تھی' بہرحال یہ آواز کسی مرد کی تھی اور یہ آواز وہ پہلے کبھی سن چکی تھی۔

"کون؟"

"البرٹو۔"

"اف ف ف!"

سوفی کو کوئی الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ یہ آواز تو' جسے وہ اب پہچان چکی تھی' اسی ایکروپولس وڈیو والی تھی۔

"ٹھیک تو ہو؟"

"بالکل۔"

"اب تمہیں خطوط نہیں ملا کریں گے۔"

"لیکن میں نے تو آپ کو کوئی ہینڈ ک نہیں بھیجا تھا!"

"ہمیں بالمشافہ ملاقات کرنا ہوگی۔ معاملہ بہت گمبھیر ہوتا جارہا ہے اور فوری توجہ کا متقاضی ہے۔"

"کیوں؟"

"ہلڈے کا باپ ہمارے گرد گھیرا تنگ کرتا جارہا ہے۔"

"گھیرا تنگ کرتا جارہا ہے، کیسے؟"

"چاروں طرف سے، سوفی۔ اب ہمیں اکٹھے مل کر کام کرنا ہوگا۔"

"کیسے...؟"

"لیکن جب تک میں تمہیں قرون وسطیٰ کے متعلق نہ بتا لوں، تم کوئی مدد نہیں کرسکتیں۔ ہمیں نشاۃ ثانیہ اور سترھویں صدی کو بھی شامل کرنا ہوگا۔ بارکلے کلیدی شخصیت ہے..."

"یہ وہی شخص نہیں جس کی تصویر میجر کی کٹیا میں لٹک رہی ہے؟"

"بالکل وہی۔ ممکن ہے اصل جھگڑا اسی کے فلسفے کے بارے میں ہو۔"

"آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی جنگ ہو رہی ہو۔"

"میں اسے ارادوں کی جنگ کہوں گا۔ ہمیں ہلڈے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا ہوگی اور اس کے باپ کے لئے سینڈ گھر پہنچنے سے پہلے اسے اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔"

"شاید فلسفی تمہاری آنکھیں کھول دیں۔ کل آٹھ بجے صبح مجھے سینٹ میری کے گرجا میں ملو۔ مگر میری بچی، اکیلے آنا۔"

"اتنے سویرے؟"

ٹیلی فون کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو؟"

وہ تو ٹیلی فون بند کرگیا ہے، دھت تیری! سوفی سٹوو کی طرف بھاگی۔ مچھلی کا سوپ چھلکا ہی چاہتا تھا کہ وہ پہنچ گئی۔

سینٹ میری چرچ؟ یہ کہاں ہے؟ ارے، یہ تو پتھر کا قدیم گرجا ہے جو قرون

وسطیٰ میں تعمیر ہوا تھا ۔ اب یہ محض موسیقی کی محفلوں اور بعض خصوصی تقریبات کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ گرمیوں میں بعض اوقات اس کے دروازے سیاحوں کے لیے ضرور کھول دئے جاتے ہیں لیکن آدھی رات کے وقت تو یہ یقیناً بند ہو گا؟

جب اس کی امی گھر پہنچی ، سوفی لبنانی کارڈ ہلڈے اور البرٹو کی باقی اشیا کے پاس رکھ چکی تھی ۔ ڈنر کے بعد وہ جو آننا کے گھر چلی گئی ۔

"ہمیں بہت ہی خاص قسم کا اہتمام کرنا ہو گا ۔" جونہی اس کی سہیلی نے دروازہ کھولا ، اس نے کہا ۔ جب تک جو آننا نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند نہ کیا ، اس نے مزید کچھ نہ کہا ۔

"معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے ۔" سوفی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ۔

"جلدی کہو!"

"میں امی کو بتا رہی ہوں کہ میں آج رات یہیں قیام کروں گی ۔"

"یہ تو بڑا زبردست خیال ہے!"

"یہ تو میں صرف انہیں بتا رہی ہوں ۔ دراصل جانا مجھے کہیں اور ہے ، کچھ سمجھیں؟"

"یہ تو اچھا نہ ہوا ۔ لڑکے وڑکے کا چکر ہے؟"

"نہیں ۔ اس معاملے کا تعلق ہلڈے سے ہے ۔"

جو آننا کے منہ سے ہلکی سی سیٹی کی آواز نکل گئی ۔ سوفی اسے درشت نگاہوں سے دیکھنے لگی ۔

"میں آج شام یہاں آجاؤں گی ۔" اس نے کہا ۔ "لیکن کل سات بجے صبح مجھے یہاں سے چپکے سے کھسکنا ہے ۔ جب تک میں واپس نہیں آجاتی ، تمہیں میری عدم موجودگی کے متعلق کوئی نہ کوئی بہانہ بناتے رہنا ہو گا ۔"

"مگر تم جا کہاں رہی ہو؟ تم کر کیا رہی ہو؟"

"میں کچھ نہیں بتا سکتی ۔ میرے ہونٹ سلے ہوئے ہیں ۔"

گھر سے باہر سونا کبھی مسئلہ نہیں بنا تھا ۔ بلکہ معاملہ تقریباً اس کے برعکس تھا ۔ بعض اوقات تو سوفی کو محسوس ہونے لگتا کہ اس کی امی کو اکیلے گھر میں سونے میں زیادہ لطف آتا ہے ۔

"میرا خیال ہے کہ تم ناشتے پر تو گھر پہنچ ہی جاؤ گی؟" جب سوفی گھر سے چلی ،

اس کی امی نے صرف یہی پوچھا۔
"نہیں۔میں نہیں آسکوں گی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں کہاں ہوں گی۔"
اس نے یہ بات کیوں کہی؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ لیکن اتنا ظاہر تھا کہ یہ اس کے منصوبے کا کمزور پہلو تھا۔
سوفی جب کبھی گھر سے باہر سوتی تھی تب جو کچھ پیش آتا تھا، آج بھی وہی ہوا۔ وہ گئی رات تک باتیں کرتی رہیں۔ البتہ اس مرتبہ فرق یہ پڑا کہ جب تقریباً دو بجے وہ سونے کے لیے بستروں پر لیٹیں، سوفی نے پونے سات کا الارم لگا دیا۔
پانچ گھنٹے بعد جب سوفی نے الارم بند کیا، جو آننا کی ذرا کی ذرا آنکھ کھلی۔
"اپنا خیال رکھنا۔" وہ بڑبڑائی۔
پھر سوفی اپنا راستہ ماپنے لگی۔ سینٹ میری چرچ قصبے کے قدیمی حصے کے مضافات میں واقع تھا۔ یہ جو آننا کے گھر سے کئی میل دور تھا۔ سوفی نے اگرچہ صرف چند گھنٹوں کی جھپکی لی تھی، اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں اور وہ مزے مزے جا رہی تھی۔
جب وہ قدیم سنگی گرجے کے صدر دروازے کے قریب پہنچی، تقریباً آٹھ بج چکے تھے۔ سوفی نے بھاری بھرکم دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ یہ جھٹ پٹ کھل گیا۔ تالا کھلا تھا!
گرجا جتنا قدیم تھا" اس کا اندرون بھی اتنا ہی خاموش اور ویران تھا۔ دریچوں کے رنگ برنگے شیشوں میں سے نیلگوں روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور فضا میں معلق کثیر مہین ذرات کو نمایاں کر رہی تھی۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گرجے کے اندر گرد دبیز کرنوں کی صورت میں یہاں وہاں جمع ہو گئی ہے۔ سوفی گرجے کے عین وسط میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی اور ٹکٹکی باندھ کر الطار (altar) پر رکھی صلیب کو دیکھنے لگی جس پر مدھم رنگوں میں یسوع کی تصویر کندہ تھی۔
چند منٹ گزر گئے۔ اچانک ارگن (باجا) جھنجھنا اٹھا۔ سوفی میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ نگاہیں اٹھا کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لے سکتی۔ باجے پر جو دھن بج رہی تھی، قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ حمد بہت قدیم ہے 'شاید قرونِ وسطیٰ کی ہے۔
حمد ختم ہو گئی اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ تب اسے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کیا اسے اپنے ارد گرد دیکھنا چاہیے؟ نہیں، صلیب پر نگاہیں

گاڑے رکھنا ہی بہتر ہے۔

قدم درمیانی راستے میں سے اس سے آگے نکل گئے اور اسے راہبوں کے براؤن چغے میں ملبوس کسی شخص کی شکل نظر آئی۔ سوفی حلفیہ کہہ سکتی تھی کہ یہ بالکل قرون وسطیٰ کا کوئی راہب ہے۔

وہ گھبرائی ہوئی ضرور تھی لیکن اتنی بھی خوف زدہ نہیں تھی کہ اس کے ہوش وحواس بالکل ہی جواب دے جاتے۔ راہب الطار کے سامنے نیم دائرہ بناتے مڑا اور منبر پر چڑھ گیا۔ وہ منبر کے ایک کنارے پر جھکا' اس نے سوفی پر نگاہ ڈالی اور وہ لاطینی میں اس سے مخاطب ہوا۔

" Gloria Patri, et Filio , et Spiritui Sancto. Sicut erat in paincipio, et nunc, et in saecula saeculorum.Amen."

"احمق! عقل کی بات کرو۔" سوفی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اس کی آواز قدیم سنگی گرجے کے چاروں طرف گونج اٹھی۔

اگرچہ سوفی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ راہب لازماً البرٹو کنوکس ہوگا تاہم اسے ندامت ہونے لگی کہ وہ اس مقدس عبادت گاہ میں خواہ مخواہ چلا اٹھی تھی۔ مگر وہ کرتی بھی کیا' اس پر گھبراہٹ سوار تھی اور جب آدمی گھبرا رہا ہو' پھر تمام معاشرتی یا مذہبی بندھنوں (taboos) کو توڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

"شش!" البرٹو نے یوں اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا جیسے وہ پادریوں کی طرح عبادت گزاروں کو بیٹھنے کا اشارہ کر رہا ہو۔

"قرون وسطیٰ کا آغاز چار بجے ہوا تھا۔" اس نے کہا۔

"قرون وسطیٰ کا آغاز صبح چار بجے ہوا تھا؟" سوفی کے منہ سے نکلا۔ سوفی کو اپنا سوال احمقانہ ضرور محسوس ہوا لیکن اب اس پر گھبراہٹ طاری نہیں تھی۔

"ہاں' تقریباً چار بجے۔ پھر پانچ' پھر چھ اور پھر سات بج گئے۔ تاہم معلوم یہی ہوتا تھا کہ وقت تھم گیا ہے۔ پھر آٹھ بج گئے' نو بج گئے اور دس بج گئے۔ لیکن قرون وسطیٰ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ سمجھ گئی ہو نا؟ تم شاید سوچ رہی ہو کہ دس بجے تو سورج خاصا بلند ہو چکا ہوتا ہے' آدمی جاگ جاتا ہے اور نیا دن شروع کر دیتا ہے۔ لیکن تم کیا سوچ رہی ہو' میں سمجھ گیا ہوں۔ لیکن ابھی اتوار ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اتواروں کا طویل سلسلہ ہے جو دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے۔ لو' اب گیارہ بج گئے' نہیں' بارہ

ہو گئے اور پھر سہ پہر کا ایک ۔ اس عہد کو ہم ہائی گوتھک (High Gothic) کہتے ہیں جب یورپ کے عظیم گرجاؤں کی تعمیر عمل میں آئی تھی ۔ پھر تقریباً سہ پہر کے دو بجے ، کسی مرغ نے بانگ دی ـــــ اور غیر مختتم قرون وسطیٰ آہستہ آہستہ ناپید ہونے لگا ۔"

"گویا قرون وسطیٰ دس گھنٹے جاری رہا ۔" سوفی نے کہا ۔ البرٹو نے راہب کی براؤن کلاہ میں سے سر آگے جھکایا اور عبادت گزاروں کی جماعت پر ، جو چودہ سالہ لڑکی پر مشتمل تھی ، نظر ڈالی ۔

"ہاں ، اگر ایک گھنٹہ سو سال کے برابر ہو ۔ ہم جھوٹ موٹ فرض کر لیتے ہیں کہ یسوع بوقت نیم شب تولد ہوئے تھے ۔ پال نے اپنے تبلیغی دوروں کا آغاز ڈیڑھ بجے صبح سے ذرا قبل کیا اور وہ چوتھائی گھنٹہ بعد روم میں انتقال کر گئے ۔ تقریباً تین بجے صبح عیسائی مسلک پر کم و بیش پابندی لگ گئی لیکن 313ء میں یہ رومی سلطنت کا مسلمہ مذہب بن چکا تھا ۔ یہ امپراطور قسطنطین (1) (Constantine) کا عہد حکومت تھا ۔ تاہم مقدس امپراطور کا مسح کئی سال بعد اس کے بستر مرگ پر ہوا ۔ 380 میں ساری رومی سلطنت میں عیسائیت سرکاری مذہب قرار دے دی گئی ۔"

"رومی سلطنت کا سقوط نہیں ہو گیا تھا؟"

"اس کا انہدام شروع ہو گیا تھا ۔ ہم تاریخ ثقافت کی ایک عظیم ترین تبدیلی کے سامنے کھڑے ہیں ۔ روم کو چوتھی صدی میں دوہرے خطرے کا سامنا تھا ۔ شمال کی جانب سے وحشی اپنا دباؤ بڑھا رہے تھے اور اندرون خانہ ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا ۔ 330ء میں عظیم قسطنطین نے اپنا دارالحکومت روم سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا ۔ اس نے خود ہی اس شہر کی بنیاد بحیرہ اسود کے دہانے پر رکھی تھی ۔ بے شمار لوگوں کا خیال رہا ہے کہ نیا شہر 'روم ثانی' تھا ۔ 395ء میں رومی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی ـــــ ان میں ایک کا نام مغربی سلطنت تھا اور اس کا دارالحکومت روم تھا ۔ دوسری مشرقی سلطنت تھی اور اس نے قسطنطنیہ کے نئے شہر کو اپنا دارالحکومت بنائے رکھا ۔ 410ء میں روم کو وحشیوں نے تاخت و تاراج کر دیا اور 476ء میں ساری مغربی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا ۔ مشرقی سلطنت 1453ء تک ایک ریاست کی حیثیت سے قائم رہی لیکن جب ترکوں نے قسطنطنیہ تسخیر کر لیا ، اس کا وجود بھی مٹ گیا ۔"

"اور قسطنطنیہ کا نام استنبول میں تبدیل ہو گیا؟"

"ہاں ۔ استنبول اس کا تازہ ترین نام ہے ۔ ایک اور تاریخ ، جو ہمیں یاد رکھنا

چاہیے، 529ء کی ہے۔ یہ وہ سال ہے جب کلیسا نے ایتھنز میں افلاطون کی اکادمی بند کر دی۔ عیسائی راہبوں نے جو عظیم جماعتیں (orders) تشکیل کیں، ان میں سب سے پہلی بینی ڈکٹی جماعت (2) (Benedictine order) اسی سال وجود میں آئی۔ چنانچہ 529 کا سال اس طریقے کی علامت بن گیا جو عیسائی کلیسا نے یونانی فلسفے پر ڈھکن لگانے کے لیے استعمال کیا۔ تب سے خانقاہوں کو تعلیم، غور و تفکر اور مراقبے پر اجارہ داری حاصل ہو گئی۔ گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کرتی ساڑھے پانچ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔۔۔"

سوفی سمجھ چکی تھی کہ ان اوقات سے البرٹو کا مطلب کیا ہے۔ بوقت نیم شب سوئی صفر پر تھی۔ جب یہ ایک پر پہنچی تو یسوع کو پیدا ہوئے سو سال، چھ پر چھ سو سال اور چودہ (یا دن کے دو بجے) پر چودہ سو سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔

البرٹو کا سلسلہ کلام جاری رہا: "دراصل قرون وسطیٰ سے مراد دوسرے دو عہدوں کا درمیانی زمانہ ہے۔ یہ ترکیب نشاۃ ثانیہ کے دور میں وضع ہوئی تھی۔ اس زمانے کو قرون ظلمت بھی کہا جاتا تھا اور اسے غیر مختتم ہزار سالہ شب بھی تصور کیا جاتا تھا جو یورپ پر عہد عتیق اور نشاۃ ثانیہ کی درمیانی مدت میں چھائی رہی۔ آج کل 'قرون وسطیٰ' کی ترکیب منفی معنوں میں استعمال کی جاتی ہے اور ضرورت سے زیادہ تحکمانہ اور بے لچک رویے یا چیز پر چسپاں کر دی جاتی ہے۔ لیکن اب متعدد مورخین اس رائے کا اظہار کرنے لگے ہیں کہ ہزار سال پر محیط قرون وسطیٰ 'بیج کے پھوٹنے اور پودے کے بڑھنے' کا زمانہ تھا۔ مثلاً سکولوں کا نظام اسی زمانے میں شروع ہوا۔ کانونٹ سکول (خانقاہوں سے ملحق سکول جس کا تدریسی عملہ اب راہبات پر مشتمل ہوتا ہے) تو ابتدا ہی میں قائم ہونا شروع ہو گئے تھے اور بارھویں صدی میں کیتھڈرل سکولوں (گرجاؤں سے ملحق سکولوں) کا آغاز ہو گیا۔ اولین یونیورسٹیاں سن 1200 کے لگ بھگ قائم ہوئیں اور ان میں جن مضامین کی تدریس کی جاتی تھی ان کی شعبوں یا فیکلٹیوں میں تقسیم بالکل اسی طرح عمل میں آئی تھی جیسے کہ آجکل دیکھنے میں آتی ہے۔"

"ہزار سال واقعی طویل مدت ہے۔"

"ہاں۔ لیکن عیسائیت کو عوام تک پہنچنے میں وقت لگا۔ مزید برآں قرون وسطیٰ کے دوران میں مختلف قومی ریاستیں (nation - states) وجود میں آنے لگیں جن کے اپنے شہر اور شہری، لوک گیت اور لوک داستانیں تھیں۔ اگر قرون وسطیٰ نہ ہوتا، پریوں کی کہانیاں اور لوک گیت کیسے وجود میں آتے؟ بلکہ خود یورپ بھی کیا ہوتا؟ شاید کوئی

رومی صوبہ ۔ لیکن انگلینڈ ' فرانس یا جرمنی جیسے ناموں میں ہمیں جو کھنک سنائی دیتی ہے وہ اسی بحر بے کراں کی دین ہے جسے ہم قرون وسطیٰ کہتے ہیں ۔ ان گہرے پانیوں میں ادھر ادھر چمکتی دمکتی مچھلیاں تیرتی پھر رہی ہیں اگرچہ یہ ہمیں ہمیشہ دکھائی نہیں دیتیں ۔ سنوری سٹرلوسن قرون وسطیٰ ہی کا آدمی تھا ۔ یہی حال سینٹ اولیف (3) اور شارلیمان (4) کا تھا ۔ رومیو اور جولیٹ (5) ' جون آف آرک (6) ' آئی ون ہو (7) ' ہملین کے پائیڈ پائپر (8) ' بے شمار شہزور حکمرانوں اور جلیل القدر بادشاہوں ' خواتین کی آن پر مرمٹنے والے نائٹوں اور پری پیکر دوشیزاؤں ' رنگا رنگ شیشوں کے دریچے بنانے والے گمنام کاریگروں اور اختراع پسند ارگن سازوں کا تعلق بھی اسی دور سے ہے ۔ اور میں نے (رومن کیتھولک مسلک کے پیروکار) راہبوں ' صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والوں یا جادوگرنیوں کا تو ذکر ہی نہیں کیا ۔"

"اور آپ نے کلیسا والوں کے کردار پر بھی تو کوئی روشنی نہیں ڈالی ۔"

"تم نے ٹھیک کہا ۔ ویسے چلتے چلتے میں اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ناروے میں عیسائیت گیارھویں صدی تک نہیں آئی تھی ۔ یہ کہنا تو مبالغہ آرائی ہوگا کہ نارڈک ممالک ایک ہی ہلّے میں عیسائیت کے حلقہ بگوش ہوگئے تھے ۔ بالائی سطح پر عیسائیت کا سکہ رواں ہوگیا تھا لیکن زیر سطح قدیم بت پرستانہ عقاید اپنی خو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے اور بڑی استقامت سے اپنی جگہ ڈٹے رہے ' اور لا محالہ ان میں سے متعدد کو عیسائیت میں ضم کرلیا گیا ۔ مثلاً سکنڈے نیویا کے ممالک میں آج بھی کرسمس جس انداز سے منائی جاتی ہے ' اس میں عیسائی اور قدیم نورس رسوم کا امتزاج نظر آتا ہے ۔ اور یہاں پرانی کہاوت کا اطلاق ہوتا ہے کہ شادی شدہ جوڑے بتدریج ایک دوسرے کے مشابہ ہوجاتے ہیں ۔ کرسمس کے موسم میں جو مختلف شکلوں (انسانوں ' خنزیروں کے بچوں وغیرہ کی) کے بسکٹ بنائے جاتے ہیں ' ان کی صورتیں بتدریج مشرق کے تین عقل مند انسانوں (9) اور بیت اللحم کی کھرلی (10) سے مشابہ ہونا لگتی ہیں ۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ عیسائیت آہستہ آہستہ غالب فلسفہ حیات بن گئی ۔ چنانچہ آج جب ہم قرون وسطیٰ کا نام لیتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی ثقافت نے یورپ میں مختلف الخیال قوموں میں یک جائیت اور اتحاد قائم کرنے میں مدد دی ۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سراپا ظلمت کا زمانہ نہیں تھا ۔"

"ہاں ۔ لیکن سن 400 ء کے بعد کی ابتدائی صدیاں واقعی ثقافتی انحطاط کی

علامت تھیں ۔ رومی عہد اعلیٰ ثقافت کا آئینہ دار تھا ۔ اس میں بڑے بڑے شہر تھے جن کا طرہ امتیاز محض خوبصورت عمارتیں ہی نہیں بلکہ نکاسئ آب کے انتظامات، پبلک حمام اور کتب خانے بھی تھے ۔ قرون وسطیٰ کی ابتدائی صدیوں کے دوران میں یہ ساری ثقافت ملیامیٹ ہوگئی ۔ یہی حال تجارت اور معیشت کا ہوا ۔ اس دور میں لوگ ایک بار پھر جنس کے بدلے جنس کی صورت میں ایک دوسرے سے لین دین کرنے لگے ۔ معیشت کا نمایاں وصف جاگیرداری کا نظام تھا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی ملکیت گنے چنے امرا اور نوابوں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی، عام آدمیوں کی حالت غلاموں سے بڑھ کر نہیں تھی اور انہیں دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے جان توڑ مشقت کرنا پڑتی تھی ۔ ابتدائی چند صدیوں کے دوران میں آبادی میں بھی تیزی سے تخفیف ہونے لگی ۔ عہد عتیق میں روم کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ نفوس پر مشتمل تھی لیکن سن چھ سو عیسوی کے قریب قدیمی رومی دارالسلطنت کی آبادی گھٹتے گھٹتے محض چالیس ہزار افراد تک محدود ہوگئی جو سابقہ آبادی کا عشر عشیر بھی نہیں کہی جاسکتی ۔ چنانچہ شاہانہ جاہ وجلال کے حامل پرانے شہر کی پرشکوہ عمارتوں اور یادگاروں میں گھومنے پھرنے یا آوارہ گردی کرنے کے لیے انسانوں کی محض حقیر تعداد رہ گئی ۔ جب انہیں عمارتی سامان کی ضرورت پیش آتی، وہ انہیں کھنڈرات سے بکثرت دستیاب ہوجاتا تھا ۔ چنانچہ فطری طور پر آج کے ماہرین آثار قدیمہ کو یہ سب کچھ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے اور وہ خواہش کرنے لگتے ہیں کہ کاش ان لوگوں نے قدیم یادگاروں کا یوں ستیاناس نہ مارا ہوتا ۔"

"جب واقعہ پیش آچکا ہے، عقل بگھارنا آسان ہوجاتا ہے ۔"

"سیاسی نقطۂ نظر سے رومی عہد پہلے ہی چوتھی صدی کے اختتام تک ختم ہوچکا تھا ۔ تاہم روم کا اسقف (بشپ) رومن کیتھولک چرچ کا سربراہ اعلیٰ بن گیا ۔ اسے 'پوپ' کا ـــــ لاطینی زبان میں 'پاپا' (papa)، جس کا مطلب وہی ہے جو اس لفظ سے مترشح ہوتا ہے ـــــ خطاب دے دیا گیا اور اسے بتدریج روئے زمین پر یسوع کا نائب تصور کیا جانے لگا ۔ چنانچہ قرون وسطیٰ کے بیشتر عرصے کے دوران میں روم کو عیسائیت کے صدر مقام کا درجہ حاصل رہا ۔ لیکن جوں جوں نئی قومی ریاستوں کے بادشاہ اور بشپ طاقتور سے طاقتور ہوتے چلے گئے، ان میں سے چند ایک میں اتنی جرات آگئی کہ وہ کلیسا کی قوت کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہوگئے ۔"

"آپ نے کہا تھا کہ کلیسا نے ایتھنز میں افلاطون کی اکادمی بند کردی تھی ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام یونانی فلسفیوں کو طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا؟"

"مکمل طور پر تو نہیں۔ ارسطو اور افلاطون کی بعض تحریروں سے لوگ واقف تھے۔ مگر قدیم رومی سلطنت تین مختلف ثقافتوں میں بٹ گئی تھی۔ مغربی یورپ میں ہمارے پاس جو عیسائی ثقافت تھی اس پر لاطینی ثقافت کی مہر ثبت تھی۔ اس کا صدر مقام روم تھا۔ مشرقی یورپ میں ہمارے پاس جو عیسائی ثقافت تھی اس پر یونانی ثقافت کی مہر ثبت تھی۔ اس کا صدر مقام قسطنطنیہ تھا۔ اس شہر کو اس کے یونانی نام بازنطین (Byzantium) سے پکارا جانے لگا۔ یوں ہم رومی کیتھولک قرون وسطیٰ کے مقابلے میں بازنطینی قرون وسطیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ بھی کسی زمانے میں رومی سلطنت کا حصہ تھے۔ تاہم ان علاقوں میں قرون وسطیٰ کے دوران میں مسلم ثقافت کو فروغ حاصل ہوا اور یہاں عربی زبان بولی جانے لگی۔ 632ء میں (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتقال کے بعد مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ دونوں ہی اسلام کے زیر نگیں آ گئے تھے اور کچھ عرصے بعد ہسپانیہ بھی اسلامی ثقافت کا حصہ بن گیا۔ مسلمانوں نے مکہ (معظمہ)، مدینہ (منورہ)، یروشلم (بیت المقدس) اور بغداد کو اپنے مقدس شہر قرار دے دیا۔ ثقافتی تاریخ کے نقطہ نظر سے یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ عربوں نے یونانی ثقافت کے حامل سکندریہ کے قدیم شہر کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ چنانچہ قدیم یونانی سائنس کی وراثت کا بیشتر حصہ عربوں کو منتقل ہو گیا۔ قرون وسطیٰ کے سارے عرصے کے دوران میں عربوں کو ریاضی، کیمیا، فلکیات اور طب جیسے علوم میں بالا دستی حاصل رہی۔ آج بھی ہم عربی اعداد ہی استعمال کرتے ہیں۔ متعدد شعبوں میں عربی ثقافت عیسائی ثقافت سے کہیں برتر تھی۔"

"میں جاننا چاہتی تھی کہ یونانی فلسفے پر کیا بیتی؟"

"کیا تم کسی ایسے دریا کا تصور کر سکتی ہو جو تین مختلف ندیوں میں منقسم ہو جاتا ہے لیکن یہ تینوں ندیاں بہتے بہتے دوبارہ آپس میں مل جاتی ہیں اور عظیم دریا کا روپ اختیار کر لیتی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"پھر تم یہ بھی سمجھ سکتی ہو کہ یونانی / رومی ثقافت کس طرح منقسم ہوئی لیکن تینوں ثقافتوں کی ـــــ مغرب میں رومن کیتھولک، مشرق میں بازنطینی اور جنوب میں عربی ـــــ یلغار سے بچ نکلی۔ اگرچہ اس مسئلے کو اس حد تک سہل بنا کر

پیش کر دیا جاتا ہے کہ اصل مفہوم غارت ہو جاتا ہے ' پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نو افلاطونیت مغرب کے ' افلاطون مشرق کے اور ارسطو جنوب میں عربوں کے حصے میں آیا۔ لیکن ان تینوں ندیوں میں ان سب کی چند مشترک چیزیں بھی شامل تھیں ۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ تینوں ندیاں شمالی اطالیہ میں آپس میں مل گئیں ۔ عربی اثرات ہسپانیہ کے عربوں سے اور یونانی اثرات یونان اور بازنطینی سلطنت سے آئے ۔ اب ہمیں نشاۃ ثانیہ یا ثقافت عتیق کے ' احیائے نو ' کا آغاز نظر آنے لگتا ہے ۔ ایک معنوں میں ثقافت عتیق قرون ظلمت سے بچ نکلی ۔"

"سمجھی ۔"

"لیکن ہمیں واقعات کے دھارے کی پیش قیاسی نہیں کرنا چاہیے ۔ ہمیں پہلے قرون وسطیٰ کے فلسفے کے بارے میں کچھ گفتگو کرنا ہوگی ۔ میں اب یہاں منبر پر بیٹھ کر مزید گفتگو نہیں کروں گا ۔ میں نیچے آرہا ہوں ۔"

چونکہ سوفی کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی ' اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں ۔ جب اس نے سینٹ میری چرچ کے منبر سے عجیب الوضع راہب کو نیچے اترتے دیکھا ' اسے محسوس ہوا جیسے وہ خواب کی حالت میں ہو ۔

البرٹو اطار کے جنگلے کی طرف بڑھا اور اس نے اطار اور اس پر رکھی قدیم صلیب پر ' جس پر مسیح کی تصویر کندہ تھی ' نظر ڈالی ۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا سوفی کی جانب چلنے لگا اور وہ گرجے میں عبادت کرنے والوں کے خاندانی بنچ پر اس کے قریب بیٹھ گیا ۔

اس کے اتنا قریب بیٹھنا عجیب و غریب تجربہ تھا ۔ سوفی کو اس کی کلاہ کے نیچے دو عمیق بھوری آنکھیں نظر آئیں ۔ یہ آنکھیں ایک ادھیڑ عمر شخص کی تھیں اور اس شخص کے بال سیاہ اور اس کی داڑھی چھوٹی اور نوکیلی تھی ۔ "تم کون ہو ؟" وہ سوچ رہی تھی ۔ "تم نے میری زندگی کو کیوں زیر و زبر کر دیا ہے ؟"

"ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے زیادہ اچھی طرح واقف ہو جائیں گے ۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ اس کے خیالات بھانپ گیا ہو ۔

جب وہ وہاں اکٹھے بیٹھے تھے اور رنگ برنگے شیشوں میں سے چھن چھن کر جو روشنی آرہی تھی ' وہ شفاف سے شفاف ہونے لگی تھی ' البرٹو کوئی قرون وسطیٰ کے بارے میں گفتگو کرنے لگا ۔

"قرونِ وسطیٰ کے فلسفیوں نے تقریباً کوئی تحقیق کئے بنا اور بلا حیل و حجت تصور کرلیا کہ عیسائیت برحق ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا: کیا ہمیں عیسائی مکاشفے (revelation) پر سیدھے سادے انداز سے ایمان لے آنا چاہیے یا ہمیں نصرانی صداقتوں کا مطالعہ عقل کی مدد سے کرنا چاہیے؟ پھر ایک طرف جو کچھ بائبل کہتی ہے اور دوسری طرف جو کچھ یونانی فلسفی کہتے ہیں، ان کے مابین تعلق کیا ہے؟ کیا انجیل اور عقل کے مابین کوئی تضاد ہے اور یا عقیدہ اور علم آپس میں شیر و شکر ہو سکتے ہیں؟ قرونِ وسطیٰ کا تقریباً سارے کا سارا فلسفہ اسی ایک سوال کے گرد گھومتا تھا۔"

سوفی نے بے صبری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ یہ سب کچھ اپنی مذہبیت کی کلاس میں پڑھ چکی تھی۔

"اب ہم دیکھیں گے کہ قرونِ وسطیٰ کے دو سربرآوردہ ترین فلسفی اس مسئلے سے کس طرح عہدہ برآ ہوئے، اور مناسب یہ ہے کہ ہم آغاز سینٹ آگسٹین سے کریں جو 354ء سے 430ء تک زندہ رہا۔ اس ایک شخص کی زندگی سے ہم اس حقیقی تبدیلی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو عہدِ عتیق سے ابتدائی قرونِ وسطیٰ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ آگسٹین شمالی افریقہ کے ایک چھوٹے سے قصبے تاگاسطے (Tagaste) میں پیدا ہوا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ بغرضِ تعلیم (تیونس کے قدیم شہر) کارتھیج چلا گیا۔ بعد ازاں اس نے روم اور میلان کا سفر اختیار کیا۔ تاہم وہ جلد ہی واپس آ گیا اور اس نے اپنی زندگی کے باقی ایام کارتھیج سے چند میل دور ایک قصبے Hippo میں گزارے۔ اس ضمن میں یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ آگسٹین پیدائشی عیسائی نہیں تھا اور اس نے عیسائیت اختیار کرنے سے قبل مختلف مذہبوں اور فلسفوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔"

"آپ ان مذہبوں اور فلسفوں کی چند مثالیں دے سکتے ہیں؟"

"وہ کچھ عرصہ مانویت (11) یا مناکیت کا پیروکار (Manichaean) رہا۔ مانویت مذہبی فرقہ تھا جس میں متاخر عہدِ عتیق کے انتہائی نمایاں اوصاف پائے جاتے تھے۔ اس فرقے کے پیروکاروں کا عقیدہ نیم مذہبی اور نیم فلسفیانہ تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ دنیا خیر اور شر، نور اور ظلمت، روح (spirit) اور مادے (matter) کی ثنویت (daulism) پر مشتمل ہے۔ اپنی روح (spirit) کی مدد سے انسان مادے کی دنیا سے اوپر اٹھ سکتا ہے اور یوں اپنی آتما (روح یا soul) کی نجات کی تیاری کر سکتا ہے۔ لیکن خیر و شر کے مابین یہ بین تفریق نوجوان آگسٹین کو ذہنی سکون نہ دے سکی۔ وہ سرتاپا اس چیز میں، جسے ہم 'شر کا

مسئلہ ' کہنا پسند کرتے ہیں ' مستغرق تھا۔ اس مسئلے سے ہماری مراد یہ سوال ہے کہ شر (یا بدی) کہاں سے آتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ رواقی فلسفے کے زیر اثر رہا اور رواقیوں کے مطابق خیر و شر کے مابین کوئی بین خط امتیاز نہیں کھینچا جاسکتا۔ تاہم آگسٹین کا زیادہ تر جھکاؤ عہد عتیق کے اہم فلسفے نو افلاطونیت کی طرف تھا۔ یہاں اس کا ٹاکرا اس تصور سے ہوا کہ زندگی (existence) کی تمام صورتیں فطرت کے اعتبار سے الوہی (divine) ہیں۔"

"چنانچہ وہ نو افلاطونی بشپ بن گیا۔"

"ہاں ' تم یہ کہہ سکتی ہو۔ وہ عیسائی تو بن گیا لیکن اس کی عیسائیت زیادہ تر افلاطونی تصورات سے متاثر ہے۔ چنانچہ ' سوفی ' تمہیں یہ بات پلے باندھنا ہوگی کہ جونہی ہم عیسوی قرون وسطیٰ میں داخل ہوتے ہیں ' ہمیں یونانی فلسفے سے رسا تڑانے کا کوئی ڈرامائی عمل نظر نہیں آتا۔ یونانی فلسفے کا بیشتر حصہ سینٹ آگسٹین جیسے مذہبی رہنماؤں کے توسط سے نئے عہد تک پہنچا دیا گیا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ سینٹ آگسٹین نیم عیسائی اور نیم نو افلاطونی تھا۔"

"اگرچہ اسے عیسائیت اور افلاطونی فلسفے کے مابین کوئی حقیقی تضاد نظر نہیں آتا تھا وہ اپنے آپ کو سو فیصد عیسائی سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک افلاطونیت اور عیسائی عقیدے کے مابین مشابہت اتنی واضح تھی کہ وہ سمجھنے لگا کہ افلاطون لازماً پرانے عہد نامے سے واقف ہوگا۔ تاہم یہ بات انتہائی غیر احتمالی معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ ہمیں یوں کہنا چاہیے کہ سینٹ آگسٹین نے افلاطون کو 'عیسائی' بنا لیا تھا۔"

"چنانچہ جب وہ عیسائیت پر ایمان لے آیا تو اس نے ہر اس چیز سے قطع تعلق نہیں کیا جو فلسفے سے کوئی علاقہ رکھتی تھی؟"

"نہیں۔ تاہم اس نے اس طرف توجہ دلائی کہ عقل محض چند حدود کے اندر ہی آپ کی مذہبی مسائل تک رہنمائی کرسکتی ہے ' وہ ان سے آگے نہیں جاسکتی۔ عیسائیت الوہی راز ہے جس کا ادراک ہم صرف ایمان کے ذریعے کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم عیسائیت پر ایمان لے آئیں ' خداوند ہماری روح (soul) کو منور کردے گا تاکہ ہمیں خداوند کے متعلق ایک قسم کے مافوق الفطرت علم کا تجربہ ہوسکے۔ سینٹ آگسٹین اپنے باطن میں محسوس کرتا تھا کہ فلسفہ ایک خاص حد تک ہی جاسکتا ہے۔ جب تک اس نے عیسائیت قبول نہیں کی تھی اسے کبھی روحانی سکون میسر نہیں آیا تھا۔ جب تک ' ہمارا قلب تجھ (خدا) پر نہیں ٹکتا وہ پرسکون نہیں ہوپاتا۔ 'اس نے لکھا تھا۔"

"میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ افلاطون کے خیالات کا عیسائیت کے ساتھ کیا میل ہو سکتا ہے؟" سوفی نے اعتراض کیا۔ ابدی امثال (ideas) کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"خیر، سینٹ آگسٹین یقیناً یہ دعویٰ کرتا ہے کہ خدا نے دنیا عدم (void) سے تخلیق کی ہے اور اس کا یہ دعویٰ وہی ہے جس کا تصور انجیل دیتی ہے۔ یونانی ترجیح یہ تھی کہ دنیا ہمیشہ سے موجود چلی آ رہی ہے۔ لیکن سینٹ آگسٹین کا عقیدہ تھا کہ خدا کے دنیا تخلیق کرنے سے قبل 'امثال' الوہی ذہن میں موجود تھے۔ چنانچہ اس نے افلاطونی امثال خدا میں ڈھونڈ لیے اور اس طریقے سے اس نے افلاطون کے ابدی امثال کے نظریے کا تحفظ کر دیا۔"

"بڑی استادی کی بات معلوم ہوتی ہے۔"

"لیکن اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ نہ صرف سینٹ آگسٹین۔ نے بلکہ متعدد دیگر آبائے کلیسا نے بھی یونانی اور یہودی تصورات میں یگانگت پیدا کرنے کے لیے کس طرح زمین آسمان ایک کر دیے۔ ایک لحاظ سے ان کا تعلق دو ثقافتوں سے تھا۔ آگسٹین اپنے شر کے متعلق نقطہ نظر میں نوافلاطونیت کی طرف مائل تھا۔ پلوتی نوس کی طرح اس کا بھی عقیدہ تھا کہ شر 'خدا کی عدم موجودگی' ہے۔ شر کا اپنا کوئی آزادانہ وجود نہیں، یہ وہ چیز ہے جو موجود نہیں (is not) کیونکہ خدا نے جو کچھ تخلیق کیا وہ درحقیقت محض خیر ہے۔ آگسٹین کا ایمان تھا کہ شر انسان کی نافرمانی کا ثمر ہے۔ یا اس کے اپنے الفاظ میں 'ارادہ خیر خدائی فعل ہے' ارادہ شر خدائی فعل سے روگردانی ہے۔'"

" کیا اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ انسان میں الوہی روح (divine sonl) موجود ہوتی ہے؟"

"ہاں اور نہیں۔ سینٹ آگسٹین کا دعویٰ تھا کہ انسان اور خدا کے مابین ناقابل عبور خلیج حائل ہے۔ اس معاملے میں وہ سختی سے انجیلی نقطہ نظر کا حامی ہے اور وہ پلوتی نوس کا یہ دعویٰ مسترد کر دیتا ہے کہ ہر چیز احد (one) ہے۔ تاہم وہ زور دے کر کہتا ہے کہ انسان روحانی مخلوق ہے۔ اس کا ایک مادی جسم ہے ـــــ اس جسم کا تعلق طبعی دنیا سے ہے جس کا 'کیڑے مکوڑے اور زنگ حلیہ بگاڑ دیتے ہیں' ـــــ لیکن اس کی ایک روح (soul) بھی ہے جو خدا کا ادراک کر سکتی ہے۔"

"جب ہم مر جاتے ہیں تب روح کا کیا بنتا ہے؟"

"سینٹ آگسٹین کے مطابق ہبوط آدم کے بعد تمام انسانی نسل راہ راست سے بھٹک گئی تھی، پھر بھی خدا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بعض خاص لوگوں کو ابدی عذاب یا جہنم سے بچالے گا۔"

"اگر یہ بات ہے تو خدا کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ سب کو بچالے گا۔"

"جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے سینٹ آگسٹین اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کو خدا پر تنقید کرنے کا کوئی حق حاصل ہے۔ یہاں وہ رومیوں کے نام سینٹ پال کے مکتوب کا حوالہ دیتا ہے: اے انسان بھلا تو کون ہے جو خدا کے سامنے جواب دیتا ہے؟ کیا بنی ہوئی چیز بنانے والے سے کہہ سکتی ہے کہ تو نے مجھے کیوں ایسا بنایا؟ کیا کمہار کو مٹی پر اختیار نہیں کہ ایک ہی لوندے (lump) میں سے ایک برتن عزت کے لیے بنائے اور دوسرا بےعزتی کے لیے؟" (رومیوں کے نام پولس کا خط۔ باب 9، فقرات نمبر 20 تا 22۔ ترجمہ اردو بائبل۔)

"چنانچہ خدا اپنے آسمان پر بیٹھا لوگوں کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے؟ اور جونہی اس کا اپنی کسی مخلوق سے دل بھر جاتا ہے وہ اسے محض اٹھا کر ایک طرف پھینک دیتا ہے؟"

"سینٹ آگسٹین کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کوئی شخص بھی خدا کی بخشش کا مستحق نہیں۔ پھر بھی خدا نے بعض لوگوں کو ابدی پھٹکار سے بچانے کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ چنانچہ اس کے خیال کے مطابق یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ بچایا کسے جائے گا اور پھٹکار کس پر پڑے گی۔ یہ پہلے سے مقدر کیا جاچکا ہے۔ ہم سب اس کے رحم و کرم پر ہیں۔"

"چنانچہ وہ ایک لحاظ سے مقدر کے پرانے عقیدے کی طرف لوٹ گیا؟"

"شاید۔ لیکن انسان پر خود اپنی زندگی کی جو ذمے داریاں عاید ہوتی ہیں، سینٹ آگسٹین نے ان سے لاتعلقی اختیار نہیں کی۔ اس نے سکھایا کہ ہمیں اس آگہی کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہیے کہ ہم چنیدہ لوگوں میں ہیں۔ اس نے اس سے انکار نہیں کیا کہ ہم آزاد منشا کے مالک ہیں لیکن ہم کس قسم کی زندگی بسر کریں گے، اس کا علم خدا کو پہلے ہی ہے۔"

"کیا یہ قدرے نا انصافی نہیں؟" سوفی نے پوچھا۔ "سقراط نے کہا تھا کہ ہم سب کو یکساں مواقع حاصل ہیں کیونکہ ہم سب یکساں عقل سلیم کے مالک ہیں۔ لیکن سینٹ

آگسٹین انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک کے حصے میں بخشش اور دوسرے کے پھٹکار آتی ہے۔"

"تمہاری بات ان معنوں میں درست ہے کہ سینٹ آگسٹین کی دینیات (Theology) انتھنز کی انسان دوستی (humanism) سے خاصی دور ہٹ جاتی ہے۔ لیکن سینٹ آگسٹین انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ وہ محض نجات اور پھٹکار کے انجیلی نظریے کی تشریح کرتا ہے۔ اس نے اس کی تشریح اپنی عالمانہ کتاب میں کی ہے جس کا نام 'آسمان کا شہر' (City of God) ہے۔"

"مجھے اس کے متعلق بتائیں۔"

"'آسمان کا شہر' یا 'آسمان کی بادشاہی' کی ترکیب انجیل اور یسوع کی تعلیمات سے آئی ہے۔ سینٹ آگسٹین کا عقیدہ تھا کہ ساری انسانی تاریخ 'آسمان کی بادشاہی' اور 'دنیا کی بادشاہی' کے مابین کشمکش کی کہانی ہے۔ دونوں بادشاہیاں سیاسی بادشاہیاں نہیں جو ایک دوسرے سے مختلف و ممیز ہیں۔ وہ ہر فرد واحد کے اندر برتری کے لیے برسر پیکار رہتی ہیں۔ تاہم 'آسمان کی بادشاہی' کم و بیش واضح طور پر کلیسا میں اور 'دنیا کی بادشاہی' مملکت میں ـــــ مثلاً رومی مملکت جو سینٹ آگسٹین کے زمانے میں زوال پذیر ہو رہی تھی ـــــ موجود ہوتی ہے۔ قرون وسطیٰ کے پورے عہد کے دوران میں کلیسا اور مملکت کے مابین بالادستی کے لیے جو کشمکش ہوتی رہی، اس سے یہ تصور روز بروز زیادہ واضح ہوتا چلا گیا۔ تب یہ کہا جانے لگا: 'کلیسا سے باہر نجات ممکن نہیں۔' سینٹ آگسٹین کا 'آسمان کا شہر' بالآخر مسلمہ کلیسائی نظام کے مماثل قرار پایا۔ جب تک چودھویں صدی میں تحریک اصلاح (مذہب) نہ شروع ہوئی، کسی شخص نے بھی اس تصور کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی تھی کہ لوگوں کو نجات صرف کلیسا کی وساطت سے مل سکتی ہے۔"

"یہ وقت آنا ہی تھا!"

"ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ سینٹ آگسٹین پہلا فلسفی تھا جس نے تاریخ کو اپنے فلسفے میں گھسیٹ لیا۔ خیر اور شر کے مابین کشمکش کسی لحاظ سے بھی نئی بات نہیں تھی۔ نئی بات یہ تھی کہ آگسٹین کے نزدیک اس کشمکش کا اکھاڑا تاریخ تھی۔ آگسٹین کی تصنیفات کے اس پہلو میں افلاطون کا کوئی عمل دخل نہیں۔ وہ تاریخ کے خطی (linear) نقطہ نظر سے زیادہ متاثر تھا جس سے ہمارا واسطہ پرانے عہد نامے میں پڑتا

ہے ـــــ پرانے عہد نامے میں اس سلسلے میں جو تصور پیش کیا گیا ہے ' وہ یہ ہے کہ
خدا کو اپنی ' آسمان کی بادشاہت ' کی تکمیل کے لیے ساری تاریخ کی ضرورت پیش آتی
ہے۔ تاریخ انسان کی آگہی و باخبری اور شر کی تباہی کے لیے ناگزیر ہے یا جیسا کہ
سینٹ آگسٹین نے کہا ہے: ' الوہی بصیرت آدم سے ابد تک انسانی تاریخ کا رخ یوں
متعین کرتی رہتی ہے جیسے یہ فرد واحد کی کہانی ہو جو شیر خوارگی سے بڑھاپے تک عمر کی
تمام منزلیں طے کر چکا ہے۔"

سوفی نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "دس بج گئے ہیں۔" اس نے کہا۔ "مجھے
بہت جلد واپس جانا ہو گا۔"

"لیکن پہلے مجھے قرون وسطیٰ کے دوسرے عظیم فلسفی کے متعلق بتانا ہو گا۔
باہر بیٹھ جائیں؟"

البرٹو اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی ہتھیلیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھیں اور
گرجے کے درمیان راستے پر چلنے لگا۔ بظاہر یوں نظر آرہا تھا جیسے وہ کوئی دعا مانگ رہا ہو یا
پھر کسی روحانی صداقت کے متعلق سوچ بچار میں غرق ہو۔ سوفی اس کے پیچھے پیچھے چلنے
لگی۔ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

سورج ابھی تک صبح کے بادلوں کو چیر کر باہر نہیں نکل سکا تھا۔ البرٹو گرجے
کے باہر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ سوفی پریشان ہو رہی تھی کہ اگر کوئی شخص ادھر آنکلا ' وہ کیا
سوچے گا۔ صبح سویرے دس بجے گرجے کے بنچ پر بیٹھنا بذات خود عجیب بات تھی ' اور
قرون وسطیٰ کے کسی راہب کے پاس بیٹھنے سے تو معاملہ اور بھی گڑبڑا جائے گا۔

"صبح کے آٹھ بج چکے ہیں۔" اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ "سینٹ آگسٹین
کے انتقال کے بعد تقریباً چار سو سال گزر چکے ہیں ' اور اب سکولوں کا آغاز ہو گیا ہے۔ اب
سے دس بجے تک تعلیم پر کانونٹ سکولوں کی اجارہ داری رہے گی۔ دس اور گیارہ بجے کے
درمیان اولین کیتھڈرل سکولوں کی تاسیس عمل میں آئے گی اور ان کے بعد بوقت
دوپہر پہلی یونیورسٹیاں قائم ہو جائیں گی۔ عظیم گوتھک کلیسے اسی عہد میں تعمیر کیے
جائیں گے۔ اس سینٹ میری چرچ کو بھی تیرھویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا ـــــ
جس زمانے میں یہ تعمیر ہوا اسے ہم ہائی گوتھک عہد کہتے ہیں۔ اس شہر کے باشندوں میں
کوئی عظیم گرجا تعمیر کرنے کی سکت نہیں تھی۔"

"انہیں اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟" سوفی نے کہا۔ "مجھے خالی گرجوں سے نفرت ہے۔"

"آخ۔ لیکن عظیم کلیسا (12) محض عبادت گزاروں کی کثیر تعداد کے لیے تعمیر نہیں کئے جاتے تھے، وہ خداوند کے جلال و جمال کے حضور نذرانہ عقیدت تھے اور بذات خود ایک قسم کی حمد و ثنا تھے۔ تاہم اس دور میں ایک اور چیز وقوع پذیر ہوئی جو ہم جیسے فلسفیوں کے لیے خاص معنویت کی حامل ہے۔"

البرٹو کی گفتگو جاری رہی: "ہسپانوی عربوں کا اثر اپنا رنگ دکھانے لگا۔ سارے قرون وسطیٰ کے دوران میں عربوں نے ارسطو کی روایت زندہ رکھی تھی اور بارھویں صدی کے اختتام پر امرا و شرفا کی دعوت پر عرب عالم شمالی اٹلی پہنچنا شروع ہو گئے۔ یوں ارسطو کی متعدد تصانیف سے شناسائی حاصل ہوئی اور ان کے عربی اور یونانی زبانوں سے تراجم ہوئے۔ اس سے طبعی علوم میں نئی دلچسپی پیدا ہو گئی اور عیسائی مکاشفے (13) کے یونانی فلسفے سے تعلق کے مسئلے میں نئی جان پڑ گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ سائنس کے معاملے میں ارسطو کو مزید نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ فلسفی ارسطو کی بات کب سنی جائے اور انجیل کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کب کیا جائے؟

کچھ سمجھیں؟"

سوفی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور راہب کا سلسلہ کلام جاری رہا:

"اس عہد کا عظیم ترین اور اہم ترین فلسفی سینٹ ٹامس ایکوائی نیس (Thomas Aguinas) تھا۔ وہ 1225ء میں پیدا ہوا اور اس نے 1274ء میں انتقال کیا۔ اس کا تعلق روم اور نیپلز کے درمیان ایک چھوٹے سے قصبے ایکوانو (Aquino) سے تھا، لیکن اس نے پیرس یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ میں اسے فلسفی کہتا ہوں لیکن وہ دینیات (Theology) کا بھی اتنا ہی بڑا عالم تھا۔ اس زمانے میں فلسفے اور دینیات کے مابین کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ قصہ کوتاہ، ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح قرون وسطیٰ کے ابتدائی دور میں افلاطون کو مشرف بہ عیسائیت کر لیا گیا تھا بعینہٖ ایکوائی نیس نے عیسائیت کا طرہ ارسطو کے سر پر رکھ دیا۔"

"کیا ان فلسفیوں کو، جو یسوع سے صدیوں پہلے فوت ہو چکے تھے، عیسائی بنانا عجیب نہیں معلوم ہوتا؟"

"تم یہ کہہ سکتی ہو۔ لیکن ان دونوں عظیم یونانی فلسفیوں کو 'عیسائی' بنانے کا

مطلب صرف یہ ہے کہ ان کے افکار کی کچھ اس انداز سے تفسیر و تشریح کی جائے کہ وہ عیسائیت کے مسئلہ ایمان (dogma) کے لیے مزید خطرہ نہ تصور کئے جاسکیں۔ ایکوائی نیس ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے ارسطو کے فلسفے کو عیسائیت کے مزاج کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ ہم کہتے ہیں کہ اس نے عقیدے اور علم کے مابین عظیم امتزاج پیدا کردیا۔ اس نے یہ کام ارسطو کے فلسفے میں گھس کر اور اس کی باتوں کا محض لفظی مطلب لے کر کیا حالانکہ ارسطو (بیچارہ!) کہنا شاید اور کچھ یا بالکل ہی متضاد چاہتا تھا۔"

"میں معافی چاہتی ہوں لیکن گزشتہ رات میں کوئی خاص سو نہیں سکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنی بات ذرا مزید صراحت سے بیان کرنا ہوگی۔"

"ایکوائی نیس کا عقیدہ تھا کہ ہمیں فلسفہ یا عقل جو کچھ سکھاتے ہیں، اس کے اور اس کے مابین جو ہمیں عیسائی مکاشفہ یا ایمان سکھاتا ہے، کوئی کشمکش نہیں ہونا چاہیے۔ اکثر اوقات عیسائیت اور فلسفہ ایک ہی بات کہتے ہیں۔ چنانچہ ہم اکثر عقل کی مدد سے انہی صداقتوں تک پہنچ جاتے ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پڑھتے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ کیا عقل ہمیں بتا سکتی ہے کہ خدا نے دنیا چھ یوم میں تخلیق کی تھی یا یسوع خدا کے بیٹے تھے؟"

"نہیں۔ ایمان کی ان تمام حقیقتوں تک صرف عقیدے اور عیسائی مکاشفے کے ذریعے ہی رسائی ہوسکتی ہے۔ لیکن ایکوائی نیس کا متعدد 'فطری الہیاتی صداقتوں' کے وجود پر اعتقاد تھا۔ ان سے اس کا مطلب وہ صداقتیں ہیں جن تک نصرانی ایمان اور ہماری اپنی خلقی یا فطری عقل دونوں کے ذریعے رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مثلاً یہ صداقت کہ کوئی خدا موجود ہے۔ ایکوائی نیس کا عقیدہ تھا کہ خدا تک پہنچنے کے لیے دو راستے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک راستہ ایمان اور عیسائی مکاشفے کا ہے اور دوسرا عقل اور حواس میں سے جاتا ہے۔ ان دونوں میں ایمان اور مکاشفے کا راستہ یقیناً صائب ترین ہے کیونکہ محض عقل پر اعتبار کرنے سے راستہ بھول جانا آسان ہے۔ تاہم ایکوائی نیس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ارسطو جیسے فلسفی کے افکار اور عیسائی عقاید کے مابین کسی کشمکش کا ہونا ضروری نہیں۔"

"چنانچہ ہم ارسطو پر اعتبار کریں یا انجیل پر، یہ ہماری اپنی مرضی ہے؟"

"بالکل نہیں۔ ارسطو صرف کچھ فاصلے تک ساتھ دیتا ہے کیونکہ اسے عیسائی مکاشفے کا علم نہیں تھا۔ مثلاً یہ کہنا غلط نہیں کہ ایتھنز یورپ میں ہے، لیکن یہ جملہ پوری

سچائی بتانے سے قاصر ہے۔ اگر کوئی کتاب صرف یہ بتائے کہ ایتھنز یورپ کا شہر ہے، تو عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ کسی جغرافیے کی کتاب کو دیکھ لیا جائے۔ وہاں تمہیں پوری سچائی مل جائے گی کہ ایتھنز یونان کا دارالحکومت ہے اور یونان جنوب مشرقی یورپ کا چھوٹا سا ملک ہے۔ اگر قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تو تمہیں ایکروپولس کے متعلق بھی ایک آدھ بات معلوم ہو جائے گی۔ رہے سقراط، افلاطون اور ارسطو، ان کے ذکر کی تو توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔"

"لیکن ایتھنز کے متعلق پہلی اطلاع (کہ وہ یورپی شہر ہے) درست تھی۔"

"بالکل صحیح! لیکن ایکوائی نیس ثابت کرنا چاہتا تھا کہ صداقت صرف ایک ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ارسطو ہمیں کوئی ایسی بات بتاتا ہے جو ہماری عقل کہتی ہے کہ صحیح ہے، تو اس کا عیسائی تعلیمات سے کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ ہم اپنی عقل کی مدد اور اپنے حواس کی شہادت کے ذریعے کامیابی سے صداقت کے ایک پہلو تک پہنچ سکتے ہیں: مثلاً جس قسم کی صداقتوں کا حوالہ ارسطو پودوں اور حیوانوں کی مملکت کے ذکر کے دوران میں دیتا ہے۔ لیکن صداقت کا ایک اور پہلو بھی ہے اور اس پہلو کا انکشاف خدا بائبل کے ذریعے کرتا ہے۔ لیکن بعض مقامات پر صداقت کے دونوں پہلو ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ ایسے بے شمار مسائل ہیں جن کے متعلق عقل اور انجیل ہمیں بالکل ایک جیسی باتیں بتاتی ہیں۔"

"مثلاً اس قسم کی کہ کوئی خدا موجود ہے؟"

"بالکل صحیح۔ ارسطو کے فلسفے میں بھی یہ مفروضہ پایا جاتا ہے کہ کوئی خدا ـــــ یا ہیئتی علت (formal cause) ـــــ موجود ہے جو فطرت کی تمام عمل کاریوں (processes) کا آغاز کرتا ہے۔ لیکن وہ خدا کی کوئی مزید تفصیل نہیں دیتا۔ اس کے لیے ہمیں سراسر بائبل اور یسوع کی تعلیمات پر انحصار کرنا ہوگا۔"

"کیا یہ بات قطعی یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ کوئی خدا موجود ہے؟"

"بظاہر اس کے متعلق کچھ بحث ہوسکتی ہے۔ لیکن ہمارے اپنے زمانے میں بھی اکثر لوگ اس بات پر متفق ہوں گے کہ انسانی عقل یقیناً خدا کے وجود کی نفی کرنے کے نا اہل ہے۔ ایکوائی نیس اس سے بھی آگے نکل گیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ وہ ارسطو کے فلسفے کو بنیاد بنا کر خدا کا وجود ثابت کرسکتا ہے۔"

"یہ بات ذرا قابل قبول ہے!"

"اس کا عقیدہ تھا کہ ہم اپنی عقل کی مدد سے یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی 'ہیئتی علت' ہو گی - خدا نے انجیل اور عقل دونوں کے ذریعے اپنے آپ کو انسان پر منکشف کیا ہے - یوں 'ایمان کی الہیات' اور 'فطرت کی الہیات' دونوں ہی موجود ہیں - یہی بات اخلاقی پہلو پر بھی صادق آتی ہے - انجیل ہمیں سکھاتی ہے کہ خدا ہم سے کس قسم کی زندگی بسر کرانا چاہتا ہے - لیکن خدا نے ہمیں ایک عدد ضمیر بھی عطا کیا ہے جو ہمیں 'فطری' بنیاد پر غلط اور صحیح کے مابین امتیاز کرنے کے قابل بناتا ہے - یوں اخلاقی زندگی کے بھی 'دو راستے' ہیں - ہم نے انجیل نہ بھی پڑھی ہو، پھر بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کو ضرر پہنچانا غلط بات ہے اور یہ کہ 'ہمیں دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جس کی ہم ان سے توقع کرتے ہیں' - ان معاملات میں بھی صائب ترین مشورہ یہی ہے کہ انجیل کے احکام پر عمل کیا جائے -"

"میرا خیال ہے کہ میں سمجھ گئی ہوں -" سوفی نے اب کہا - "یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے بجلی کی چمک دیکھ کر اور رعد کی کڑک سن کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ طوفان بادو باراں آیا ہی چاہتا ہے -"

"بالکل صحیح - بے شک ہم اندھے ہوں، پھر بھی ہم بادل کی کڑک سن سکتے ہیں اور بے شک ہم بہرے ہوں، ہم بجلی کی چمک دیکھ سکتے ہیں - البتہ بہترین بات یہی ہو گی کہ ہم دونوں کام کر سکیں یعنی دیکھ بھی سکیں اور سن بھی سکیں - تاہم جو کچھ ہم دیکھتے اور جو کچھ ہم سنتے ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں - اس کے برعکس ——— دونوں تاثرات ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں -"

"میں سمجھ گئی ہوں -"

"مجھے ایک اور تصویر پیش کرنے دو - اگر تم کوئی ناول ——— مثلاً جون سٹائین بیک (14) کا ناول 'چوہوں اور انسانوں کے بارے میں' ('Of Mice and Men') پڑھو..."

"درحقیقت میں یہ ناول پڑھ چکی ہوں -"

"کیا تمہیں محسوس نہیں ہوتا کہ محض کتاب پڑھ کر مصنف کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہو جاتا ہے؟"

"مجھے اندازہ ہونے لگتا ہے کہ کوئی نہ کوئی تو شخص ہو گا جس نے یہ لکھی ہے -"

"اس کے متعلق تمہیں صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے؟"

"مجھے احساس ہوتا ہے کہ اسے ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی ہے جن کی معاشرہ کوئی پروا نہیں کرتا۔"

"جب تم یہ کتاب ـــــ جو سٹائن بیک کی تخلیق ہے ـــــ پڑھتی ہو تو تمہیں سٹائن بیک کی فطرت کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو جاتا ہے لیکن تم یہ توقع نہیں کر سکتیں کہ تم مصنف کے متعلق کوئی ذاتی معلومات بھی حاصل کر سکو گی - کیا تم 'Of Mice and Men' پڑھ کر یہ بتا سکتی ہو کہ مصنف نے جب یہ کتاب لکھی ' اس کی عمر کیا تھی ' وہ کہاں رہتا تھا اور اس کے بچے کتنے تھے؟"

"بالکل نہیں۔"

"لیکن تمہیں یہ معلومات سٹائن بیک کی کسی سوانح حیات ـــــ یا خود نوشت سوانح حیات ـــــ میں مل سکتی ہیں - سٹائن بیک کی صرف سوانح حیات یا آپ بیتی پڑھ کر ہی تم اس کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتی ہو۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔"

"کم و بیش یہی حال خدا کی تخلیق اور بائبل کا ہے - دنیائے فطرت میں محض گھومنے پھرنے سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ کوئی خدا موجود ہے - ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ وہ پھولوں اور جانوروں سے پیار کرتا ہے ورنہ وہ انہیں بناتا ہی نہ - لیکن خدا کے متعلق ' اس کی ذات کے متعلق معلومات ہمیں صرف بائبل میں ملتی ہیں ـــــ اور اگر تم چاہو تو کہہ سکتی ہے کہ یہ معلومات اس کی 'آپ بیتی' (بائبل) میں موجود ہیں۔"

"آپ کو مثالیں تلاش کرنے کا ہنر آتا ہے۔"

"ہمم..."

پہلی مرتبہ البرٹو نے کوئی جواب نہ دیا ـــــ وہ بس وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔

"کیا ان سب باتوں کا ہلڈے سے کوئی تعلق بنتا ہے؟" سوفی پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"ہمیں یہ قطعاً معلوم نہیں کہ کوئی 'ہلڈے' ہے بھی یا نہیں؟"

"لیکن ہمیں معلوم ہے کہ کوئی شخص اس کے متعلق جگہ جگہ ثبوت ' بے شک وہ گمراہ کن ہوں ' چھوڑتا پھر رہا ہے - پوسٹ کارڈ ' ریشمی سکارف ' سبز بٹوا ' ایک عدد جراب..."

البرٹو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "نظر کچھ یوں آتا ہے جیسے یہ ہلڈے کا باپ

ہے جو یہ فیصلے کر رہا ہے کہ وہ کہاں اور کتنے ثبوت چھوڑے گا۔" اس نے کہا۔ "فی الحال ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ ہمیں بے شمار پوسٹ کارڈ بھیج رہا ہے۔ کاش وہ اپنے متعلق بھی کچھ لکھ بھیجتا۔ خیر چھوڑو، ہم اس کا ذکر بعد میں کریں گے۔"

"پونے گیارہ بج چکے ہیں۔ مجھے قرون وسطیٰ کے اختتام سے پہلے گھر پہنچنا ہو گا۔"

"ایکوائی نیس نے کس طرح ان تمام شعبوں میں ارسطو کے فلسفے کو استعمال کیا جہاں اس کا کلیسا کی دینیات سے کوئی تصادم نہیں ہوتا تھا، میں اس کے بارے میں چند باتیں کہوں گا اور پھر اپنی گفتگو ختم کر دوں گا۔ ان شعبوں میں منطق، اس کا نظریہ علم اور سب سے بڑھ کر اس کا فلسفہ فطرت شامل تھا۔ مثلاً تمہیں یاد ہے کہ ارسطو نے کس طرح پودوں اور جانوروں سے انسانوں تک زندگی کے تدریجی پیمانے (scale) کو بیان کیا تھا؟"

سوفی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ارسطو کا عقیدہ تھا کہ یہ پیمانہ کسی خدا کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے جس نے زندہ اشیا کی ایک طرح سے زیادہ سے زیادہ تعداد مقرر کر دی تھی۔ دنیا میں اس طریقے سے ہر چیز کی تنظیم کو عیسائی دینیات کے ساتھ وابستہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ایکوائی نیس کے مطابق پودوں اور جانوروں سے انسان تک، انسان سے ملائکہ تک اور ملائکہ سے خدا تک، زندگی کا تدریجی پیمانہ موجود ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ جانوروں کی طرح انسان کے پاس جسم اور حواسی اعضا ہیں لیکن انسان کے پاس ذہانت بھی ہے جو اسے اشیا کے متعلق استدلال کرنے اور انہیں سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ملائکہ کا حواسی اعضا سمیت اس قسم کا کوئی جسم نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان کی ذہانت فی البدیہہ اور فوری ہوتی ہے۔ انہیں انسانوں کی طرح 'سوچ بچار کرنے' کی کوئی ضرورت نہیں۔ انہیں استدلال کے ذریعے نتائج مستنبط کرنے کی بھی حاجت لاحق نہیں ہوتی۔ وہ ہر اس بات کو جانتے ہیں جسے انسان جان سکتا ہے لیکن انہیں ہماری طرح قدم بہ قدم سیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ چونکہ ملائکہ کا جسم نہیں ہوتا ان کا کبھی انتقال نہیں ہوتا۔ وہ خدا کی طرح ازل سے موجود نہیں کیونکہ انہیں کسی وقت خدا نے تخلیق کیا تھا۔ لیکن ان کا کوئی جسم نہیں ہوتا جسے وہ کسی دن داغ مفارقت دے سکیں۔ چنانچہ ان کی موت کبھی واقع نہیں ہوتی۔"

"یہ تو بڑی خوبصورت بات معلوم ہوتی ہے!"

"لیکن، سوفی، ملائکہ سے اوپر خدا ہے اور حکومت اسی کی ہے۔ وہ علیم و بصیر ہے اور ایک مربوط نظر میں سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔"

"چنانچہ وہ اب ہمیں دیکھ سکتا ہے۔"

"ہاں، شاید وہ دیکھ سکتا ہے۔ لیکن 'اب' نہیں۔ کیونکہ خدا کے لیے وقت اس طرح موجود نہیں ہوتا جس طرح کہ وہ ہمارے لیے ہوتا ہے۔ ہمارا 'اب' خدا کا 'اب' نہیں ہے۔ چونکہ ہمارے لیے کئی ہفتے گزر جاتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں بنتا کہ وہ خدا کے لیے بھی گزر گئے ہیں۔"

"یہ تو بڑی ڈرانے والی بات ہے!" سوفی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا۔ البرٹو نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا، اور سوفی بولتی رہی: "مجھے کل ہلڈے کے باپ کا ایک اور کارڈ ملا تھا۔ اس نے بھی کچھ اس قسم کی بات لکھی تھی ــــــ سوفی کے لیے جو چیز ایک دو ہفتے ہے، ضروری نہیں کہ وہ ہمارے لیے بھی ایک دو ہفتے ہی ہو۔ یہ تو بالکل وہی بات ہے جو آپ نے خدا کے بارے میں کہی ہے!"

سوفی کو اچانک براؤن کلاہ کے نیچے البرٹو کے چہرے پر تکدر کے آثار نظر آئے۔

"اسے اپنے آپ پر شرم آنا چاہیے!"

سوفی پوری طرح سمجھ نہ سکی کہ البرٹو کا مطلب کیا ہے۔ وہ بولتا چلا گیا: "بدقسمتی سے ایکوائی نیس نے بھی عورتوں کے متعلق ارسطو کا نظریہ اپنا لیا۔ تمہیں شاید یاد ہو کہ ارسطو کا خیال تھا کہ عورت کم و بیش) 'غیر مکمل یا ادھورا مرد' ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ بچے کو ورثے میں صرف مرد کے خصائص ملتے ہیں کیونکہ عورت منفعل (passive) اور وصول کنندہ (receptive) ہوتی ہے جب کہ مرد فعال (active) اور تخلیق کار ہوتا ہے۔ ایکوائی نیس کے مطابق (ارسطو کے) یہ خیالات انجیل کے پیغام سے ہم آہنگ ہیں جو مثلاً ہمیں بتاتی ہے کہ عورت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی۔"

"لایعنی!"

"یہ بات جاننا دلچسپی سے خالی نہیں کہ ممالیوں (دودھ پلانے والے جانوروں) کے انڈے 1827 تک دریافت نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ اگر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ نسل

بڑھانے کے سلسلے میں جو تخلیقی اور حیات بخش قوت کام کرتی ہے ' وہ مرد کی ہوتی ہے ' تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ۔ مزید برآں تم یہ بات بھی ذہن نشین کر سکتی ہو کہ ایکوائی اینس کے مطابق یہ بات بالکل فطری ہے کہ عورت مرد سے فروتر ہے ۔ تاہم عورت کی روح (soul) مرد کی روح کے برابر ہوتی ہے ۔ جنت میں مردوں اور عورتوں کے مابین مکمل مساوات ہو گی کیونکہ وہاں جنس کے تمام جسمانی اختلافات کا وجود ختم ہو جائے گا ۔"

"اس سے کون سے اطمینان کا پہلو نکلتا ہے ! قرون وسطیٰ میں خواتین فلسفی نہیں تھیں ؟"

"قرون وسطیٰ کے دوران میں گرجوں پر مردوں کو تغلب حاصل تھا ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خواتین مفکر بالکل ہی عنقا تھیں ۔ ان میں سے ایک بنگن (Bingen) کی ہلڈے گارڈ (Hildegard) تھی . . . "

سوفی کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔

" کیا اس کا ہلڈے سے کوئی تعلق ہے ؟"

" کیا سوال ہے ! ہلڈے گارڈ (جرمنی کی) وادی رائن کی راہبہ تھی جو 1098 سے 1179 تک زندہ رہی ۔ عورت ہونے کے باوجود وہ واعظ ' مصنف ' طبیب ' ماہر نباتیات اور فطرت پسند فلسفی تھی ۔ وہ اس حقیقت کی واضح مثال ہے کہ قرون وسطیٰ کے دوران میں عورتوں کا انداز فکر اور رویہ زیادہ عملی بلکہ زیادہ سائنسی بھی ہوتا تھا ۔"

"لیکن ہلڈے کے متعلق کیا خیال ہے ؟"

"قدیم عیسائیوں اور یہودیوں کا ایک عقیدہ یہ تھا کہ خدا صرف نرینہ صفات کا مالک نہیں ' بلکہ اس کا ایک نسوانی پہلو یا ' مادرانہ فطرت ' بھی ہوتی ہے ' عورتیں بھی خدا کی شبیہہ پر تخلیق کی جاتی ہیں ۔ خدا کے اس نسوانی پہلو کو یونانی میں ' سوفیا ' (sophia) کہا جاتا ہے ۔ ' سوفیا ' یا ' سوفی ' (sophie) کا مطلب ' دانش ' حکمت ' یا دانائی ' ہے ۔"

سوفی نے صبر شکر سے اپنا سر ہلا دیا ۔ "اسے یہ بات پہلے کسی نے کیوں نہیں بتائی تھی " ! (وہ سوچ رہی تھی ۔) ۔ "پھر میں نے بھی کبھی کیوں نہ پوچھا ؟"

البرٹو بولتا رہا : "سوفیا یا خدا کی مادرانہ فطرت قرون وسطیٰ کے سارے عرصے کے دوران میں یہودیوں اور یونانی آرتھوڈوکس چرچ دونوں کے لیے خاص معنویت کی حامل بنی رہی ۔ مغرب میں اسے فراموش کر دیا گیا ۔ دریں اثنا ہلڈے گارڈ منظر عام پر نمودار ہوتی

ہے۔ اسے رویا میں سنہری بجے میں ملبوس، جو قیمتی جواہرات سے مزین تھا، سوفیا کا دیدار ہوتا ہے..."

سوفی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ سوفیا نے اپنے آپ کو رویا میں ہلڈے مگراڈ پر منکشف کیا تھا؟ (وہ سوچ رہی تھی)۔

"ہوسکتا ہے کہ میں ہلڈے کو خواب میں نظر آجاؤں۔" (اس نے کہا)

وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ البرٹو نے تیسری مرتبہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا ہمیں لازماً کھوج لگانا ہوگا۔ لیکن اب گیارہ سے اوپر ہوچکے ہیں۔ تمہیں گھر جانا چاہیے، اور ہم ایک نئے عہد کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ میں تمہیں پیغام بھیج دوں گا اور ہم نشاۃ ثانیہ کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ ہر ہیز تمہیں باغ میں ملنے آئے گا۔"

اس کے ساتھ ہی عجیب و غریب راہب اٹھا اور گرجے کی جانب چلنے لگا۔

سوفی جہاں بیٹھی تھی، وہیں بیٹھی رہی۔ وہ ہلڈے مگراڈ اور سوفیا، ہلڈے اور سوفی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اچانک اس نے جست لگائی اور راہبانہ لباس پہنے فلسفی کے پیچھے بھاگنے لگی۔ پھر اس نے بلند آواز سے پوچھا:

"قرون وسطیٰ میں کوئی البرٹو بھی تھا؟"

البرٹو نے اپنی رفتار قدرے سست کردی، اس نے اپنا سر ذرا سا گھمایا اور کہا:

"ایکوائی نیس کا ایک فلسفے کا مشہور استاد تھا۔ اس کا نام البرٹ عظیم تھا..."

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی گردن کو خم دیا اور سینٹ میری چرچ کے دروازے کے اندر غائب ہوگیا۔

سوفی اس کے جواب پر مطمئن نہ ہوئی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے گرجے کے اندر چلی گئی لیکن اب گرجا بالکل خالی تھا۔ "کیا وہ فرش میں غائب ہوگیا ہے؟" (سوفی نے سوچا)

جب وہ گرجے سے باہر نکل رہی تھی، اس کی نظر کنواری مریم کی تصویر پر پڑی۔ وہ اس کے قریب چلی گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اچانک اسے تصویر کی مریم کی ایک آنکھ کے نیچے پانی کا چھوٹا سا قطرہ نظر آیا۔ "کیا یہ آنسو ہے؟" (اس کے ذہن میں خیال آیا۔)

سوفی بھاگم بھاگ گرجے سے باہر نکلی اور تیز قدموں جوآنا کے گھر کی طرف چلنے لگی۔

16 _ نشاۃ ثانیہ

* * *

. . . انسانی بھیس میں الوھی نسب رکھنے والے . . .

جب سوفی جوآنا کے گھر کے بڑے دروازے کے قریب پہنچی ، دن کے بارہ بج چکے تھے ۔ دوڑتے دوڑتے اس کی سانس پھول چکی تھی ۔ اس وقت جوآنا اپنے زرد خاندانی مکان کے بیرونی صحن میں کھڑی تھی ۔

" تمہیں گئے پانچ گھنٹے گزر چکے ہیں !" اس نے درشتی سے کہا ۔

سوفی نے اپنا سر یوں ہلایا جیسے اسے جوآنا کی بات سے اتفاق نہ ہو ۔

"نہیں ، مجھے گئے ہزار سال سے زیادہ کی مدت بیت چکی ہے ۔"

" آخر تم تھیں کہاں ؟ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ؟ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے تمہاری امی کا میلی فون آیا تھا ۔"

"تم نے انہیں کیا بتایا؟"

"میں کیا بتاتی ؟ بس کہہ دیا کہ تم ڈرگ سٹور (1) گئی ہو ۔ انہوں نے کہا کہ جب تم واپس آؤ ، انہیں میلی فون کرنا ۔ لیکن آج صبح دس بجے جب امی اور پاپا گرم گرم چاکلیٹ اور کریم رول لے کر میرے کمرے میں آئے اور انہوں نے تمہیں غیر حاضر پایا تو ان کی جو حالت ہوئی تم دیکھتیں تو بالکل سٹپٹا جاتیں ۔"

"تم نے ان سے کیا کہا؟"

"کہتی کیا ، میں بالکل کھسیانی ہوگئی ۔ پھر میں نے بات بنائی کہ ہماری تو تکار

ہو گئی تھی اور تم روٹھ کر اپنے گھر چلی گئی ہو۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں صلح کرنے میں دیر نہیں لگانا چاہیے۔ اور ہمیں اس بات کا بھی اہتمام کرنا ہوگا کہ تمہاری امی ابا کے میری امی سے چند دن تک کوئی بات نہ ہونے پائے۔ کیا خیال ہے ہم یہ کام کر سکیں گی؟"

جو آننا نے کندھے اچکا دئے۔ لیکن عین اسی اثنا میں اس کا باپ ریڑھی دھکیلتا ان کے قریب نکڑ میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں کے اوپر ایپرن پہن رکھا تھا۔ (وہ لان سے پتوں اور چھوٹی موٹی ٹہنیوں کی، جو خزاں کے دوران میں جھڑ کر نیچے گر چکی تھیں، صفائی کر رہا تھا۔)

"اخاہ ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں کی پھر صلح ہو گئی ہے۔ خیر، اب ادھر ایک پتا بھی باقی نہیں رہا۔"

"بہت خوب۔" سوفی نے کہا۔ "چنانچہ اب ہم گرم گرم چاکلیٹ بستر کی بجائے یہیں بیٹھ کر پی سکتے ہیں۔"

جو آننا کا باپ مصنوعی انداز سے ہنس پڑا لیکن خود جو آننا کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ مسٹر برگ نسین، جو مشیر مالیات تھا، اور اس کی اہلیہ کا گھرانہ نسبتاً زیادہ خوشحال تھا اور ان کے ہاں باہمی گفتگو کے دوران میں ایک دوسرے کو بے باک طریقے سے جواب دینے کا رواج سوفی کے خاندان کی نسبت بہت کم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ باپ بیٹی سوفی کے جواب پر بھونچکا رہ گئے۔

"جو آننا، مجھے افسوس ہے کہ میرے منہ سے ایسی بات نکل گئی۔ لیکن میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس اخفائے راز کی مہم میں میں بھی تو کچھ حصہ لوں۔"

"یہ تم کیا کرتی پھر رہی ہے، مجھے اس کے متعلق کچھ بتاؤ گی یا نہیں؟"

"یقیناً بتاؤں گی لیکن ایک شرط پر کہ میرے ساتھ گھر چلو۔ کیونکہ جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گی وہ مالی مشیروں اور بچگانہ حرکتیں کرنے والی خالی الذہن بڑھیاؤں (2) کے سننے کا نہیں۔"

"بڑی گھٹیا باتیں کر رہی ہو! میرا خیال ہے کہ تم اس ناکام شادی کو، جو ایک فریق کو سمندر کی طرف دھکیل دیتی ہے، زیادہ بہتر سمجھتی ہو؟"

"غالباً نہیں۔ خیر چھوڑو، میں گزشتہ رات پوری نیند سو نہیں سکی تھی (اور اس بے خوابی کے اثرات ابھی تک باقی ہیں)۔ ایک اور بات بھی ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ

جو کچھ ہم کرتی ہیں، کیا ہلڈے اسے دیکھ سکتی ہے۔"

وہ کلوور کلوز کی طرف چلنے لگیں۔

"تمہارے خیال میں اس کے پاس باطنی نظر اور غیب دانی کی طاقت ہے؟"

"شاید ہو۔ شاید نہ ہو۔"

صاف نظر آرہا تھا کہ جو آنّا اس رازداری کے معاملے میں کسی خاص جوش و خروش کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔

"لیکن اس سے اس بات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ اس کے باپ نے اتنے ڈھیر سارے جنونی پوسٹ کارڈ جنگل میں واقع کٹیا میں کیوں بھیجے۔"

"میں مانتی ہوں کہ معاملے کا یہ کمزور پہلو ہے۔"

"مجھے بتاؤ گی کہ تم کہاں گئی تھیں؟"

چنانچہ سوفی بتانے لگی۔ اس نے ہر چیز، بلکہ فلسفے کے پراسرار نصاب کے متعلق بھی، سب کچھ بتا دیا۔ اس نے جو آنّا سے قسم لی کہ وہ ہر بات صیغہ راز میں رکھے گی۔

وہ کافی دیر تک چپ چاپ چلتی رہیں۔ جب وہ کلوور کلوز کے قریب پہنچیں، جو آنّا نے کہا: "مجھے یہ پسند نہیں۔"

وہ سوفی کے گھر کے گیٹ کے قریب رک گئی اور واپس جانے کے لیے مڑی۔

"تم سے کس نے پسند کرنے کو کہا تھا؟ لیکن فلسفہ کوئی بے ضرر پارٹی گیم نہیں۔ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ہم کون ہیں اور ہم کہاں سے آئے ہیں۔ تمہارے خیال میں جو کچھ ہمیں سکول میں پڑھایا جاتا ہے، کافی ہوتا ہے؟"

"سکول والے سکھائیں یا نہ سکھائیں لیکن اصل بات یہی ہے کہ اس قسم کے سوالوں کے جواب کوئی شخص بھی نہیں دے سکتا۔"

"تمہاری بات درست ہے لیکن سکول میں تو ہم اتنا بھی نہیں سیکھتے کہ ہمیں اس قسم کے سوال پوچھنا ہی آجائیں۔"

جب سوفی باورچی خانے میں داخل ہوئی، لنچ میز پر رکھا جاچکا تھا۔ سوفی کے جو آنّا کے گھر سے ٹیلی فون کرنے کے بارے میں کوئی بات نہ ہوئی۔

لنچ کے بعد سوفی نے اعلان کیا کہ وہ قیلولہ کرنا چاہتی ہے۔ اس نے اقرار کیا

کہ وہ جوانا کے گھر ٹھیک طرح سے نہیں سو سکی تھی ۔ گھر سے باہر سونے میں یہی قباحت تھی اور ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا۔

بستر پر دراز ہونے سے پہلے وہ پیتل کے فریم والے بڑے آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی ۔ جو اب اس کے کمرے کی دیوار پر لٹک رہا تھا ۔ ابتدا میں تو اسے صرف اپنا پژمردہ اور تھکا ماندہ چہرہ نظر آیا ۔ لیکن پھر ـــــ اسے ہلکا سا احساس ہوا کہ جیسے اسے اپنے چہرے کے عقب میں کوئی دوسرا چہرہ ابھرتا نظر آیا ہو ۔ سوفی نے ایک دو گہری سانسیں لیں ۔ "خیالوں میں چیزیں دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں" ۔ (اس نے سوچا)

وہ اپنے پژمردہ چہرے کے تیکھے نقوش کا بغور جائزہ لینے لگی جن کے اردگرد اس کے کسی طرح بھی قابو میں نہ آنے والے بالوں نے حلقہ بنا رکھا تھا ۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ ان کا کوئی نیا سٹائل بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی ، وہ بالکل ویسے کے ویسے ہی رہے جیسا کہ انہیں فطرت نے بنایا تھا ۔ لیکن اس کے اپنے چہرے کے ورے کسی دوسری لڑکی کا بھوت منڈلا رہا تھا ۔ اچانک اس دوسری لڑکی نے جنونی انداز سے یک وقت اپنی دونوں آنکھیں مارنا شروع کردیں جیسے وہ اشاروں اشاروں میں اسے جتانا چاہتی ہو کہ وہ واقعی وہاں دوسری طرف موجود ہے ۔ بھوت صرف چند سیکنڈ نظر آتا رہا ۔ پھر وہ آناً فاناً غائب ہوگیا۔

سوفی پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئی ۔ اسے مطلق شبہ نہیں تھا کہ جس لڑکی کو اس نے آئینے میں دیکھا تھا ، وہ ہلڈے ہی تھی ۔ اس نے میجر کی کٹیا میں سکول کے شناختی کارڈ پر اس کی تصویر کی جھلک دیکھی تھی ۔ یہ لازماً وہی لڑکی ہوگی جو اس نے آئینے میں دیکھی ہے۔

کیا یہ بات عجیب نہیں تھی کہ جب بھی تھکاوٹ سے اس کا برا حال ہوتا ، اسے ہمیشہ اس قسم کی پراسرار اشیا کا تجربہ ہونے لگتا ؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے ہمیشہ بعد میں اپنے آپ سے پوچھنا پڑتا: کیا یہ واردات واقعی بیتی ہے؟

سوفی نے اپنے کپڑے کرسی پر رکھ دئے اور خود بستر میں گھس گئی ۔ اس کی فوراً آنکھ بند ہوگئی اور اسے عجیب و غریب لیکن بالکل واضح خواب نظر آنے لگا۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ کسی خاصے وسیع و عریض باغ میں کھڑی ہے جو ڈھلان بناتا کسی سرخ رنگ کے کشتی گھر تک پہنچ گیا تھا ۔ کشتی گھر کے عقب میں گھاٹ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی جس کے بال ہلکی رنگت کے تھے اور جو ٹکٹکی باندھے پانی

کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ سوفی چلتے چلتے اس کے قریب بیٹھ گئی ۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی کو اس کی آمد کی کوئی خبر نہیں ہوئی ۔ سوفی نے اپنا تعارف کرایا : " میں سوفی ہوں۔" مگر بظاہر یہی نظر آرہا تھا کہ یہ لڑکی اسے دیکھ سکتی ہے نہ اس کی آواز سن سکتی ہے ۔ اچانک سوفی کو کوئی آواز پکارتے سنائی دی : "ہلڈے !" ایکا ایکی لڑکی نے ' جہاں وہ بیٹھی تھی ' وہاں سے زقند بھری اور پورا زور لگا کر مکان کی طرف بھاگنے لگی ۔ تو یہ طے ہوگیا کہ یہ لڑکی اندھی تھی نہ بہری ۔ مکان سے ایک درمیانی عمر کا آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی جانب آرہا تھا ۔ اس کے جسم پر خاکی وردی اور سر پر اونی ٹوپی تھی ۔ لڑکی نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کردئے اور اس شخص نے اسے تین چار مرتبہ ادھر ادھر جھلایا ۔ سوفی کو گھاٹ پر پڑی ' جہاں لڑکی بیٹھی تھی ' ایک طلائی صلیب نظر آئی جس پر مسیح کی تصویر کندہ تھی اور جس کے ساتھ زنجیر لٹک رہی تھی ۔ سوفی نے صلیب اٹھالی اور اپنے ہاتھ میں پکڑلی ۔ پھر اس کی آنکھ کھل گئی ۔

سوفی نے کلاک پر نگاہ ڈالی ۔ اسے سوئے دو گھنٹے بیت چکے تھے ۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی اور اس عجیب خواب کے متعلق سوچنے لگی ۔ خواب میں جو کچھ بیتا تھا ' وہ اتنا حقیقی تھا کہ اسے سچ مچ محسوس ہونے لگا کہ وہ واقعی اس تجربے میں سے گزری ہے ۔ اسے پورا یقین تھا کہ مکان اور گھاٹ واقعی کہیں نہ کہیں موجود ہیں ۔ واقعی یہ سب کچھ اس تصویر سے ملتا جلتا ہے جو اس نے میجر کی کٹیا سے لٹکی دیکھی تھی ؛ بہرحال اس امر میں کسی شک و شبے کی مطلق گنجائش نہیں کہ خواب کی لڑکی ہلڈے مولر کنیگ ہی ہے اور یہ آدمی لازماً اس کا باپ ہوگا جو لبنان سے واپس اپنے گھر آگیا ہوگا ۔ اپنے خواب میں وہ اسے البرٹو کنوکس سے خاصا مشابہ نظر آیا تھا . . .

جب سوفی اٹھی اور اپنا بستر سنوارنے لگی ' اسے اپنے تکیے کے نیچے ایک طلائی صلیب ملی ۔ اس پر مسیح کی تصویر کندہ تھی اور اس کے ساتھ زنجیر لٹک رہی تھی ۔ صلیب کی پشت پر تین حروف نقش تھے : HMK

سوفی کے لیے خواب میں خزانہ پانے کا یہ پہلا واقعہ نہیں تھا ۔ لیکن اس مرتبہ خواب خواب نہیں رہا تھا ' حقیقت بن چکا تھا ۔ وہ خواب کا خزانہ حقیقی دنیا میں لے آئی تھی ۔

"لعنت ہو !" اس نے بلند آواز سے کہا ۔

وہ اتنی پاگل ہوچکی تھی کہ اس نے الماری کا دروازہ کھولا اور نازک صلیب کو

ریشمی سکارف، سفید جراب اور لبنان کے پوسٹ کارڈوں کے قریب اوپر کے خانے میں پھینک دیا۔

جب سوفی اگلی صبح بیدار ہوئی، میز پر گرم رولوں (rolls)، مالٹے کے جوس، انڈوں اور سبزیوں کے سلاد کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایسا شاذونادر ہی ہوتا تھا کہ اتوار کی صبح سوفی کی امی اس سے پہلے جاگ گئی ہو۔ لیکن جب ایسا ہوتا تھا، اسے سوفی کے لیے ڈھیروں اشیا پر مشتمل ناشتہ بنانے میں لطف آتا تھا۔

جب وہ ناشتہ کھانے میں مصروف تھیں، امی نے کہا: "باغ میں ایک عجیب قسم کا کتا پھر رہا ہے۔ وہ صبح سے پرانی باڑ کے قریب کچھ سونگھتا پھر رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ تمہیں کوئی اندازہ ہے؟"

"ہاں!" اس کے منہ سے نکل گیا لیکن اسے فوراً ہی پچھتاوا ہونے لگا کہ یہ اس نے کیا کہہ دیا۔

"یہ پہلے بھی کبھی یہاں آیا تھا؟"

لیکن سوفی اپنی اماں کی بات سننے سے پہلے ہی میز سے اٹھ چکی اور نشست گاہ کی کھڑکی میں سے، جو بڑے باغ کی طرف کھلتی تھی، باہر جھانکنے کے لیے جا چکی تھی۔ جو کچھ اس نے دیکھا وہ بالکل وہی تھا جو اس نے سوچا تھا۔

ہرمیز اس کے خفیہ ٹھکانے کے اندر جانے کے راستے پر لیٹا ہوا تھا۔

"اب میں کیا کہوں؟" اسے کچھ سوچنے کا موقعہ ہی نہ ملا کیونکہ اس کی امی پہنچ چکی اور اس کے برابر کھڑی ہو گئی تھی۔

"تم نے یہی کہا تھا کہ یہ پہلے بھی یہاں آچکا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس نے یہاں کوئی ہڈی وڈی دبا رکھی ہو گی اور اب اپنا خزانہ ڈھونڈنے چلا آیا ہو گا۔ کتوں کی بھی یادداشت ہوتی ہے۔۔۔"

"سوفی، تم شاید ٹھیک ہی کہتی ہو۔ ہمارے خاندان میں جانوروں کی نفسیات کی ماہر تمہیں تو ہو۔"

سوفی گھبراہٹ میں تیزی سے سوچنے لگی۔

"میں اسے اس کے گھر چھوڑ آتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"پھر تمہیں معلوم ہے یہ کہاں رہتا ہے؟"

سوفی نے اپنے کندھے اچکا دئے۔

"شاید اس کے پٹے پر پتا لکھا ہو۔"

دو منٹ بعد سوفی باغ میں پہنچ گئی۔ جب ہرمیز کی نظر اس پر پڑی ' وہ بے ڈھب انداز میں اس کی طرف لپکا۔ وہ اپنی دم ہلا رہا اور اس سے لپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہرمیز ' اچھے بچے!" سوفی نے کہا۔

اسے معلوم تھا کہ اس کی امی کھڑکی میں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ کتا باڑ میں سے گزرنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن کتا گھر کے سامنے بجری بچھے راستے کی طرف دوڑنے لگا ' اس نے باہر کا صحن عبور کیا اور گیٹ کی طرف چھلانگ لگا دی۔

جب وہ اپنے پیچھے پھاٹک بند کر چکے ' ہرمیز سڑک پر بھاگنے لگا۔ وہ سوفی سے چند قدم آگے تھا۔ راستہ طویل تھا ' لیکن صبح کی سیر کے لیے نکلنے والے صرف ہرمیز اور سوفی نہیں تھے۔ پورے پورے خاندان سیر و تفریح پر جا رہے تھے۔ سوفی کو حسد کی ٹیسیں محسوس ہونے لگیں۔

وقتاً فوقتاً ہرمیز اچھلتا کودتا خاصا آگے نکل جاتا اور کسی کتے یا کسی باغ کی باڑ میں کسی دلچسپ چیز کو سونگھنے لگتا۔ لیکن جونہی سوفی اسے پکارتی ' "نوجوان ' ادھر!" وہ جھٹ پٹ واپس آ جاتا۔

انہوں نے ایک قدیمی چراگاہ ' ایک مختلف کھیلوں کا وسیع و عریض میدان اور ایک عام کھیل کا میدان عبور کیا اور ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں ٹریفک کا ہجوم تھا۔ اب وہ جس سڑک پر جا رہے تھے ' وہ بہت چوڑی تھی ' پرانے انداز میں گول پتھروں سے بنی ہوئی تھی ' اس پر ٹرامیں چل رہی تھیں اور سیدھی سٹی سنٹر کی طرف جاتی تھی۔ ہرمیز راستہ بتانے کے انداز سے آگے آگے جا رہا تھا۔ وہ ٹاؤن سکوائر میں سے گزرے اور چرچ سٹریٹ پر پہنچ گئے۔ یہاں وہ پرانے شہر میں داخل ہو گئے۔ اس علاقے کے بھاری بھرکم کثیر المنازل بے آب و تاب مکانات پچھلی صدی کے اختتام پر یا اس صدی کے آغاز میں تعمیر کئے گئے تھے۔ اب تقریباً ڈیڑھ بج چکا تھا۔

وہ شہر کی دوسری سمت آ چکے تھے۔ سوفی اس طرف زیادہ نہیں آئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ ' جب وہ ابھی ننھی منی بچی تھی ' اسے کسی خالہ یا پھوپھی سے

ملانے انہی میں سے کسی گلی میں لایا گیا تھا۔

آخر کار وہ متعدد مکانوں کے بیچ ایک چھوٹے سے چوک میں پہنچ گئے۔ اگرچہ یہ نظر تو بہت پرانا آتا تھا لیکن اس کا نام نیا چوک تھا۔ لیکن یہ بھی تو تھا کہ پورے کا پورا شہر ہی پرانا تھا۔ اس کی بنیاد صدیوں پہلے قرون وسطیٰ کے دوران میں رکھی گئی تھی۔

ہرمیز چلتے چلتے مکان نمبر 14 کے سامنے رک گیا اور سوفی کے دروازہ کھولنے کا انتظار کرنے لگا۔ سوفی کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔

سڑک کے سامنے کے دروازے کے اندر چوبی تختے کے ساتھ اوپر نیچے متعدد ڈاک ڈبے لٹک رہے تھے۔ سوفی کو سب سے اونچی قطار کے ایک ڈبے پر ایک پوسٹ کارڈ لٹکتا نظر آیا۔ اس کے اوپر ڈاکیے نے مہر لگا دی تھی کہ مکتوب الیہ کا پتا معلوم نہیں۔

خط پر مکتوب الیہ کا پتا ہلڈے مولر کنیگ نمبر 14 نیو سکوائر درج تھا۔ اس پر 15 جون کی مہر ثبت تھی۔ پندرہ جون میں ابھی دو ہفتے باقی تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکیے کا اس پر کوئی دھیان نہیں گیا تھا۔

سوفی نے کارڈ اتار لیا اور پڑھنے لگی:

ڈیر ہلڈے، اب سوفی فلسفی کے گھر آرہی ہے۔ چند دنوں میں وہ پندرہ سال کی ہوجائے گی، لیکن تم کل پندرہ سال کی ہوگئی تھیں۔ یا ہلڈے، کہیں مجھے غلطی تو نہیں لگی، تم پندرہ کی آج تو نہیں ہوئیں؟ اگر تم آج پندرہ کی ہوئی ہو، پھر کچھ تاخیر ہوگئی ہوگی۔ لیکن ہماری گھڑیاں ہمیشہ یکساں وقت نہیں بتاتیں۔ جب ایک نسل آگے آتی ہے، دوسری بوڑھی ہوچکی ہوتی ہے۔ دریں اثنا تاریخ اپنا سفر طے کرتی رہتی ہے۔ تم نے کبھی سوچا کہ یورپ کی تاریخ انسانی زندگی کے مشابہ ہے۔ عہد عتیق یورپ کے بچپن کے مانند ہے۔ پھر کبھی نہ ختم ہونے والے قرون وسطیٰ شروع ہوجاتے ہیں —— انہیں یورپ کے مدرسے کے ایام کہا جاسکتا ہے۔ لیکن آخر کار نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوجاتا ہے اور مدرسے کے طویل ایام اختتام پذیر ہوجاتے ہیں۔ یورپ میں زندگی کی امنگ پیدا ہوگئی ہے اور وہ نئے ولولے اور جوش کے ساتھ شباب کی

دہلیز پر قدم رکھ دیتا ہے ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ یورپ کی پندرھویں سال گرہ ہے ! میری بیٹی ' یہ جون کا وسط ہے اور بقید حیات ہونا کتنا شاندار احساس ہے!

پس نوشت : مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمہاری طلائی صلیب کھو گئی ہے ۔ تمہیں اپنی اشیا کو بہتر انداز سے سنبھال کر رکھنے کا سلیقہ سیکھنا چاہیے ۔ پیار ۔ پاپا ـــــ جو تمہارے بالکل قریب ہے ۔

ہرمیز پہلے ہی سیڑھیاں پھلانگنے لگا تھا ۔ سوفی پوسٹ کارڈ پکڑے اس کا پیچھا کرنے لگی ۔ اس کا ساتھ نبھانے کے لیے اسے دوڑنا پڑ رہا تھا ' وہ مسرت کے عالم میں زور زور سے اپنی دم ہلا رہا تھا ۔ وہ دوسری ' تیسری اور چوتھی منزل عبور کر گئے ۔ وہاں اب صرف ایٹک (Attic) کی سیڑھیاں تھیں ۔ " کیا ہمیں چھت پر جانا ہوگا ؟ "سوفی نے سوچا ۔ ہرمیز سیڑھیاں چڑھ گیا وہ ایک تنگ دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اسے اپنے پنجے سے کھرچنے لگا ۔

سوفی کو اندر سے اپنی طرف آتے قدموں کی چاپ سنائی دی ۔ دروازہ کھلا اور وہاں البرٹو کنوکس کھڑا تھا ۔ وہ اپنے روزمرہ کے کپڑے تبدیل کر چکا اور کسی اور عہد کا لباس پہن چکا تھا جو تنگ پاجامے سے ملتی جلتی پتلون ' گھٹنوں تک پہنچنے والی سرخ برجس اور زرد رنگ کے پھولے کوٹ پر ' جس کے کندھوں میں روئی یا اون بھری ہوئی تھی ' مشتمل تھا ۔ اسے دیکھ کر سوفی کو تاش کا جوکر یاد آ گیا ۔ اگر وہ کوئی بڑی غلطی نہیں کر رہی تھی ' تو یہ نشاۃ ثانیہ کے عہد کا مخصوص لباس تھا ۔

" کیا مسخرے بنے ہوئے ہیں !" سوفی کے منہ سے بے اختیار نکلا ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسے ایک طرف دھکیل دیا تاکہ وہ خود فلیٹ کے اندر جا سکے ۔

اس نے ایک بار پھر اپنے خوف اور شرمیلے پن سے چھٹکارا اپنے بدقسمت فلسفی کے استاد کو اپنی تضحیک کا نشانہ بنا کر حاصل کیا ۔ سوفی کو نیچے ہیش والان میں جو پوسٹ کارڈ ملا تھا ' اس نے اس کے خیالات میں ہیجان برپا کر دیا تھا ۔

" بیٹی ' ذرا شانت ہو جاؤ ۔ " البرٹو نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ۔

" اور یہ رہی ڈاک ۔ " سوفی نے کچھ اس انداز سے پوسٹ کارڈ اس کے حوالے

کرتے ہوئے کہا جیسے وہ اس کا ذمے دار اسے ٹھہرا رہی ہو۔

البرٹو نے اسے پڑھا اور ناپسندیدگی سے اپنا سر ہلانے لگا۔

"اس کی دیدہ دلیری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر وہ ہماری آڑ میں اپنی بیٹی کی سالگرہ پر اسے کسی قسم کی تفریح بہم پہنچانا چاہتا ہے تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہو گی۔"

اس نے اتنا کہا اور اس کے ساتھ ہی پوسٹ کارڈ پرزے پرزے کر دیا۔ پھر اس نے یہ پرزے ردی کی ٹوکری میں پھینک دئے۔

"اس میں لکھا ہوا ہے کہ ہلڈے نے اپنی صلیب، جس پر مسیح کی تصویر کندہ ہے، گنوا دی ہے۔" سوفی نے کہا۔

"میں پڑھ چکا ہوں۔"

"اور مزے کی بات یہ ہے کہ بالکل یہی مجھے اپنے گھر میں تکیے کے نیچے ملی۔ آپ بتا سکتے ہیں یہ وہاں کیسے پہنچی؟"

البرٹو گھمبیر انداز سے اس کی نگاہوں میں جھانکنے لگا۔

"اسے اس میں ضرور کوئی کشش نظر آئی ہو گی۔ مگر یہ بڑا سستا حربہ ہے، اس پر اسے قطعاً کوئی زور نہیں لگانا پڑا ہو گا۔ چھوڑو اس قصے کو، ہمیں اپنی توجہ عظیم سفید خرگوش پر مرکوز کرنا چاہیے جسے کائنات کے ٹاپ ہیٹ سے باہر نکالا گیا تھا۔"

وہ نشستی کمرے میں چلے گئے۔ سوفی نے اتنا غیر معمولی کمرا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

البرٹو خاصے وسیع اینک فلیٹ میں، جس کی دیواریں ڈھلوان تھیں، رہتا تھا۔ دیوار کے روشن دان میں سے آسمان سے روشنی سیدھی کمرے کے اندر آ رہی اور اسے منور کر رہی تھی۔ اس میں ایک کھڑکی بھی تھی جس کا رخ شہر کی جانب تھا۔ اس کھڑکی میں سے سوفی کو پرانے شہر کی تمام چھتیں نظر آ رہی تھیں۔

لیکن جس چیز نے سوفی کے اوسان خطا کر دئے وہ وہ سامان تھا جس سے کمرا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ـــــ یہ سامان تاریخ کے مختلف ادوار کے فرنیچر اور دیگر متنوع اشیا پر مشتمل تھا۔ تیس کی دہائی کا ایک صوفا تھا، شروع صدی کی ایک پرانی ڈیسک تھی اور ایک کرسی تھی جو صدیوں پرانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن وہاں محض فرنیچر ہی نہیں تھا۔ شیلفوں (shelves) اور خانے دار الماریوں میں قدیم کارآمد یا آرائشی اشیا کے بے ترتیب

ڈھیر لگے ہوئے تھے ۔ ان میں پرانے کلاسک اور آرائشی ظروف (vases) ' باون دستے اور قرنبیقیں (retorts) ' چاقو اور گڑیائیں ' پرندوں کے پروں کے قلم اور کتب سہارے (bookends) ' آلات سدس اور ثمن (octants and sextants) ' قطب نما اور بیرومیٹر شامل تھے ۔ ایک پوری دیوار کتابوں سے پٹی ہوئی تھی ' مگر یہ وہ کتابیں نہیں تھیں جو اکثر کتابوں کی دکانوں پر ملتی ہیں ۔ سینکڑوں سالوں کے دوران میں جو کتابیں شائع ہوئی تھیں ' کتابوں کے ذخیرے میں ان کے نادر و نایاب نسخے موجود تھے ۔ دوسری دیواروں پر ڈرائنگز اور پینٹنگز لٹک رہی تھیں ۔ ان میں سے بعض حالیہ دہائیوں کی تھیں لیکن بیشتر بے حد قدیم تھیں ۔ دیواروں پر ان گنت چارٹ اور نقشے بھی موجود تھے ' اور جہاں تک ناروے کا تعلق ہے ' اس کے نقشے کوئی خاص صحیح نہیں تھے ۔

سوفی چند منٹ بالکل ساکت و صامت کھڑی رہی اور ان تمام اشیا کی اہمیت سمجھنے کی کوشش کرتی رہی ۔

بالآخر اس سے رہا نہ گیا اور اس نے منہ پھٹ انداز سے پوچھا : " آپ نے کتنا کاٹھ کباڑ اکٹھا کر رکھا ہے ! "

" بس بس ! ذرا سوچو میں نے کتنی صدیوں کی تاریخ اس کمرے میں محفوظ کر دی ہے ۔ صحیح پوچھو تو میں اسے کاٹھ کباڑ نہیں کہوں گا ۔ "

" آپ نے کوئی نوادرات کی دکان کھول رکھی ہے ؟ "

البرٹو کے چہرے بشرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے سوفی کے انداز گفتگو سے دکھ پہنچا ہے ۔

"سوفی ' ہم اپنے آپ کو تاریخ کی طوفانی موجوں میں غرقاب ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے ۔ ہم میں سے چند ایک کو ذرا رک جانا چاہیے تاکہ دریاؤں کے کناروں پر جو بچی کھچی اشیا رہ گئی ہیں انہیں اکٹھا کیا جاسکے ۔ "

" آپ کیسی عجیب باتیں کر رہے ہیں ! "

" لیکن ' بیٹی ' جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ہے درست ۔ ہم محض اپنے عہد ہی میں نہیں رہتے ' ہم اپنے ساتھ اپنی تاریخ بھی اٹھائے ہوتے ہیں ۔ یہ مت بھولو کہ اس کمرے میں جو اشیا تم دیکھ رہی ہو وہ کبھی نئی نکور تھیں ۔ وہ چوبی گڑیا شاید کسی پانچ سالہ بچی کی سال گرہ پر بنائی گئی تھی ' ممکن ہے یہ اس کے دادا نے بنائی ہو . . . پھر وہ نوخیز دوشیزہ بن گئی اور اس کے بعد وہ بھرپور جوانی کے عہد میں داخل ہوگئی اور اس

نے شادی کرلی ۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی اپنی کوئی بیٹی ہو اور اس نے یہ گڑیا اسے دے دی ہو ۔ پھر وہ بوڑھی ہوگئی اور ایک روز انتقال کرگئی ۔ اگرچہ اس نے خاصی لمبی عمر پائی' اسے بہرحال مرنا تھا' وہ مرگئی اور دنیا کے منظر سے اوجھل ہوگئی ۔ اور وہ کبھی واپس نہیں آئے گی ۔ وہ درحقیقت صرف مختصر مدت کے لیے یہاں آئی تھی ۔ لیکن اس کی گڑیا ـــــ وہ خیر' یہاں شیلف پر پڑی ہے ۔"

"آپ جب اس قسم کی گفتگو کرتے ہیں' ہر چیز کتنی غم ناک اور سنجیدہ نظر آنے لگتی ہے ۔"

"زندگی غم ناک بھی ہے اور سنجیدہ بھی ۔ ہمیں ایک شاندار اور دل فریب دنیا میں داخل کرلیا جاتا ہے ۔ ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں' ایک دوسرے سے علیک سلیک کرتے ہیں ـــــ اور ایک مختصر لمحے کے لیے اکٹھے گھومتے پھرتے ہیں ۔ پھر ہم ایک دوسرے کو کھو دیتے ہیں اور پھر جس اچانک اور غیر معقول انداز سے آئے ہوتے ہیں' اسی سے غائب ہوجاتے ہیں ۔"

"میں کچھ پوچھ سکتی ہوں؟"

"اب ہم مزید آنکھ مچولی نہیں کھیل رہے ۔"

آپ نے میجر کی کٹیا میں رہائش کیوں اختیار کی تھی؟"

"اس لیے کہ جب ہم ایک دوسرے سے محض خطوط کے ذریعے باتیں کررہے تھے' ہم ایک دوسرے سے زیادہ دور نہ ہوں ۔ مجھے معلوم تھا کہ قدیم کٹیا خالی ہوگی ۔"

"چنانچہ آپ وہاں منتقل ہوگئے؟"

"ٹھیک ۔ میں وہاں منتقل ہوگیا ۔"

"پھر آپ شاید بتا سکیں کہ بڈے کے باپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ وہاں رہتے ہیں؟"

"اگر میری بات درست ہے تو اسے ظاہر بات کا علم ہے ۔"

"لیکن میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ آپ نے کسی ڈاکیے کو کیسے منا لیا کہ وہ جنگل کے عین درمیان میں ڈاک پہنچا دیا کرے؟"

البرٹ نے گھٹ انداز سے مسکرا دیا ۔

"اس قسم کی باتیں بھی بڈے کے باپ کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں ۔ سیدھا سادھا بھومنتر یا ہاتھ کی صفائی ۔ ہم ایک ایسے نظام کے تحت زندگی بسر کررہے ہیں

جسے غالباً دنیا کا مضبوط ترین اکرائی کا انعام کہا جا سکتا ہے۔"

سوفی کو محسوس ہوا کہ اسے غصہ آرہا ہے۔

"اگر وہ کبھی مجھے مل جائے 'میں اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالوں گی!"

البرٹو آگے بڑھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ سوفی اس کے پیچھے پیچھے آئی اور ایک آرام کرسی میں دھنس گئی۔

"صرف فلسفہ ہمیں بلڈے کے باپ کے قریب لا سکتا ہے۔" البرٹو نے بالآخر کہا"۔ آج میں تمہیں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے متعلق بتاؤں گا۔"

"پھر شروع ہو جائیں۔"

"سینٹ ٹامس ایکوائنس کے انتقال کو کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ عیسائیت کو متحد رکھنے والی ثقافت میں دراڑیں پڑنا شروع ہوگئیں۔ سائنس اور فلسفہ کلیسا کی دینیات سے دور سے دور تر ہوتے چلے گئے۔ اور یوں انہوں نے مذہبی زندگی کو استدلال کے ساتھ نسبتاً زیادہ آزاد ناتا جوڑنے میں مدد دی۔ ایسے لوگوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا جو زور دے کر کہتے تھے کہ خدا تک عقلیت کے ذریعے رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی کیونکہ خدا ہر لحاظ سے انسانی فہم و ادراک سے ماورا ہے۔ انسان کے لیے اہم ترین بات یہی ہے کہ وہ الوہی راز کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ خدا کی مشیت کے آگے سینہ سپر ہو جائے۔

اب چونکہ مذہب اور سائنس نسبتاً زیادہ آزادی سے ایک دوسرے سے رشتہ جوڑ سکتے تھے، نئے سائنسی طریقوں اور نئے مذہبی جوش و خروش دونوں کے لیے رستہ کھل گیا۔ چنانچہ پندرھویں اور سولہویں صدی کے دو طاقتور انقلابات ___ یعنی نشاۃ ثانیہ یا تحریک احیائے علوم اور تحریک اصلاح مذہب (Reformation) ___ کی بنیادیں وجود میں آگئیں۔"

"ان پر ایک ایک کرکے گفتگو کرنا بہتر نہیں ہوگا؟"

"نشاۃ ثانیہ سے ہماری مراد اس قابل قدر اور پرشکوہ ثقافتی ترقی سے ہے جس کا آغاز چودھویں صدی کے اواخر میں ہوا۔ اس تحریک کی ابتدا شمالی اٹلی سے ہوئی اور پھر پندرھویں اور سولہویں صدی کے دوران میں تیزی سے یورپ کے شمالی ممالک کی طرف پھیلنے لگی۔"

"آپ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ 'نشاۃ ثانیہ' کا مطلب 'احیائے نو' ہے؟"

"میں نے واقعی یہی بتایا تھا لیکن جس چیز کا احیائے نو ہونا تھا، وہ عہد عتیق کا آرٹ اور کلچر تھا۔ ہم نشاۃ ثانیہ کی 'انسان دوستی' (humanism) کا بھی ذکر کرتے ہیں کیونکہ قرون ظلمت کے طویل دور کے بعد، جس میں زندگی کے ہر پہلو کو الوہی روشنی میں دیکھا جاتا تھا، اب ایک بار پھر زندگی انسان کے گرد گھومنے لگی تھی۔ 'ماخذ کی طرف چلو۔' یہ (اس زمانے کا) ماٹو (motto) تھا اور اس کا اولین اور اہم ترین مطلب عہد عتیق کی انسان دوستی تھا۔

"جس طرح یونانی زبان سیکھنا فیشن بن گیا تھا، اسی طرح قدیم مجسموں اور مخطوطوں کی تلاش کرنا تقریباً مقبول عام تفریح بن گیا۔ یونانی انسان دوستی کے مطالعے کا تدریسی مقصد بھی تھا۔ انسان دوست مضامین کے مطالعے سے 'کلاسیکی تعلیم' حاصل ہوتی تھی اور اس سے ان چیزوں کو، جنہیں انسانی اوصاف کہا جاسکتا ہے، جلا ملتی تھی۔ کہا یہ جانے لگا: 'گھوڑے پیدا ہوتے ہیں، لیکن انسان پیدا نہیں ہوتے، بنائے جاتے ہیں۔'"

"انسان بننے کے لیے ہمارا تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے؟"

"ہاں، تصور یہی تھا۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کی انسان دوستی کا قریب سے جائزہ لینے سے پہلے ہمیں نشاۃ ثانیہ کے سیاسی اور ثقافتی پس منظر کے متعلق چند باتیں کرنا ہوں گی۔"

البرٹو صوفے سے اٹھا اور کمرے میں بے مقصد ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگا۔ کچھ دیر وہ رکا اور اس نے شیلف پر پڑے کسی قدیمی آلے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ کیا ہے؟"

"کوئی پرانا قطب نما معلوم ہوتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔"

پھر اس نے کسی پرانے آتشیں ہتھیار کی طرف اشارہ کیا جو صوفے کے اوپر دیوار پر لٹک رہا تھا۔

"اور وہ؟"

"کوئی پرانی وضع کی رائفل۔"

"بالکل صحیح ــــــ اور یہ؟"

البرٹو نے ایک شیلف سے لمبی چوڑی کتاب اٹھائی۔

"کوئی پرانی کتاب۔"

"اگر بالکل صحیح لفظ استعمال کیا جائے تو یہ incunabulum ہے۔"

"_incunabulum?"

"دراصل اس کے معانی 'پالنا' یا 'پنگورا' ہیں۔ یہ لفظ ان کتابوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو طباعت کے 'پالنے' کے ایام کے دوران میں چھپی تھیں۔ یعنی 1500ء سے پہلے۔"

"یہ واقعی اتنی پرانی ہے؟"

"ہاں، اتنی پرانی۔ یہ تینوں ایجادات ــــــ قطب نما، آتشیں اسلحہ اور چھاپہ خانہ ــــــ اس نئے دور کی، جسے ہم نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں پیشگی شرائط تھیں۔"

"آپ کو اپنی بات کی ذرا مزید وضاحت کرنا ہو گی۔"

"قطب نما سے جہاز رانی آسان ہوگئی۔ دوسرے الفاظ میں یہ دریافت کے عظیم سفروں کی بنیاد تھی۔ ایک لحاظ سے یہی بات آتشیں اسلحہ پر صادق آتی ہے۔ اگرچہ آتشیں اسلحہ نے یورپ میں بھی اہم عنصر کی حیثیت اختیار کر لی لیکن ان نئے ہتھیاروں کا اصل فائدہ یہ ہوا کہ اہل یورپ کو ایشیائی اور امریکی ثقافتوں پر تفوق حاصل ہوگیا۔ چھاپے خانوں نے نشاۃ ثانیہ کے دور کے انسان دوست فلسفیوں اور مفکروں کے نئے خیالات کو وسیع پیمانے پر پھیلانے میں مدد دی۔ اور جن عناصر نے کلیسا کو اشاعت علم کی اجارہ داری سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا، ان میں طباعت کا ہاتھ کم نہیں تھا۔ اس کے بعد نئی نئی ایجادات اور آلات بڑی تیزی سے اور کثرت سے وجود میں آنے لگے۔ مثلاً ایک اہم اوزار دوربین (3) تھا۔ اس ایجاد کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ فلکیات بالکل ہی نئی بنیادوں پر استوار ہونے لگی۔"

"اور آخر میں راکٹ بنائے گئے اور خلائی تحقیقات شروع ہوگئیں۔"

"تم کچھ زیادہ ہی تیز جا رہی ہو۔ تاہم تم اتنا ضرور کہہ سکتی ہو کہ جو عمل نشاۃ ثانیہ کے دوران میں شروع ہوا تھا، اس نے آخر کار انسان کو چاند پر پہنچا دیا۔ یا اس کا مطلب یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ اس کا نتیجہ ہیروشیما اور چرنوبل کی صورت میں برآمد ہوا۔ تاہم یہ سارا سلسلہ ثقافتی اور معاشی محاذ پر تبدیلیوں سے شروع ہوا۔ اس ضمن میں اہم بات یہ ہوئی کہ گزارے کی معیشت کو مالیاتی معیشت میں تبدیل کر دیا گیا۔ پہلے یورپ کی اکثر معیشتوں کا یہ حال تھا کہ کھیتوں کھلیانوں میں صرف اتنا ہی پیدا ہوتا تھا کہ اپنے

لوگوں کی بنیادی ضروریات بمشکل پوری ہوتی تھیں لیکن قرون وسطیٰ کے اختتام پر شہر پھیلنے لگے، نئے نئے پیشے وجود میں آنے لگے، نت نئی اشیا بننے اور ان کی تجارت ہونے لگی، عام اشیا کی تجارت بھی فروغ پانے لگی، بنک قائم ہونے لگے اور مالیاتی معیشت (monetary economy) کا ڈھانچہ استوار ہونے لگا۔ ان نئے حالات میں درمیانہ طبقہ ابھرنے لگا جس نے زندگی کی بعض بنیادی شرائط کے معاملے میں ایک حد تک آزاد روی کا مظاہرہ کیا۔ ضروریات ایسی اشیا بن گئیں جنہیں روپے کے عوض خریدا جاسکتا تھا۔ حالات نے جو یہ صورت اختیار کی، تو لوگوں کو اپنی محنت، اپج اور تخیل کا صلہ ملنے لگا۔ اب فرد سے نت نئی توقعات باندھی جانے لگیں۔"

"یہ تقریباً اسی طرح ہے جس طرح دو ہزار سال قبل یونانی شہروں نے ترقی کی تھی۔"

"تمہاری بات بالکل ہی غیر صحیح نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یونانی فلسفے نے کس طرح دنیا کی اساطیری تصویر سے جو کسان ثقافت کے ساتھ منسلک تھی، اپنا ناتا توڑا تھا۔ اسی طرح قرون وسطیٰ کے دور کا درمیانی طبقہ جاگیردار نوابوں اور کلیسا کی طاقتوں کے شکنجے سے آزاد ہونے لگا۔ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، ہسپانیہ کے عربوں اور مشرق میں بازنطینی ثقافت کے علم برداروں کے ساتھ قریبی روابط کی وساطت سے یونانی ثقافت کی بازیافت کا عمل بھی پوری رفتار سے جاری تھا۔"

"عہد عتیق کی تین ندیاں، جو مختلف سمتوں میں بہنے لگے تھیں، ایک بار پھر اکٹھی ہوگئیں اور انہوں نے عظیم دریا کی صورت اختیار کرلی۔"

"تم بہت پرتوجہ شاگرد ہو۔ اب تک جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے، اس سے تمہیں نشاۃ ثانیہ کا کچھ پس منظر فراہم ہوگیا ہے۔ اب میں تمہیں نئے خیالات کے متعلق چند باتیں بتاؤں گا۔"

"بہت اچھا۔ لیکن مجھے گھر جانا اور کھانا کھانا ہے۔"

البرٹو دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے سوفی کی طرف دیکھا۔

"سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ نشاۃ ثانیہ کا نتیجہ بنی نوع انسان کے متعلق ایک بالکل نئے نقطہ نظر کی شکل میں برآمد ہوا۔ قرون وسطیٰ کے دوران میں بڑی شدومد سے اور متعصبانہ انداز سے اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ انسان فطرتاً گنہگار ہے۔ اس کے برعکس نشاۃ ثانیہ کے دور کی انسان دوستی نے انسان اور اس کی قدر و قیمت میں نیا ایقان

پیدا کر دیا ۔ انسان اب بے پایاں طور پر عظیم اور قابل قدر سمجھا جانے لگا ۔ نشاۃ ثانیہ کے عہد کی ایک مرکزی شخصیت مارسیلیوفت چینو (4) تھی ۔ وہ پکار پکار کر کہتا رہتا تھا : ' انسانی بھیس میں الوہی نسبت رکھنے والے ' اپنے آپ کو پہچان ! ' ایک اور مرکزی شخصیت پیکو دیلا میران دولا (5) تھی ۔ اس نے ' انسانی وقار پر خطبہ ' (Oration on the Dignity of Man) کے نام سے ایک کتاب تحریر کی تھی ۔ عنوان سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے دوران میں اس قسم کی کتاب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا ' لکھنا تو دور کی بات ہے ۔

" قرون وسطیٰ کے سارے عہد کے دوران میں نقطہ آغاز ہمیشہ خدا ہوتا تھا ۔ نشاۃ ثانیہ کے انسان دوستوں نے خود انسان کو اپنا نقطہ آغاز بنایا ۔ "

" یہی یونانی فلسفیوں نے کیا تھا ۔ "

" بالکل یہی وجہ ہے کہ ہم عہد عتیق کی انسان دوستی کے ' احیائے نو ' کی بات کرتے ہیں ۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کی انسان دوستی کا اس سے بھی بڑا وصف اس کا (انسان کی) انفرادیت پر زور تھا ۔ ہم محض انسان ہی نہیں ' ہم فقید المثال افراد ہیں ۔ یہ تصور عبقری اور عبقریت کی بے قید پرستش کی طرف لے جاسکتا ہے ۔ (ان کی نگاہوں میں) مثالی شخص وہ بن گیا جسے ہم نشاۃ ثانیہ کا انسان ـــــ ہمہ گیر عبقریت کا مالک شخص ' جو اپنی ذات میں زندگی ' آرٹ اور سائنس کے تمام پہلو سموئے ہوئے ہوتا تھا ـــــ کہتے ہیں ۔ اس نئے نقطہ نظر کا اظہار اس دلچسپی سے بھی ہوتا ہے جو علم تشریح الاعضاء (human anatomy) میں لی جاتی تھی ۔ یہ دریافت کرنے کے لیے کہ انسانی جسم کی ساخت کیسے ہوئی ہے ' عہد عتیق کی طرح ایک بار پھر مردہ اجسام کی چیر پھاڑ شروع ہوگئی ۔ یہ طبی سائنس اور آرٹ دونوں کی ضرورت تھی ۔ ایک بار پھر آرٹ کے شاہ کاروں میں برہنہ تصاویر بنانے کا رواج چل پڑا ۔ تاخیر سے ہی سہی لیکن بہرحال ہزار سال کی مصنوعی شرم و حیا کو بالائے طاق رکھنے کا وقت آگیا تھا ۔ انسان میں اب اتنی جرات آگئی تھی کہ وہ جیسا ہے ویسا ہی اپنے آپ کو بنا اور دکھا سکے ۔ اب مزید کسی چیز سے شرمانے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی ۔ "

" یہ باتیں سن کر نشہ آگیا ہے ۔ " سوفی نے چھوٹی میز پر ' جو اس کے اور فلسفی کے مابین پڑی تھی ' اپنے بازو جھکاتے ہوئے کہا ۔

" یقیناً ۔ بنی نوع انسان کے متعلق اس نئے انداز فکر نے سراسر ایک نئے نقطہ

نظر کو جنم دیا۔ (اب کہا جانے لگا کہ) انسان خالصتاً خدا کے لیے موجود نہیں ہے۔ چنانچہ انسان یہاں اور اسی وقت زندگی سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ اور اس نئی آزادی کے ساتھ، جسے آگے بڑھایا جانا تھا، امکانات حدوحساب سے باہر نظر آرہے تھے۔ مقصد تمام حدود کو پھلانگ جانا تھا۔ اگر یونانی انسان دوستی کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے، تو یہ بھی نیا تصور معلوم ہوگا۔ (نشاۃ ثانیہ کے انسان دوستوں کے برعکس) عہدِ عتیق کے انسان دوست سکون (قلب)، میانہ روی اور ضبط پر زور دیتے تھے۔"

"اور نشاۃ ثانیہ کے انسان دوست ضبط (restraint) سے ہاتھ دھو بیٹھے۔"

"وہ یقیناً کوئی خاص طور پر اعتدال پسند یا میانہ رو نہیں تھے۔ ان کا رویہ کچھ اس قسم کا تھا جیسے ساری دنیا ازسرِنو بیدار ہوئی ہو۔ انہیں اپنے عہد کا شدید شعور تھا اور اسی چیز نے انہیں عہدِ عتیق اور اپنے زمانے کی درمیانی صدیوں کا ذکر کرنے کے لیے 'قرونِ وسطیٰ' کی اصطلاح گھڑنے کی ترغیب دی۔ زندگی کے تمام شعبوں میں بے مثال ترقی ہوئی۔ آرٹ اور فنِ تعمیر، ادب، موسیقی، فلسفے اور سائنس کو جو فروغ حاصل ہوا وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں ایک ٹھوس مثال دیتا ہوں۔ ہم قدیم روم کا ذکر کر چکے ہیں جو 'شہروں کا شہر' اور 'کائنات کا مرکز' جیسے خطابات پر اتراتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے دوران میں اس شہر پر ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں اور یہ زوال کا شکار ہو گیا۔ 1417ء کے پہنچتے پہنچتے اس کا یہ حال ہوا کہ اس قدیم دارالسلطنت میں، جو کبھی تجارتی، صنعتی، فنی اور ثقافتی سرگرمیوں کا گڑھ تھا، صرف سترہ ہزار نفوس باقی رہ گئے۔"

"اس لحاظ سے وہ لے سینڈ سے کوئی خاص بڑا نہیں بنتا جہاں ہلڈے رہتی ہے۔"

"نشاۃ ثانیہ کے انسان دوستوں نے روم کی (عظمت کی) بحالی کو اپنا فرض سمجھ کر قبول کیا۔ سب سے پہلا اور بہترین کام انہوں نے یہ کیا کہ انہوں نے پطرس (6) رسول (Peter the Apostle) کے مقبرے کے اوپر عظیم سینٹ پیٹر چرچ (7) کی تعمیر شروع کر دی۔ اور اگر سینٹ پیٹر چرچ کو دیکھا جائے تو اس کی تعمیر میں اعتدال اور ضبط دونوں کا فقدان نظر آئے گا۔ اس کی تعمیر میں نشاۃ ثانیہ کے عہد کے متعدد عظیم آرٹسٹوں نے حصہ لیا تھا۔ دنیا کے اس عظیم ترین تعمیری منصوبے کا آغاز 1506 میں ہوا اور یہ کہیں ایک سو بیس سال بعد مکمل ہوا۔ اور (اس سے ملحق) سینٹ پیٹر چوک کی تعمیر میں مزید پچاس سال صرف ہوئے۔"

"بڑا دیو قامت گرجا ہوگا!"

"یہ دو سو میٹر سے زیادہ لمبا اور ایک سو تیس میٹر بلند ہے۔ اس کا مسقف رقبہ سولہ ہزار مربع میٹر پر محیط ہے۔ خیر' نشاۃ ثانیہ کے انسان کی جرات کا کافی ذکر ہو گیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نشاۃ ثانیہ اپنے ساتھ فطرت کا بھی نیا تصور لایا۔ اس حقیقت نے کہ (اس دور میں) انسان دنیا کو اپنا گھر تصور کرتا تھا اور زندگی کا مقصد محض یہ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ صرف آخرت کی تیاری ہے' طبعی دنیا کے متعلق بالکل نیا انداز فکر پیدا کر دیا۔ فطرت کو اب مثبت چیز گردانا جانے لگا۔ بہت سے لوگ اس خیال کے حامی تھے کہ خدا اپنی تخلیق میں بھی موجود ہوتا ہے۔ (کہا یہ جانے لگا کہ) اگر وہ واقعی 'بے کنار' (infinite) ہے' پھر وہ لازماً ہر چیز میں موجود ہوگا۔ اس تصور کو 'ہمہ اوست' (pantheism) کہا جاتا ہے۔ قرون وسطیٰ کے فلسفیوں کا اصرار تھا کہ خدا اور مخلوق کے مابین ناقابل عبور خلیج حائل ہے۔ اب یہ کہا جا رہا تھا کہ فطرت الوہی ہے ——— بلکہ یہ بھی کہ اس میں 'خدا ہی جلوہ گر' ہے۔ اس قسم کے خیالات کو کلیسا نے کبھی بھی بہ نگاہ ہمدردی نہیں دیکھا تھا۔ گیوردانو برونو (8) کے ساتھ جو کچھ ہوا' وہ کلیسا کے اس رویے کی ڈرامائی مثال پیش کرتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ دعویٰ کرتا تھا کہ خدا فطرت میں موجود ہے بلکہ اس کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ وسعت کے اعتبار سے کائنات لامحدود ہے۔ اپنے خیالات کی وجہ سے اسے سخت سزا ملی۔"

"کیسے؟"

"اسے 1600ء میں روم کی پھول منڈی میں کھمبے کے ساتھ باندھ کر زندہ جلا دیا گیا۔"

"اف کتنی بھیانک... اور احمقانہ حرکت! اور آپ اسے انسان دوستی کہتے ہیں۔"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ انسان دوست برونو کے جلاد نہیں بلکہ برونو تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے دوران میں وہ چیز بھی' جسے غیر انسان دوستی کہتے ہیں' فروغ پا رہی تھی۔ اس سے میری مراد مملکت اور کلیسا کے استبدادی اختیارات ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کے دوران میں جادوگرنیوں کو عدالتوں کے کٹہروں میں کھڑا کرنے' بدعتیوں کو نذر آتش کرنے' مذہب کے نام پر خونی جنگیں برپا کرنے اور امریکہ کی سفاکانہ طور طریقوں سے تسخیر کرنے کا جنون پایا جاتا تھا۔ لیکن انسان دوستی کا ہمیشہ ایک تاریک پہلو بھی رہا ہے۔ کوئی

عہد بھی ایسا نہیں جو خالصتاً اچھا یا خالصتاً برا کہلا سکتا ہے ۔ خیر اور شر دو جڑواں بہنیں ہیں جو انسانی تاریخ میں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں ۔ اور یہ بات اگلی کلیدی ترکیب ' نیا سائنسی طریق کار ' پر ' جو نشاۃ ثانیہ کی ایک اور اختراع ہے اور جس کے متعلق میں ابھی تمہیں بتاؤں گا ' کم صادق نہیں آتی ۔"

"یہ اس زمانے کی بات ہے جب اولین کارخانے تعمیر ہوئے ؟"

"نہیں ' ابھی نہیں ۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کے بعد جو بھی تکنیکی ترقی ہوئی ' اس سب کی اولین شرط یہی سائنسی طریق کار تھا ۔ اس سے میری مراد سائنس کے متعلق بالکل ہی نئے اندازِ فکر کا وجود میں آنا ہے ۔ اس طریقے کے تکنیکی فوائد بعد میں ظاہر ہوئے ۔"

"یہ نیا طریق کار کیا تھا؟"

"یہ زیادہ تر ہمارے اپنے حواس کے ذریعے فطرت کی چھان بین کرنے کا عمل تھا ۔ چودھویں صدی سے ایسے مفکرین کی تعداد بڑھنے لگی تھی جو پرانی اسناد پر ' خواہ ان کی نوعیت مذہبی عقاید تھے ' خواہ ارسطو کا فلسفہ فطرت ' اندھے اعتقاد کے خلاف انتباہ کر رہے تھے ۔ اس قسم کے انتباہ بھی کئے جا رہے تھے کہ یہ مت سمجھو کہ مسائل محض سوچ بچار سے حل کئے جا سکتے ہیں ۔ عقل کی اہمیت پر مبالغہ آرائی سے بھرپور ایقان قرون وسطیٰ کے سارے عہد کے دوران میں جائز سمجھا جاتا رہا تھا ۔ اب' یہ کہا جانے لگا کہ قدرتی مظاہر کی ہر تحقیق لازماً مشاہدے ' ذاتی تجربے (experience) اور عمل میں کئے گئے تجربے (experiment) پر مبنی ہونا چاہیے ۔ ہم اسے ' تجربی ' یا ' عملی ' (empirical) طریق کار کہتے ہیں ۔"

"اس کا مطلب؟"

"اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اشیا کے متعلق آدمی کا علم گرد آلود چرمی کاغذوں پر لکھی ہوئی کتابوں یا من گھڑت باتوں پر نہیں ' بلکہ اس کے اپنے تجربے پر مبنی ہوتا ہے ۔ عہدِ عتیق کے لوگ تجربی سائنس سے واقف تھے لیکن ' منظم تجربے ' (experiments) بالکل نئی چیز تھے ۔"

"میرا قیاس ہے کہ اس زمانے میں اس قسم کا تکنیکی ساز و سامان (apparatus) نہیں تھا جو آج ہمارے پاس ہے ۔"

"یہ درست ہے کہ ان کے پاس نہ کیلکولیٹر تھے اور نہ الیکٹرانک ترازو اور پیمانے (electronic scales) ۔ لیکن ان کے پاس ریاضی تھی اور ان کے پاس ترازو اور پیمانے بھی تھے ۔ لیکن اب سب سے بڑھ کر جس چیز کی ضرورت تھی ' وہ یہ تھی کہ سائنسی مشاہدات کو بالکل صحیح صحیح (precise) ریاضیاتی اصطلاحات میں بیان کیا جائے ۔ 'جو ماپا یا تولا جاسکتا ہے ' اسے ماپو یا تولو ' اورجو ماپا یا تولا نہیں جاسکتا ' اسے ماپ تول کے قابل بناؤ ۔ ' یہ الفاظ اطالوی گیلیو گیلیائی (Galileo Galilei) کے ہیں جو سترھویں صدی کے اہم ترین سائنس دانوں میں شمار ہوتا ہے ۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ فطرت کی کتاب ریاضی کی زبان میں لکھی گئی ہے ۔"

"اور ان تمام تجربوں اور ناپ تول نے نئی ایجادات کو ممکن بنا دیا ۔"

"اولین مرحلہ نیا سائنسی طریق کار تھا ۔ اس نے خود تکنیکی انقلاب کو ممکن بنادیا ' اور تب سے تکنیکی پیش رفت نے ہر ایجاد کی راہ ہموار کردی ہے ۔ تم کہہ سکتی ہو کہ انسان نے اپنے فطری حالات سے دامن چھڑانا شروع کردیا تھا ۔ اب فطرت کوئی ایسی چیز نہیں رہی تھی جس کا انسان محض جزو تھا ۔ 'علم قوت ہے ۔ ' انگریز فلسفی فرانسس بیکن نے کہا تھا اور یوں اس نے علم کی عملی قدرو قیمت اجاگر کردی ____ اور یہ واقعی نئی بات تھی ۔ انسان اب سنجیدگی کے ساتھ فطرت میں مداخلت کرنے اور اسے اپنا مطیع بنانے کا عمل شروع کرچکا تھا ۔"

"لیکن محض اچھے انداز سے نہیں ۔"

"نہیں ۔ یہ وہی بات ہے جس کی طرف میں نے تب اشارہ کیا تھا جب میں نے کہا تھا کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں ' اس میں خیر اور شر کے دونوں پہلو آپس میں گندھے ہوتے ہیں ۔ نشاۃ ثانیہ کے دوران میں جو تکنیکی انقلاب شروع ہوا تھا ' اس کے حیرت انگیز پہلو سامنے آئے ۔ ایک طرف متعدد تکلوں پر مشتمل دھاگا کاتنے کی مشینیں وجود میں آئیں اور دوسری طرف بیکاری پھیلی ۔ اگرنت نئی ادویات دریافت ہوئیں تو نئی سے نئی بیماریاں بھی سر اٹھانے لگیں ۔ زراعت کی استعداد کار میں اضافہ ہوا تو ماحول کا بیڑا بھی غرق ہوا ۔ اگر واشنگ مشین اور ریفریجریٹر جیسے سود مند آلات بنے تو آلودگی اور صنعتی فضلہ بھی ان کی جلو میں آیا ۔ آج ہمیں ماحول کو لاحق جس خطرے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ' اس نے بہت سے لوگوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کردیا ہے کہ تکنیکی انقلاب بذات خود انتہائی خطرناک حد تک فطری حالات کے غیرموافق ہے ۔ اب یہ کہا جارہا ہے کہ ہم نے

ایک ایسی چیز شروع کردی ہے جس پر اب ہم قابو نہیں پاسکتے۔ جو لوگ نسبتاً زیادہ رجائیت پسند ہیں، ان کا خیال ہے کہ ہم ابھی تک ٹیکنالوجی کے 'پالنے' کے ایام میں سے گزر رہے ہیں اور یہ کہ اگرچہ سائنسی عہد کو انہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو بچے کو دانتوں کے نکلنے پر پیش آتی ہیں، ہم بتدریج فطرت پر اس طور قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ نہ اس کے وجود کے لیے اور نہ ہمارے وجود کے لیے کوئی خطرہ رہے گا۔"

"ان دونوں باتوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ شاید ان دونوں ہی نظریات میں کچھ نہ کچھ صداقت ہے۔ ہمیں بعض میدانوں میں فطرت کے ساتھ مداخلت لازماً بند کرنا ہوگی لیکن دوسرے میدانوں میں ہم کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ تاہم ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے: قرون وسطیٰ کا دور لد چکا ہے اور وہ اب کبھی واپس نہیں آسکتا۔ جب سے نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا ہے انسان تخلیق کا محض جزو نہیں رہا، وہ اس سے بہت اوپر اٹھ گیا ہے۔ انسان نے فطرت میں دخل اندازی کا عمل شروع کردیا ہے اور وہ اسے اپنی صورت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور پوچھو تو سچی بات یہ ہے: 'انسان بھی کیا چیز ہے!'"

"ہم تو چاند پر پہلے ہی پہنچ چکے ہیں۔ قرون وسطیٰ کا کون شخص ہوگا جو اس امر کو ممکن سمجھتا ہوگا؟"

"کوئی نہیں۔ تمہاری بات بالکل صحیح ہے۔ اس سے ہمارا دھیان دنیا کے بارے میں نئے نقطہ نظر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ قرون وسطیٰ کے پورے عہد کے دوران میں لوگ آسمان کی چھت کے نیچے کھڑے رہے اور سورج، چاند، ستاروں اور سیاروں کی طرف جھانکتے رہے، لیکن کسی کے دل میں مطلق شبہ نہ ابھرا اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ زمین کائنات کا مرکز ہے۔ انہوں نے لکھوکھہا مشاہدے کئے ہوں گے لیکن انہیں رتی برابر شک نہ ہوا اور وہ یہی تصور کرتے رہے کہ زمین ساکن ہے اور 'اجرام فلکی' اپنے اپنے مدار میں اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ہم اسے 'ارض مرکز عالم کا نقشہ' (geocentric world picture) کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ وہ عقیدہ ہے جس کے مطابق ہر چیز کا مرکز زمین ہے۔ اس عیسائی عقیدے نے بھی کہ خدا اجرام فلکی کے کہیں بہت اوپر (بیٹھا) حکومت کر رہا ہے، اس تصویر عالم کو برقرار رکھنے میں مدد دی۔"

"کاش مسئلہ اتنا ہی سہل ہوتا!"

"لیکن 1543ء میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی ۔ اس کا نام 'فلکی کروں کی گردشوں کے بارے میں' (On the Revolutions of the Celestial Spheres) تھا ۔ اس کا مصنف پولینڈ کا باشندہ نکولاس کوپرنیکس (Copernicus) : (1473 تا 1543) تھا ۔ اس کا انتقال اسی روز ہوا جس روز کتاب شائع ہوئی ۔ کوپرنیکس کا دعوٰی تھا کہ یہ سورج نہیں جو زمین کے گرد گھومتا ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ اس کا خیال تھا کہ جو اجرام فلکی موجود ہیں ' ان کے مشاہدے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے ۔ اس کا کہنا تھا کہ لوگوں کو ہمیشہ جو یہ یقین رہا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے ' اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین اپنے ہی محور پر گھومتی ہے ۔ اس نے اس طرف توجہ دلائی کہ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ زمین اور دوسرے سیارے سبھی سورج کے گرد گھومتے ہیں ' پھر اجرام فلکی کے تمام مشاہدوں کو سمجھنا آسان ہوجائے گا ۔ ہم اسے ' آفتاب مرکز عالم کا نقشہ ' (heliocentric world picture) کہتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کا مرکز سورج ہے ۔"

"کیا یہ عالم کی صحیح تصویر ہے؟"

"پوری طرح تو نہیں ۔ البتہ اس کا اصل نکتہ ـــــ کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے ـــــ صحیح ہے ۔ لیکن اس کا دعوٰی تھا کہ سورج کائنات کا مرکز ہے ۔ آج ہمیں معلوم ہے کہ سورج بے حد وحساب ستاروں میں سے محض ایک ستارہ ہے اور یہ کہ ہمیں اپنے گردوپیش جو ستارے نظر آتے ہیں ' وہ کھربوں کہکشاؤں میں سے صرف ایک کہکشاں ہیں ۔ کوپرنیکس کو یہ بھی یقین تھا کہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد مدور مداروں میں گردش کرتے ہیں ۔"

"تو کیا وہ نہیں کرتے؟"

"نہیں ۔ مدور مداروں میں اپنے یقین کی اساس رکھنے کے لیے اس کے پاس عہد عتیق کے اس تصور کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ اجرام فلکی مدور ہیں اور وہ دائروں میں محض اس لیے گردش کرتے ہیں کیونکہ وہ ' فلکی ' ('heavenly') ہیں ۔ افلاطون کے وقتوں سے کرے اور دائرے جیومیٹری کی اکمل ترین شکلیں تصور کی جاتی رہی تھیں ۔ لیکن سترھویں صدی کے اوائل میں جرمن ماہر فلکیات جوہانس کیپلر (Johannes Kepler) (1571 تا 1630) نے اپنے جامع مشاہدات کے نتائج پیش کئے جن سے ظاہر

ہوا کہ سیارے سورج کو اپنا مرکز بنا کر ہلیلجی یا بیضوی (elliptical or oval) مداروں میں گھومتے ہیں ۔ اس نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ جب کوئی سیارہ سورج کے قریب ترین ہوتا ہے ' اس کی رفتار تیز ترین ہوتی ہے اور یہ کہ کسی سیارے کا مدار سورج سے جتنا زیادہ دور ہوگا ' اس کی رفتار اتنی ہی سست ہوگی ۔ درحقیقت کیپلر سے پہلے کسی بھی شخص کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ دوسرے سیاروں کی طرف زمین بھی محض سیارہ ہے ۔ کیپلر نے اس بات پر بھی زور دیا کہ کائنات میں ہر جگہ طبعی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے ۔"

"اسے یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"کیونکہ اس نے قدیمی توہمات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لانے کی بجائے اپنے حواس سے سیاروں کی گردش کی تحقیق کی تھی ۔ گیلیلو گیلیلائی : (1564 تا 1642) نے بھی ' جو کیپلر کا تقریباً ہم عصر تھا ' اجرام فلکی کا مشاہدہ کرنے کے لیے دوربین استعمال کی تھی ۔ شہاب ثاقب یا دوسرے فلکی مواد کے گرنے سے چاند کی سطح پر جو گڑھے اور شگاف پڑ چکے ہیں ' اس نے ان کا مطالعہ کیا اور کہا تھا کہ چاند کی سطح پر زمین کی طرح پہاڑ اور وادیاں ہیں ۔مزید برآں اس نے دریافت کیا کہ مشتری سیارے کے چار چاند ہیں ۔ چنانچہ چاند صرف زمین کی ملکیت نہیں ' دوسرے سیاروں کے بھی اپنے اپنے چاند ہیں ۔ لیکن گیلیلو کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے انرشیا کا قانون (Law of Inertia) دریافت کیا۔

"اور یہ کیا ہے؟"

"گیلیلو نے اسے اس طرح بیان کیا ہے : جو جسم جس حالت ـــــ ساکن یا متحرک ـــــ میں ہو ' تب تک اسی حالت میں رہتا ہے جب تک کوئی خارجی قوت اسے اپنی حالت تبدیل کرنے پر مجبور نہ کردے ۔"

"آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے ۔"

"مگر یہ بڑا اہم اور معنی خیز مشاہدہ تھا ۔ عہد عتیق سے زمین کے اپنے محور کے گرد گھومنے کے خلاف جو دلائل دئے جاتے رہے تھے ' ان میں سے ایک مرکزی دلیل یہ تھی کہ اگر زمین واقعی اپنے محور کے گرد گردش کرتی ہے ' پھر اس کی رفتار اتنی تیز ہوگی کہ اگر کوئی پتھر فضا میں سیدھا اوپر کی طرف پھینکا جائے تو وہ اس مقام سے ' جہاں سے اسے اوپر پھینکا گیا تھا ' گزوں دور جا گرے گا ۔"

"ایسا ہوتا تو نہیں۔ اس کی وجہ؟"

"اگر تم ریلوے ٹرین میں بیٹھی ہو اور تمہارے ہاتھ سے کوئی سیب نیچے گر پڑتا ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ چونکہ ٹرین حرکت کر رہی ہے' یہ پچھلی جانب گرتا لیکن حقیقت میں وہ گرتا سیدھا نیچے ہے۔ اس کی وجہ انرشیا کا قانون ہے۔ تمہارے اسے گرانے سے پہلے اس کی جو رفتار تھی، تمہارے گرانے کے بعد اس کی وہی رفتار باقی رہی۔"

"میرا خیال ہے کہ میں سمجھ گئی ہوں۔"

"گلیلیو کے زمانے میں ٹرین کا کوئی وجود نہیں تھا۔ لیکن اگر تم کوئی گیند زمین کی سطح کے ساتھ ساتھ لڑھکاؤ ـــــ اور پھر اسے اچانک چھوڑ دو..."

"...یہ لڑھکتا چلا جائے گا..."

"...کیونکہ تمہارے چھوڑنے کے بعد بھی یہ اپنی رفتار برقرار رکھتا ہے۔"

"لیکن اگر کمرا کافی لمبا ہے، یہ بالآخر رک جائے گا۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری قوتیں اس کی رفتار دھیمی کر دیتی ہیں۔ پہلے تو فرش ہی کو لو، خاص طور پر اگر یہ کھردرا چوبی فرش ہو۔ پھر کشش ثقل کی قوت ہے جو اسے جلد یا بدیر روک دے گی۔ لیکن ٹھہرو۔ میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔"

البرٹو کنوکس اپنی نشست سے اٹھا اور قدیمی ڈیسک کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک دراز میں سے کوئی چیز نکالی۔ جب وہ اپنی نشست پر واپس آیا، اس نے یہ چیز کافی کی میز پر رکھ دی۔ یہ محض چوبی تختی تھی۔ اس تختی کا ایک سرا چند ملی میٹر دبیز اور دوسرا پتلا تھا۔ تختی کے قریب، جس نے تقریباً ساری میز گھیر لی تھی، اس نے کانچ کی ایک سبز گولی (marble) رکھ دی۔

"اسے سطح مائل (inclined plane) کہتے ہیں۔ اگر میں اس جگہ سے، جہاں سطح دبیز ترین ہے، گولی چھوڑ دوں، تو تمہارے خیال میں کیا ہو گا؟"

سوفی نے تسلیم و رضا سے آہ بھری۔

"میں دس کراؤن کی شرط لگاتی ہوں کہ یہ لڑھکتی لڑھکتی پہلے میز پر اور پھر وہاں سے نیچے فرش پر گر پڑے گی۔"

"اچھا، دیکھ لیتے ہیں۔"

البرٹو نے گولی چھوڑ دی اور اس نے بالکل وہی رویہ اختیار کیا جس کی سوفی

نے پیشین گوئی کی تھی - یہ میز پر لڑھکی ' وہاں سے نیچے گری اور فرش کے ساتھ جا ٹکرائی ۔ ٹکرانے کی ہلکی سی آواز آئی ' پھر یہ آگے لڑھکی اور دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی ۔

"متاثر کن ۔" سوفی نے کہا ۔

"ہاں ' تھا نا! تم سمجھ گئی ہو گی کہ گیلیلیو نے اسی قسم کا تجربہ کیا تھا ۔"

"وہ واقعی اتنا ہی احمق تھا؟"

"تحمل ' تحمل ! وہ اپنے تمام حواس کی مدد سے تحقیق کرنا چاہتا تھا اور ہم نے تو ابھی آغاز کیا ہے ۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ گولی سطح مائل پر نچلی جانب کیوں لڑھکی؟"

"یہ اس لیے لڑھکنے لگی کیونکہ یہ وزنی تھی ۔"

"بہت اچھا ۔ لیکن بیٹی ' وزن دراصل ہے کیا؟"

"یہ تو بڑا احمقانہ سوال ہے ۔"

"اگر تم جواب نہیں دے سکتیں ' اس کا مطلب یہ نہیں کہ سوال احمقانہ ہے ۔ گولی فرش کی طرف کیوں لڑھکی؟"

"کشش ثقل (gravity) کے سبب ۔"

"بالکل صحیح ـــــ یا تجاذب (gravitation) کے سبب ' کیونکہ ہم اسے یہ نام بھی دیتے ہیں ۔ وزن کا کشش ثقل سے کوئی تعلق ہوتا ہے ۔ یہی وہ قوت تھی جس نے گولی کو متحرک کیا ۔"

البرٹو پہلے ہی فرش سے گولی اٹھا چکا تھا ۔ وہ گولی پکڑے سطح مائل پر جھکا ہوا تھا ۔

"اب میں گولی سطح مائل کے عرض کی ایک جانب سے دوسری جانب لڑھکانے کی کوشش کروں گا ۔" اس نے کہا ۔ "غور سے دیکھتی رہو کہ یہ کیسے حرکت کرتی ہے ۔"

گولی بتدریج قوس بناتے لڑھکی اور جھکاؤ کی جانب پھسلنے لگی ۔ سوفی بغور دیکھتی رہی ۔

"کیا ہوا؟" البرٹو نے پوچھا ۔

"یہ جھکاؤ کے ساتھ ساتھ لڑھکی تھی کیونکہ تختی ڈھلوانی ہے ۔"

"اب میں برش سے گولی پر سیاہی پھیر رہا ہوں . . . پھر شاید ہمیں معلوم ہوسکے گا کہ جھکاؤ کے ساتھ لڑھکنے سے تمہارا مطلب کیا ہے ۔"

اس نے سیاہی پھیرنے والا برش نکالا اور ساری گولی پر سیاہ رنگ کر دیا ۔ اس

کے بعد اس نے اسے دوبارہ لڑھکا دیا۔ اب سوفی دیکھ سکتی تھی کہ گولی سطح پر کہاں کہاں لڑھکی تھی کیونکہ سطح پر سیاہ لکیر بن گئی تھی۔

"گولی نے جو راستہ بنایا ہے، تم اسے کیسے بیان کرو گی؟"

"یہ قوس دار ہے... معلوم ہوتا ہے کہ کسی دائرے کا حصہ ہے۔"

"بالکل صحیح۔"

البرٹو نے نگاہیں اٹھا کر سوفی کی جانب دیکھا اور اپنے ابرو چڑھا لیے۔

"تاہم یہ صحیح معنوں میں دائرہ نہیں، ہم اسے شلجمی لکیر (parabola) کہتے ہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"اخ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر گولی نے بالکل یہی راستہ کیوں اختیار کیا؟"

سوفی پورے انہماک سے غور کرنے لگی۔ پھر اس نے کہا۔ "چونکہ تختی ڈھلوان کی شکل کی ہے، کشش ثقل کی قوت نے گولی کو فرش کی جانب کھینچ لیا۔"

"بالکل، بالکل! یہ سنسنی خیزی سے کم بات نہیں! میں یہاں اپنے اینک میں ایک لڑکی کو، جس کی عمر ابھی پندرہ سال بھی نہیں ہوئی، گھسیٹ لایا ہوں اور وہ عین مین وہی بات سمجھ گئی ہے جو گلیلیو نے ایک ہی تجربے کے بعد سیکھی تھی!"

اس نے تالی بجائی۔ ایک لمحے کے لیے سوفی اس وسوسے میں گرفتار ہوگئی کہ کہیں یہ شخص پاگل تو نہیں ہوگیا۔ تاہم وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا: "تم نے دیکھ لیا کہ جب دو قوتیں بیک وقت ایک ہی چیز پر اثرانداز ہوتی ہیں تو نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ گلیلیو نے دریافت کیا کہ مثلاً اسی بات کا اطلاق توپ کے گولے پر ہوتا ہے۔ گولا فضا میں داغا جاتا ہے، یہ زمین کے اوپر ہی اوپر فضا میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے کہ یہ فضا میں اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتا بلکہ زمین کی طرف کھنچا چلا آئے گا۔ چنانچہ سطح مائل پر گولی نے جس قسم کا راستہ بنایا تھا، اس سے بالکل مماثل خط مرمی (Trajectory) فضا میں توپ کے گولے نے بنایا ہوگا۔ اور گلیلیو کے زمانے میں یہ واقعی نئی دریافت تھی۔ ارسطو نے خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر کوئی غلولہ (projectile) ترچھے انداز سے فضا میں پھینکا جائے، پہلے یہ بتدریج قوس بنائے گا اور پھر عمود بناتا زمین پر آ گرے گا۔ ایسا ہوتا نہیں لیکن جب تک اس کا عملی مظاہرہ کرکے نہ دکھایا گیا، کوئی بھی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ ارسطو بھی غلط ہو سکتا ہے۔"

"کیا یہ سب کچھ واقعی اہم ہے؟"

"اہم ہے؟ شریلہ اہم ہے!! اس کی کائناتی معنویت ہے۔ انسان نے اپنی تاریخ کے دوران میں جتنی بھی دریافتیں کی ہیں' یہ ان سب میں مثبت طور پر اہم ترین ہے۔"

"مجھے یقین ہے آپ مجھے ضرور بتائیں گے کہ آخر یہ اہم ترین کیوں ہے۔"

"پھر انگریز ماہر طبیعیات آئزک نیوٹن منظر عام پر نمودار ہوا۔ وہ 1642 میں پیدا ہوا تھا اور اس نے 1727 میں انتقال کیا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے نظام شمسی اور سیاروی مداروں کی حتمی توضیح پیش کی۔ اس نے نہ صرف یہ بتایا کہ سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں بلکہ اس نے یہ وضاحت بھی کی کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس نے جزوی طور پر یہ کام اس چیز کو استعمال کرکے کیا جسے ہم گلیلیو کی حرکیات (dynamics) کہتے ہیں۔"

"تو کیا سیارے سطح مائل پر کانچ کی گولیاں ہیں؟"

"ہاں' اسی قسم کی کوئی چیز۔ لیکن سوفی' ذرا ٹھہرو۔"

"میں اور کر بھی کیا سکتی ہوں؟"

"کیپلر پہلے ہی اس طرف توجہ دلا چکا تھا کہ لازماً کوئی ایسی قوت ہونا چاہیے جو اجرام فلکی کے ایک دوسرے کی طرف کھنچے جانے کا سبب بنتی ہے۔ مثلاً لازماً ایسی کوئی شمسی قوت ہونا چاہیے جو سیاروں کو مضبوطی سے اپنے مداروں پر قائم رکھتی ہے۔ مزید برآں اس قوت کی موجودگی سے اس بات کی وضاحت بھی ہو جائے گی کہ جب سیارے اپنے سفر کے دوران میں سورج سے دور ہٹ جاتے ہیں' ان کی اپنے محوروں پر رفتار دھیمی کیوں ہو جاتی ہے۔ کیپلر کو یہ بھی یقین تھا کہ جوار بھاٹا ____ سمندر کے پانی کا اتار چڑھاؤ ____ لازماً قمری قوت کا نتیجہ ہو گا۔"

"اور یہ بات صحیح ہے؟"

"ہاں' صحیح ہے۔ لیکن گلیلیو نے کیپلر کے اس نظریے کو مسترد کر دیا تھا۔ وہ کیپلر کا مذاق اڑاتا تھا اور کہتا تھا کہ کیپلر نے اس خیال کو پسندیدگی کی سند عطا کر دی ہے کہ پانی پر چاند کی حکومت ہوتی ہے۔ گلیلیو کیپلر کا مذاق کیوں اڑاتا تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ گلیلیو یہ بات مانتا ہی نہیں تھا کہ کشش ثقل کی قوتیں طویل فاصلوں پر بھی اور اجرام فلکی کے مابین بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔"

"پھر وہ اس معاملے میں غلطی پر تھا؟"

"ہاں ۔ اس خاص نکتے پر اس سے غلطی کا ارتکاب ہوگیا ۔ ویسے یہ بات حقیقتاً ہے بڑی مضحکہ خیز کیونکہ وہ زمین کی کشش ثقل اور اجرام ساقطہ (falling bodies) کے متعلق اکثر سوچتا رہتا تھا ۔ اس نے یہ نشان دہی بھی کردی تھی کہ اضافہ شدہ قوت کس طرح کسی جسم کی حرکت کو اپنا مطیع بنا سکتی ہے ۔"

"لیکن آپ نیوٹن کی بات کر رہے تھے ۔"

"ہاں ' نیوٹن منظر عام پر نمودار ہوا ۔ اس نے وہ ' جسے ہم ' آفاقی کلیہ تجاذب ' (Law of Universal Gravitation) کہتے ہیں ' مرتب کیا ۔ یہ کلیہ بتاتا ہے کہ ہر شے ہر دوسری شے کو ایک ایسی قوت سے اپنی طرف کھینچتی ہے جو اشیا کے حجم کے تناسب سے بڑھ جاتی ہے اور اشیا کے مابین فاصلے کے تناسب سے گھٹ جاتی ہے ۔"

"میرا خیال ہے کہ میں سمجھ گئی ہوں ۔ مثلاً دو چوہوں کی نسبت دو ہاتھیوں کے مابین زیادہ کشش ہوگی ۔ اور ہندوستان میں مقیم ہندوستانی ہاتھی اور افریقہ میں مقیم افریقی ہاتھی کے مابین جو کشش پائی جاتی ہے ' اس کی نسبت ان دو ہاتھیوں کے مابین کشش زیادہ ہوگی جو ایک ہی چڑیا گھر میں مقیم ہوں ۔"

"پھر تم سمجھ گئی ہو ۔ اور اب مرکزی نکتہ آتا ہے ۔ نیوٹن نے ثابت کر دکھایا کہ یہ کشش (attraction) ـــــ یا تجاذب (gravitation) ـــــ آفاقی ہے ۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ہر جگہ ـــــ یہاں تک کہ اجرام فلکی کے مابین خلا میں بھی ـــــ کارفرما ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اسے یہ خیال تب سوجھا جب وہ کسی سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا ۔ جب سیب درخت سے ٹوٹ کر نیچے گرا ' اسے اپنے آپ سے پوچھنا پڑا کہ آیا چاند اسی قوت سے زمین کی طرف کھنچا آتا ہے ۔ اگر وہ زمین کی طرف کھنچا آتا ہے پھر وہ ابدالآباد تک زمین کے گرد گردش کیوں کرتا رہے گا؟"

"بڑی استادی کی بات ہے ۔ لیکن دراصل اتنی بھی استادانہ نہیں ۔"

"کیوں نہیں ' سوفی؟"

"اگر چاند واقعی اسی قوت سے زمین کی طرف کھنچتا ہے جس قوت نے سیب کو زمین پر گرا دیا تھا ' پھر چاند مسلسل زمین کے گرد چکر لگانے کی بجائے ایک روز دھڑام سے زمین پر آ گرے گا اور پاش پاش ہو جائے گا ۔"

"یہ بات ہمیں نیوٹن کے سیاروی مداروں کے متعلق کلیے کی طرف لے جاتی ہے ۔ زمین چاند کو کس طرح اپنی طرف کھینچتی ہے ' اس میں تم پچاس فیصد صحیح اور

پچاس فیصد غلط ہو۔ چاند زمین پر گرتا کیوں نہیں حالانکہ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ زمین چاند کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے جو کشش ثقل کی قوت استعمال کرتی ہے' وہ بے پناہ ہوتی ہے؛ ذرا سوچو کہ مدکامل کے وقت سمندر کی سطح کو ایک دو میٹر بلند کرنے کے لیے کتنی قوت درکار ہو گی؟"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"گیلیو کی سطح مائل کو یاد کرو۔ جب میں نے گولی عرض کی ایک جانب سے دوسری جانب لڑھکائی تھی' پھر کیا ہوا تھا؟"

"کیا چاند پر بھی دو مختلف قوتیں اثرانداز ہو رہی ہیں؟"

"بالکل صحیح۔ کسی زمانے میں جب نظام شمسی کا آغاز ہوا' چاند کو بڑی زبردست قوت کے ساتھ باہر کی جانب ——— یعنی زمین سے باہر کی جانب ——— پھینک دیا گیا۔ یہ قوت ہمیشہ موثر رہے گی کیونکہ یہ مدافعت کے بغیر خلا (vacuum) میں متحرک ہے۔..."

"لیکن یہ زمین کی کشش ثقل کی قوت کے باعث زمین کی طرف بھی تو کھنچتا ہے۔ ہے نا یہی بات؟"

"بالکل ٹھیک۔ دونوں قوتیں ثابت یا مستقل (constant) ہیں اور دونوں بیک وقت برسرکار رہتی ہیں۔ چنانچہ چاند زمین کے گرد گردش کرتا رہے گا۔"

"کیا یہ بات واقعی اتنی سہل ہے؟"

"بالکل اتنی سہل' اور اس کا اتنا سہل ہونا ہی نیوٹن کا سارا نکتہ تھا۔ اس نے بذریعہ تجربہ ثابت کر دیا کہ چند قوانین فطرت کا اطلاق ساری کائنات پر ہوتا ہے۔ سیاروں کے مداروں کا حساب لگاتے وقت اس نے محض دو قوانین فطرت کا اطلاق کیا جو گیلیو پہلے ہی پیش کر چکا تھا۔ ان میں سے ایک انرشیا (inertia) کا قانون تھا جسے نیوٹن نے اس طرح بیان کیا ہے: ایک جسم اس وقت تک حالت سکون (slate of rest) یا راست خطی حرکت / حرکت مستقیم (rectilinear motion) میں رہتا ہے (یعنی سیدھا حرکت کرتا رہتا ہے) جب تک اسے کسی قوت کے ذریعے' جو اس پر نافذ کر دی جائے' اپنی حالت تبدیل کرنے پر مجبور نہ کر دیا جائے۔ دوسرے قانون یا کلیے کا عملی مظاہرہ گیلیو سطح مائل پر کر چکا تھا اور وہ قانون یہ ہے: 'جب کسی جسم پر دو طاقتیں بیک وقت اثرانداز ہو رہی ہوں' جسم بیلیجی (elliptical) راستے پر متحرک ہو جائے گا۔"

"سیارے سورج کے گرد کیوں گھومتے ہیں ' تو نیوٹن نے اس کی یہ تشریح کی ہے۔"

"ہاں۔ دو غیر مساوی حرکتوں کے نتیجے کے طور پر سیارے سورج کے گرد بیلیجی مداروں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ پہلی حرکت راست خطی حرکت ہے جو انہیں تب ملی جب نظام شمسی وجود میں آیا۔ دوسری حرکت وہ حرکت ہے جو کشش ثقل کے باعث انہیں سورج کی طرف کھینچتی رہتی ہے۔"

"بڑی ماہرانہ تشریح ہے۔"

"بالکل۔ نیوٹن نے عملی مظاہرے سے ثابت کر دیا کہ متحرک اجسام کے بالکل انہی قوانین کا اطلاق پوری کائنات میں ہر جگہ ہوتا ہے۔ یوں اس نے قرون وسطیٰ کے اس عقیدے کا ابطال کر دیا کہ آسمان پر اور قوانین کا اطلاق ہوتا ہے اور زمین پر اور کا۔ عالم کے آفتاب مرکز نظریے کی حتمی توثیق اور حتمی توضیح مل گئی تھی۔"

البرٹو اپنی نشست سے اٹھا ' اس نے سطح مائل اٹھائی اور ایک طرف رکھ دی۔ پھر اس نے کانچ کی گولی اٹھائی اور اسے اپنے دونوں کے درمیان کی میز پر رکھ دیا۔

سوفی سوچ رہی تھی کہ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ انہوں نے ترچھی لکڑی کے معمولی سے ٹکڑے اور کانچ کی گولی کی مدد سے اتنا کچھ سیکھ لیا ہے۔ جب وہ سبز گولی کو ' جس پر ابھی تک سیاہی کے دھبے پڑے ہوئے تھے ' دیکھ رہی تھی اسے بے اختیار زمین کی گلوب یاد آ گئی۔ اس نے کہا : "اور لوگ یہ ماننے پر مجبور تھے کہ وہ کسی ایسے سیارے پر آباد ہیں جو جونہی انکل پچو کہیں خلا میں معلق ہے۔"

"ہاں ــــ مگر دنیا کے متعلق یہ نیا نظریہ کئی لحاظ سے بہت بڑا بوجھ تھا۔ یہ صورت حال تقریباً اس صورت حال کے مشابہ تھی جو بعد میں پیش آئی جب ڈارون نے یہ ثابت کیا کہ انسان جانوروں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دونوں صورتوں میں انسان کو مخلوقات میں اپنے خاص مقام سے کچھ ہاتھ دھونا پڑا۔ اور ان دونوں صورتوں میں کلیسا نے زبردست مزاحمت کی۔"

"میں یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں کیونکہ ان ساری نئی باتوں میں خدا کہاں رہ گیا تھا؟ تب معاملہ نسبتاً زیادہ آسان تھا جب زمین کو کائنات کا مرکز تصور کیا جاتا تھا اور خدا اور سیاروں کے متعلق فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ اوپر بالائی منزل پر ہیں۔"

"لیکن یہ عظیم ترین چیلنج نہیں تھا۔ جب نیوٹن یہ ثابت کر چکا کہ کائنات میں

ہر جگہ یکساں قوانین فطرت کا اطلاق ہوتا ہے ' آدمی کے ذہن میں خیال آسکتا ہے کہ اس نے شاید اس طریقے سے لوگوں کے خدا کی قدرت مطلقہ میں اعتقاد کو متزلزل کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مگر جہاں تک نیوٹن کا اپنا تعلق ہے ' اس کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ قوانین فطرت عظیم اور قادرِ مطلق خدا کی موجودگی کا ثبوت ہیں ۔ یہ ممکن ہے کہ انسان نے اپنے ذہن میں جو اپنی تصویر بنا رکھی تھی ' اسے زک پہنچی ہو۔ "

" کیا مطلب ہے آپ کا؟ "

" نشاۃ ثانیہ کے زمانے سے لوگوں کو طوعاً وکرہاً یہ بات قبول کرنا پڑ رہی ہے کہ وہ ایک ایسے سیارے پر زندگی گزار رہے ہیں جس کا وسیع و عریض کہکشاں میں اٹکل پچو انتخاب عمل میں آیا تھا ۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے اب بھی اس صورت حال سے پوری طرح نباہ کرنا سیکھا ہے یا نہیں ۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کے دور میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ ہم میں سے ہر ایک کو پہلے کی نسبت زیادہ مرکزی مقام حاصل ہے ۔ "

" میں پوری طرح سمجھ نہیں سکی ۔ "

" پچھلے زمانے میں زمین کائنات کا مرکز (متصور ہوتی) تھی ۔ لیکن اب چونکہ فلکیات کے ماہرین کہہ رہے تھے کہ کائنات کا کوئی معین یا مطلق (absolute) مرکز نہیں ' سمجھا یہ جانے لگا کہ جتنے لوگ ہیں اتنے ہی مراکز ہیں ۔ ہر شخص اپنی ذات میں کائنات کا مرکز بن سکتا تھا ۔ "

" اخاہ ! میرا خیال ہے کہ میں سمجھ گئی ہوں ۔ "

" نشاۃ ثانیہ کا نتیجہ ' نئی مذہبیت ' (religiosity) کی صورت میں برآمد ہوا ۔ جب سائنس اور فلسفہ آہستہ آہستہ الٰہیات (Theology) سے اپنا ناتا توڑنے لگے ' ایک نئے عیسائی تقویٰ (piety) کی نمو ہونے لگی ۔ پھر نشاۃ ثانیہ انسان کے متعلق نئے نظریے کے ساتھ وارد ہوا ۔ اس کا اثر مذہبی زندگی پر پڑا ۔ اب خدا کے ساتھ فرد کا ذاتی تعلق اس کے بحیثیت تنظیم کلیسا کے ساتھ تعلق سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ۔ "

" جیسے رات کو اکیلے عبادت کرنا؟ "

" ہاں ' یہ بھی ۔ قرون وسطیٰ کے کیتھولک مسلک میں گرجے کے اندر رطورے (liturgy) کی لاطینی زبان میں ادائیگی اور مسلک کی رسمی دعائیں مذہبی عبادت میں ریڑھ

کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھیں ۔ انجیل کی تلاوت صرف پادری اور راہب کرتے تھے کیونکہ یہ صرف لاطینی زبان میں مہیا تھی ۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کے عہد کے دوران میں انجیل کے یونانی اور عبرانی زبانوں سے قومی زبانوں میں تراجم ہوئے ۔ یہ ترجمے اس تحریک کے لیے، جسے ہم 'تحریک اصلاح مذہب' کہتے ہیں 'نہایت اہم تھے ۔"

"مارٹن لوتھر (9)۔ ۔ ۔"

"ہاں ۔ مارٹن لوتھر کی اپنی اہمیت ہے ۔ لیکن وہ اکیلا مصلح نہیں تھا ۔ ایسے کلیسائی مصلح بھی منظر عام پر آئے جنھوں نے رومن کیتھولک مسلک چھوڑنا گوارا نہ کیا ۔ ان میں سے ایک روٹرڈیم (ہالینڈ) کا اراس مس (10) تھا ۔"

"لوتھر نے رومن کیتھولک مسلک سے اس لیے ناتا توڑ لیا کیونکہ وہ (گناہوں کے) معافی نامے (indulgences) خریدنے کے حق میں نہیں تھا ۔ ٹھیک ؟"

"ہاں ۔ یہ ایک وجہ تھی ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم وجہ تھی ۔ لوتھر کا خیال تھا کہ خدا کا عفو (forgiveness) حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو کلیسا یا اس کے پادریوں کی سفارش (شفاعت) (intercession) کی ضرورت نہیں ۔ اور نہ خدا کا عفو کلیسا سے ' معافی نامے ' خریدنے پر منحصر ہے ۔ رومن کیتھولک مسلک نے سولھویں صدی کے وسط میں نام نہاد معافی ناموں کے خطوط کی تجارت پر پابندی لگا دی ۔"

"خدا کو یہ سن کر غالباً خوشی ہوئی ہو گی ۔"

"عمومی اعتبار سے لوتھر نے اپنے آپ کو ان بہت سی مذہبی رسوم اور عقاید سے دور کر لیا جو قرون وسطیٰ کے دوران میں کلیسائی تاریخ میں پیوست ہو گئے تھے ۔ وہ اوائل عیسائیت کی طرف لوٹنا چاہتا تھا جو نئے عہد نامے میں پائی جاتی ہے ۔ 'صرف' کتاب مقدس ' اس کا نعرہ تھا ۔ اس نعرے کے ساتھ لوتھر بالکل اسی طرح عیسائیت کے 'سرچشمے ' کی طرف لوٹنا چاہتا تھا جس طرح نشاۃ ثانیہ کے انسان دوست آرٹ اور ثقافت کے قدیم سرچشموں کی طرف لوٹ رہے تھے ۔ اس نے جرمن زبان میں انجیل کا ترجمہ کیا اور یوں اس نے تحریری جرمن زبان کی بنیاد رکھ دی ۔ اس کا ایمان تھا کہ ہر شخص کو انجیل پڑھنے کے قابل ہونا چاہیے اور یوں ایک لحاظ سے اسے اپنا پادری خود بن جانا چاہیے ۔"

"اپنا پادری خود ؟ کیا یہ معاملے کو ضرورت سے قدرے آگے بڑھانا نہیں تھا ؟"

"اس کا مطلب تھا کہ خدا کے ساتھ تعلق میں پادریوں کو ترجیحی مقام حاصل

نہیں ۔ عبادت کرنے والی لوتھری جماعتیں عملی وجوہ کے باعث ـــــ مثلاً عبادت میں رہنمائی کرنا یا پادری کے روزمرہ کے فرائض ادا کرنا ـــــ پادریوں کو ملازم رکھتی تھیں ، لیکن لوتھر یہ نہیں مانتا تھا کہ کوئی شخص کلیسا کی رسوم ادا کر کے گناہوں سے خلاصی پاسکتا یا عفو خداوندی کا مستحق ہو جاتا ہے ۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان 'مفت کی' خلاصی صرف ایمان کی بدولت حاصل کرتا ہے ۔ وہ اس عقیدے پر انجیل کا مطالعہ کرنے کے بعد پہنچا تھا ۔"

"چنانچہ لوتھر بھی نشاۃ ثانیہ کی خصوصیات کا حامل شخص تھا ۔"

"ہاں بھی اور نہیں بھی ۔ اس میں نشاۃ ثانیہ کا ایک خصوصی وصف یہ تھا کہ وہ فرد پر اور فرد کے خدا کے ساتھ شخصی تعلقات پر زور دیتا تھا ۔ چنانچہ اس نے پینتیس سال کی عمر میں کسی استاد کی مدد کے بغیر خود ہی یونانی زبان سیکھی اور انجیل کے قدیم یونانی زبان سے جرمن میں ترجمہ کرنے کے مشقت طلب کام میں جت گیا ۔ لوگوں کا لاطینی زبان پر اپنی زبان کو فوقیت دینا بھی نشاۃ ثانیہ کا خصوصی وصف تھا لیکن فت چینؤیا لیونار دو د ونچی (اطالوی آرٹسٹ ۔ مونا لزا کا خالق) کی طرح لوتھر انسان دوست نہیں تھا ۔ اراس مس آف روٹرڈیم (10) جیسے انسان دوست بھی اس کے مخالف تھے کیونکہ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ انسان کے متعلق لوتھر کا نقطہ نظر کچھ زیادہ ہی منفی ہے ۔ لوتھر نے ببانگ دہل کہا تھا کہ (پہلا) گناہ کرنے اور فضل خداوندی سے محروم ہونے کے بعد انسان مکمل طور پر بدفطرت بن چکا ہے ۔ اس کا عقیدہ تھا کہ صرف خدا کے فضل سے بنی نوع انسان کی خطا معاف ہو سکتی اور انہیں گناہ عظیم کی سزا سے رہائی مل سکتی ہے ۔ کیونکہ گناہ کی مزدوری موت ہے ۔ (11)"

"یہ تو بڑا افسردہ کرنے والی باتیں ہیں ۔"

البرٹو کنوکس اٹھ کھڑا ہوا ۔ اسی نے ننھی سبز و سیاہ گولی اٹھائی اور اپنے کوٹ کی اوپر کی جیب میں ڈال لی ۔

"چار سے اوپر ہو گئے !" سوفی نے دہشت زدہ ہو کر کہا ۔

"بنی نوع انسان کی تاریخ کا اگلا عظیم باب بیروق (Baroque) ہے ۔ لیکن مائی ڈیر ہلڈے ، ہمیں یہ کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھنا ہو گا ۔"

"کیا کہا آپ نے ؟" سوفی اپنی کرسی سے اچھل پڑی ۔ "آپ نے مجھے ہلڈے کہا ہے ؟"

"بس زبان غوطہ کھا گئی ۔ سخت غلطی ہو گئی ۔"

"مگر جب زبان غوطہ کھاتی ہے ' اس میں پوری طرح اتفاق کا دخل نہیں ہوتا ۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو ۔ تم نے شاید اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہلڈے کے باپ نے ہمارے مونہوں میں اپنے الفاظ ڈالنا شروع کر دئے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس حقیقت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگا ہے کہ ہم تھکنے لگے ہیں اور اپنا دفاع ٹھیک طرح سے نہیں کر رہے ۔"

"آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ آپ ہلڈے کے باپ نہیں ۔ کیا یہ واقعی درست ہے ؟"

البرٹو نے اتفاق میں سر ہلا دیا ۔

"مگر کیا میں ہلڈے ہوں ؟"

"سوفی ' میں اب تھک چکا ہوں ۔ تمہیں یہ بات سمجھنا ہوگی ۔ ہمیں یہاں بیٹھے دو سے اوپر گھنٹے گزر چکے ہیں اور زیادہ تر گفتگو بھی میں ہی کرتا رہا ہوں ۔ کیا تمہیں کھانا کھانے گھر نہیں جانا ؟"

سوفی کو محسوس ہوا جیسے وہ اسے زبردستی نکالنے کی کوشش کر رہا ہو ۔ جب وہ مختصر پیش داللان میں سے گزر رہی تھی وہ بڑی شدت سے سوچتی جارہی تھی کہ آخر اس سے وہ سہو کیوں ہوا (کہ اس نے اسے سوفی کی بجائے ہلڈے کہہ دیا) ؟ البرٹو اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا ۔

ہر میز کھونٹیوں کی چھوٹی سی قطار کے نیچے سو رہا تھا جن پر متعدد ملبوسات لٹک رہے تھے جو دیکھنے میں بہت عجیب معلوم ہو رہے تھے اور قیافہ یہی کہتا تھا کہ یہ لازماً تھیٹر کے ڈراموں میں استعمال ہوتے ہوں گے ۔

البرٹو نے سر ہلا کر کتے کی طرف اشارہ کیا اور کہا : "یہ تمہارے ہاں آئے گا اور تمہیں بلا لائے گا ۔"

"سبق کا شکریہ ۔" سوفی نے کہا ۔

وہ اضطراری طور پر اس کے ساتھ بغل گیر ہوگئی : "جن اساتذہ سے میرا واسطہ پڑا ہے ' آپ ان سب میں بہترین اور مشفق ترین استاد ہیں ۔" اس نے کہا ۔

اس نے یہ کہا ' سیڑھیوں کی جانب کھلنے والا دروازہ وا کیا اور باہر نکل گئی ۔

جب دروازہ بند ہوگیا' البرٹو یہ کہتے سنائی دیا: "ہماری بہت جلد پھر ملاقات ہوگی، ہلڈے۔"

سوفی ان الفاظ کو چاٹتی رہ گئی۔

کیا اس کی زبان پھر غوطہ کھا گئی؟ لفنگا کہیں کا! سوفی تلملا رہی تھی۔ اس کے دل میں رہ رہ کر شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ وہ واپس مڑے اور زور زور سے دروازہ پیٹنے لگے۔ لیکن کسی چیز نے اسے روکے رکھا۔

جب وہ سڑک پر پہنچی' اسے یاد آیا کہ اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ اب وہ گھر کیسے جائے گی؟ اتنا طویل راستہ پھر پیدل طے کرنا ہوگا؟ کیا مصیبت ہے! اگر وہ چھ بجے تک گھر نہ پہنچی (اور وہ یقیناً نہیں پہنچ سکے گی)' اس کی امی پریشان بھی ہوں گی اور اسے غصہ بھی آئے گا۔

وہ چند گز سے زیادہ دور نہیں گئی ہوگی کہ اچانک فٹ پاتھ پر اس کی نظر ایک سکے پر پڑی۔ یہ دس کراؤن کا سکہ تھا اور بس کی ٹکٹ بالکل اتنے کی آتی تھی۔

سوفی کو بس سٹاپ کا رستہ مل گیا۔ وہ وہاں جا کھڑی ہوئی اور مین سکوائر کی بس کا انتظار کرنے لگی۔ مین سکوائر میں اسے نئی ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہیں تھی' وہ اسی ٹکٹ پر دوسری بس میں سوار ہوسکتی اور اپنے گھر کے تقریباً عین سامنے اتر سکتی تھی۔

جب وہ مین سکوائر کے بس سٹاپ پر کھڑی دوسری بس کا انتظار کر رہی تھی' وہ اچانک سوچنے لگی کہ آخر اس کی قسمت کیوں جاگ گئی اور اسے عین اسی لمحے دس کراؤن کا سکہ کیوں مل گیا جب کہ اسے اس کی اشد ضرورت تھی؟

کیا ہلڈے کا باپ اسے یہاں چھوڑ گیا ہے؟ اسے ایسی جگہوں پر اشیا چھوڑنے میں بڑی مہارت حاصل ہے جہاں سے وہ آسانی سے مل سکتی ہیں۔

لیکن اگر وہ لبنان میں ہے' پھر وہ یہاں کیسے پہنچ سکتا ہے؟

اور البرٹو کی زبان نے غوطہ کیوں کھایا تھا؟ ایک بار نہیں بلکہ دو بار!

سوفی پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی کمر میں سردی گھس گئی ہو۔

17 - بیروق

* * *

. . . یہی تو وہ چیزیں ہیں جن سے خواب بنے جاتے ہیں . . .

سوفی کو البرٹو کی طرف سے کئی روز تک کوئی اطلاع نہ مل سکی لیکن وہ اکثر اس امید میں سرسری نگاہوں سے باغ کی طرف دیکھ لیتی کہ شاید اسے ہرمیز کہیں نظر آجائے۔ اس نے اپنی امی کو بتایا تھا کہ کتے نے گھر کا راستہ خود ہی ڈھونڈ لیا تھا۔ اتفاق سے اس کا مالک اس کا فزکس کا سابق استاد تھا اور اس نے اسے اپنے گھر مدعو کر لیا تھا۔ اس نے اسے نظام شمسی اور نئی سائنس کے متعلق، جو سولہویں صدی میں پھل پھول رہی تھی، بہت کچھ بتایا تھا۔

البتہ جوآنا سے اس نے ذرا کھل کر باتیں کیں۔ اس نے اسے اپنے البرٹو کے ہاں جانے، وہاں ڈاک ڈبے کے اوپر پوسٹ کارڈ پانے اور واپسی پر دس کراؤن کے سکے کے ملنے کے متعلق بتایا۔ البتہ اس نے ہلڈے اور اس کی طلائی صلیب کے متعلق، جس پر مسیح کی تصویر کندہ تھی، جو خواب دیکھا تھا، وہ اپنے تک ہی محدود رکھا۔

انتیس مئی بروز منگل سوفی باورچی خانے میں کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ اس کی امی نشستی کمرے میں ٹیلی وژن پر خبریں دیکھنے چلی گئی تھی۔ جب خبروں کا ابتدائی حصہ ختم ہوگیا، اسے باورچی خانے میں سنائی دیا کہ ناروے کی یو این بٹالین کا کوئی میجر گولہ لگنے سے ہلاک ہوگیا ہے۔

سوفی نے برتن پونچھنے کا تولیا میز پر پھینکا اور لپک جھپک نشستی کمرے میں

پہنچ گئی ۔ اگلی خبر شروع ہونے سے چند سیکنڈ پیشتر وہ اقوام متحدہ کے افسر کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو گئی ۔

"اف ،نہیں !"اس کی بے اختیار چیخ نکل گئی ۔

اس کی امی اس کی طرف متوجہ ہوئی ۔

"ہاں ،جنگ ہے ہی بڑی خوف ناک چیز !"

سوفی کے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے ۔

"لیکن سوفی ،معاملہ اتنا بھی خراب نہیں !"

"انہوں نے اس کا نام پڑھ کر سنایا تھا ؟"

ہاں ، بتایا تو تھا ، لیکن مجھے یاد نہیں رہا ۔ میرا خیال ہے کہ وہ گرم سٹیڈ (Grimstad) کا رہنے والا تھا ۔"

"گرم سٹیڈ ؟ کیا یہ وہی تو نہیں جسے للے سینڈ کہا جاتا ہے ۔"

"بالکل نہیں ۔ تم احمقانہ باتیں کر رہی ہو ۔"

"لیکن اگر کوئی شخص رہتا گرم سٹیڈ ہو ، وہ تعلیم حاصل کرنے للے سینڈ تو جاسکتا ہے ۔"

اس کے آنسو تھم چکے تھے لیکن اب ردعمل ظاہر کرنے کی باری اس کی امی کی تھی ۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور اس نے ٹی وی بند کر دیا ۔

"سوفی ،معاملہ کیا ہے ؟"

"کچھ نہیں ۔"

"نہیں ، کیوں نہیں ۔ضرور کچھ نہ کچھ ہے ۔ تمہارا لازماً کوئی بوائے فرینڈ ہے اور مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ وہ عمر میں تم سے کہیں بڑا ہے ۔ کیا تم لبنان میں کسی شخص کو جانتی ہو ؟"

"نہیں ،صحیح معنوں میں پوچھیں تو نہیں ۔ . ."

"کیا تم کسی ایسے شخص کے ،جو لبنان میں رہتا ہو ،بیٹے سے ملتی ہو ؟"

"نہیں ۔ بالکل نہیں ۔ بیٹا چھوڑ ، میری تو کبھی اس کی بیٹی سے بھی ملاقات نہیں ہوئی ۔"

"کس کی بیٹی ؟"

"یہ آپ کا معاملہ نہیں ۔"

"میرا خیال ہے کہ ہے۔"

"بجائے اس کے کہ سوال آپ پوچھیں، میرا خیال ہے کہ شاید چند سوال مجھے پوچھنا چاہئیں۔ پاپا کبھی گھر کیوں نہیں آتے؟ کہیں یہ بات تو نہیں کہ آپ میں طلاق لینے کا حوصلہ نہیں؟ ممکن ہے کہ آپ کا اپنا کوئی بوائے فرینڈ ہو اور آپ قطعاً نہ چاہتی ہوں کہ مجھے یا پاپا کو اس کے متعلق کچھ معلوم ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے کتنے ہی مزید سوال ہیں جو میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں آپس میں گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ لیکن فی الحال میں بہت تھک چکی ہوں۔ میں سونا چاہتی ہوں۔ اور مجھے کپڑے آنا شروع ہو گئے ہیں۔"

سوفی اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ اس کا رونے کو جی چاہتا تھا۔

لیکن جونہی وہ باتھ روم سے فارغ ہوئی اور کمبلوں میں سمٹ سمٹا کر لیٹ گئی، اس کی امی اس کی خواب گاہ میں آ گئی۔

سوفی نے ظاہر تو یہی کرنا چاہا کہ وہ سو رہی ہے لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی امی کو کبھی یقین نہیں آئے گا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی امی جانتی ہے کہ سوفی جانتی ہے کہ اس کی امی کبھی اس کا یقین نہیں کرے گی۔ تاہم اس کی امی نے بھی جھوٹ موٹ یہی ظاہر کیا کہ سوفی سو چکی ہے۔ وہ سوفی کے پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور اس کے بال سہلانے لگی۔

سوفی سوچ رہی تھی کہ بیک وقت دو قسم کی زندگی گزارنے سے کتنی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسے اس دن کا شدت سے انتظار تھا جب اس کا فلسفے کا نصاب اپنے اختتام کو پہنچ جائے گا۔ اسے توقع بندھنے لگی کہ شاید یہ اس کی سال گرہ آتے آتے ختم ہو جائے ـــــ یا کم از کم وسط گرما سے ایک روز پہلے جب ہلڈے کا باپ لبنان سے گھر پہنچے گا...

"میں اپنی سال گرہ پر پارٹی کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے اچانک کہا۔

"ضرور کرو۔ بڑی اچھی تجویز ہے۔ کسے کسے بلاؤ گی؟"

"بے شمار لوگوں کو... اجازت ہے؟"

"بالکل۔ ہمارے باغ میں بڑی گنجائش ہے۔ ہمیں امید رکھنا چاہیے کہ تب تک موسم خوش گوار رہے گا۔"

"سب سے بڑھ کر میں یہ چاہوں گی کہ یہ پارٹی وسط گرما سے ایک روز پہلے ہو۔"

"بہت اچھا، ہم یہی کریں گے۔"

"یہ بڑا اہم دن ہے۔" سوفی نے کہا۔ وہ محض اپنی سالگرہ کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔

"واقعی یہ ہے۔"

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں پچھلے چند دنوں میں خاصی بڑی ہو گئی ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ہے نا؟"

"پتا نہیں۔"

سوفی جب باتیں کر رہی تھی، اس نے اپنا سر تکیے میں گھسیڑ رکھا تھا۔ اب اس کی امی نے کہا: "سوفی" ـــــ اتنا تو بتاؤ کہ تم اس وقت اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں نظر آ رہی ہو؟"

"جب آپ پندرہ برس کی تھیں آپ کی کیفیت ایسی کبھی نہیں ہوئی تھی؟"

"شاید ہوئی ہو۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ میں کیا پوچھ رہی ہوں۔"

سوفی نے اچانک پینترا بدلا اور اپنی امی کے روبرو بیٹھ گئی۔ "کتے کا نام ہرمیز ہے۔" اس نے کہا۔

"واقعی؟"

"جس شخص کا یہ کتا ہے، اس کا نام البرٹو ہے۔"

"سمجھی۔"

"وہ پرانے شہر میں رہتا ہے۔"

"تم کتے کے ساتھ اتنی دور گئی تھیں؟"

"اس میں کوئی خطرہ تو تھا نہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ کتا یہاں اکثر آتا رہتا ہے۔"

"میں نے یہ کہا تھا؟"

اب اسے سوچنا تھا۔ وہ حتی الوسع زیادہ سے زیادہ بتانا چاہتی تھی لیکن وہ سب کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔

"آپ بھی تو گھر پر کوئی خاص نہیں ہوتیں۔"

"نہیں۔ میں بے حد مصروف ہوں۔" اس نے جرات سے کہا۔

"البرٹو اور ہرمیز یہاں کئی بار آچکے ہیں۔"

"کس لیے؟ کیا وہ کبھی گھر کے اندر بھی آئے ہیں؟"

"آپ ایک وقت میں ایک سوال نہیں پوچھ سکتیں؟ انہوں نے کبھی اندر قدم نہیں رکھا۔ لیکن وہ اکثر سیر کے لیے جنگل میں نکل جاتے ہیں۔ کیا یہ اتنی ہی پراسرار بات ہے؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"جب وہ سیر کے لیے جاتے ہیں' دوسروں کی طرح وہ بھی ہمارے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ ایک روز جب میں سکول سے گھر پہنچی' میں نے کتے کو پچکارا۔ اور یوں میری البرٹو سے واقفیت ہوگئی۔"

"اور یہ سفید خرگوش اور اس قسم کی دوسری باتوں کا چکر کیا ہے؟"

"یہ بات البرٹو نے کہی تھی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں فلسفی ہیں۔ انہوں نے مجھے تمام فلسفیوں کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔"

"باڑ کے دوسری طرف کھڑے ہو کر۔"

"انہوں نے مجھے خطوط بھی لکھے ہیں۔ سچ پوچھیں تو کئی مرتبہ۔ بعض اوقات وہ یہ خطوط ڈاک کے ذریعے بھیج دیتے ہیں اور بعض اوقات جب وہ سیر کے لیے نکلتے ہیں' وہ انہیں دستی پہنچا دیتے ہیں۔"

"تو یہ ہے وہ 'محبت نامہ' جس کے بارے میں ہماری گفتگو ہوئی تھی۔"

"ہاں' مگر یہ 'محبت نامہ' نہیں تھا۔"

"اور وہ صرف فلسفے کے بارے میں لکھتا رہا ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ تصور کرسکتی ہیں! جتنا کچھ میں نے ان سے سیکھا ہے اتنا سکول کے آٹھ سالوں میں نہیں سیکھا۔ مثلاً کیا آپ نے کبھی گی اور دانو برونو کے متعلق سنا ہے جسے سن 1600ء میں کھمبے کے ساتھ باندھ کر زندہ جلا دیا گیا تھا؟ یا آپ نے کبھی نیوٹن کے آفاقی کلیہ تجاذب کے متعلق سنا ہے؟"

"نہیں۔ میں بے شمار باتیں نہیں جانتی۔"

"اور میں شرط لگانے کو تیار ہوں آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ زمین سورج کے گرد کیوں گھومتی ہے ـــــ اور یہ آپ کا اپنا سیارہ ہے!"

"اس کی عمر کیا ہو گی؟"

"میں نے کبھی سوچا نہیں ــــــ شاید پچاس۔"

"لیکن اس کا لبنان سے کیا تعلق ہے؟"

یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ سوفی نے بڑے انہماک سے سوچا۔ اس موقع پر غالباً جو کہانی مناسب ہو سکتی تھی، اس نے اسی کا سہارا لیا۔

"البرٹو کا ایک بھائی ہے۔ وہ اقوام متحدہ کی کسی بٹالین میں میجر ہے۔ اور اس کا للے سینڈ میں گھر ہے۔ شاید وہ وہی میجر ہو جو کبھی میجر کی کٹیا میں رہا کرتا تھا۔"

"البرٹو مضحکہ خیز قسم کا نام ہے۔ ہے نا؟"

"شاید۔"

"اطالوی معلوم ہوتا ہے۔"

"خیر۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہر وہ چیز، جس کی کوئی اہمیت ہے، یا تو یونان سے آئی ہے یا پھر اطالیہ سے۔"

"لیکن وہ تو ناروی بولتا ہے۔"

"جی ہاں۔ بڑی روانی سے۔"

"سوفی، تمہیں معلوم ہے کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟ ــــــ میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی روز البرٹو کو گھر بلانا چاہیے۔ میں کبھی کسی سچے فلسفی سے نہیں ملی ہوں۔"

"سوچیں گے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اسے اپنی سالگرہ کی پارٹی پر بلا لو؟ اگر دو نسلیں آپس میں مل بیٹھیں، کتنا مزہ آئے گا۔ پھر شاید میں بھی آجاؤں۔ کم از کم میں مہمانوں کی خاطر تواضع میں تو ہاتھ بٹا سکوں گی۔ اچھی تجویز نہیں؟"

"بشرطیکہ وہ آنے پر راضی ہو جائیں۔ ان سے گفتگو کرنے میں جو لطف آتا ہے مجھے اپنی جماعت کے لڑکوں کے ساتھ کبھی نہیں آتا۔ بات صرف یہ ہے کہ . . ."

"کیا؟"

"ان (لڑکوں) پر شاید بھوت سوار ہو جائے اور وہ سمجھنے لگیں کہ وہ شاید میرے نئے بوائے فرینڈ ہیں۔"

"پھر کم از کم مجھے تو بتا دو کہ وہ ہے یا نہیں۔"

"خیر، ہمیں سوچنا پڑے گا۔"

"ہاں ، ہمیں سوچنا پڑے گا ۔ اور ہاں سوفی ـــــ میرے اور تمہارے پاپا کے مابین تعلقات ہمیشہ خوشگوار نہیں رہے ۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ میری زندگی میں کبھی کوئی دوسرا مرد نہیں آیا . . "

"امی ، مجھے اب سونا ہے ۔ میرا سارا جسم اکڑ چکا ہے ۔ "

"اسپرین کی گولی چاہیے ؟ "

"جی ہاں ۔ بہت مہربانی ہو گی ۔ "

جب اس کی امی گولی اور پانی کا گلاس لے کر آئی ، سوفی سو چکی تھی ۔

31 مئی کو جمعرات تھی ۔ سوفی کو سہ پہر کی کلاسوں میں بڑی (ذہنی) مشقت جھیلنا پڑ رہی تھی ۔ جب سے اس نے فلسفے کا نصاب شروع کیا تھا ، بعض مضامین میں اس کی کارکردگی بہتر ہوگئی تھی ۔ عام طور پر اکثر مضامین میں اس کے گریڈ اچھے ہی ہوتے تھے لیکن حال ہی میں ریاضی کے سوا یہ اور بھی بہتر ہو گئے تھے ۔

انہیں ایک ایک مضمون لکھنے کو ملا تھا ۔ پچھلے پیریڈ (period) میں وہ انہیں واپس مل گیا تھا ۔ سوفی نے اپنے مضمون کے لیے "سائنس اور ٹیکنالوجی " کا موضوع منتخب کیا تھا ۔ سوفی نے نشاۃ ثانیہ اور سائنسی پیش رفت ، فطرت کے متعلق نئے نقطہ نظر اور فرانسس بیکن (1) پر ، جس نے کہا تھا کہ علم قوت ہے ، صفحوں کے صفحے سیاہ کر ڈالے تھے ۔ اس نے اس بات کی نشان دہی کرنے کے لیے خاص احتیاط سے کام لیا کہ تجربی (empirical) طریق کار صنعیاتی (technological) ایجادات سے پہلے وجود میں آیا تھا ۔ ٹیکنالوجی کے متعلق اس نے جو کچھ سوچا اور لکھا تھا ، اس میں وہ باتیں بھی شامل تھیں جو معاشرے کے لیے اچھی نہیں ہیں ۔ اس سلسلے میں اس نے جو کچھ تحریر کیا ، اس کا اختتام اس عبارت پر کیا کہ ہر وہ کام جو لوگ کرتے ہیں ، اچھے اور برے دونوں مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے ۔ اچھائی اور برائی سفید اور سیاہ دھاگے کی مانند ہوتی ہیں جو ایک ہی لڑ (strand) میں پروئے ہوتے ہیں ۔ بعض اوقات وہ آپس میں اس طرح گتھے ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔

جب استاد کاپیاں واپس کر رہا تھا ، اس نے سوفی کی طرف دیکھا اور آنکھ سے اشارہ کیا ۔

اسے A (گریڈ) ملا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ تبصرہ بھی : " تم نے یہ سب کچھ

کہاں سے سیکھا ہے ؟ "جب وہ وہاں کھڑا تھا ، سوفی نے اپنا پین نکالا اور جلی حروف میں کاپی کے حاشیے پر لکھا: میں فلسفہ پڑھ رہی ہوں ۔

جب وہ دوبارہ اپنی کاپی بند کر رہی تھی ، اس میں سے کوئی چیز اچھلی اور نیچے گر پڑی ۔ یہ لبنان کا پوسٹ کارڈ تھا ۔

ڈیر ہلڈے ، جب تم یہ خط پڑھو گی ، یہاں جو الم ناک موت واقع ہوئی ہے ، ہم اس کے متعلق پہلے ہی ٹیلی فون پر بات کر چکے ہوں گے ۔ بعض اوقات میں اپنے آپ سے سوال کرنے لگتا ہوں : اگر لوگوں کو بہتر انداز سے سوچنا آتا ، کیا جنگ سے پہلو بچایا جاسکتا تھا ؟ تشدد کا شاید بہترین علاج یہ ہے کہ لوگوں کو فلسفے کا مختصر نصاب پڑھایا جائے ۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی " فلسفے کی جیبی کتاب " تیار کی جائے اور دنیا کے تمام نئے شہریوں کو ان کی اپنی زبان میں اس کا ایک ایک نسخہ فراہم کردیا جائے ؟ میں اپنی یہ تجویز اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو پیش کروں گا ۔

تم نے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ تم اپنی اشیا کو زیادہ قرینے سے سنبھالنے لگی ہو ۔ میں بہت خوش ہوں کیونکہ میں نے تم سے زیادہ بدسلیقہ لڑکی کہیں نہیں دیکھی ۔ پھر تم نے بتایا تھا کہ ہماری ہماری سابقہ گفتگو کے بعد تم نے جو واحد چیز گنوائی ہے ، وہ ایک دس کراؤن کا سکہ تھا ۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا ، میں اسے ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کروں گا ۔ اگرچہ میں بہت دور ہوں ، وطن میں میرا ایک مددگار موجود ہے ۔ (اگر مجھے یہ سکہ کہیں مل گیا ، میں اسے تمہارے سالگرہ کے تحفے میں رکھ دوں گا ۔) پاپا کی طرف سے پیار جیسے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ وطن واپسی کے طویل سفر پر پہلے ہی روانہ ہوچکا ہے ۔

سوفی ابھی بمشکل کارڈ پڑھ پائی تھی کہ آخری گھنٹی بج گئی ۔ ایک بار پھر اس کے خیالات میں ہلچل بپا ہوچکی تھی ۔

جو آنا کھیل کے میدان میں اس کا انتظار کر رہی تھی ۔ گھر واپس جاتے راستے

میں سوفی نے اپنا بستہ کھولا اور جو آنا کو تازہ ترین کارڈ دکھایا۔

"اس پر کس تاریخ کی مہر ہے؟" جو آنا نے پوچھا۔

"غالباً 15 جون..."

"نہیں۔ ادھر دیکھو۔ یہاں 30/5/90 درج ہے۔"

"یہ تو کل کی تاریخ ہے... لبنان میں میجر کی ہلاکت کے اگلے روز کی۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ لبنان سے کوئی پوسٹ کارڈ ایک دن میں ناروے پہنچ سکتا ہے۔"

"خاص طور پر جب اس خلاف معمول پتے ـــــ ہلڈے مولر کنیگ بتوسط سوفی امنڈسین فورولیا (Furulia) جونیر ہائی سکول ـــــ کو پیش نظر رکھا جائے..."

"تمہارے خیال میں یہ ڈاک سے آیا ہوگا؟ اور ٹیچر نے اسے عجلت سے تمہاری کاپی میں گھسیڑ دیا؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھ میں ان سے پوچھنے کا حوصلہ ہے بھی یا نہیں۔"

اس کے بعد پوسٹ کارڈ کے متعلق مزید کوئی بات نہ ہوئی۔

"میں وسط گرما سے ایک روز پہلے اپنے باغ میں پارٹی کا اہتمام کر رہی ہوں۔" سوفی نے کہا۔

"لڑکوں کو بلاؤ گی؟"

سوفی نے کندھے اچکا دئے۔ "ہمیں بدترین احمقوں کو بلانے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن تم جیریمی کو تو بلاؤ گی؟"

"اگر تم چاہتی ہو۔ ہاں چلتے چلتے یہ بتا دیتی ہوں کہ میں شاید البرٹو کنوکس کو دعوت نامہ بھیج دوں۔"

"پاگل ہوگئی ہو!"

"مجھے معلوم ہے۔"

ان کی گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ سپر مارکیٹ آگئی۔ یہاں سے راستے الگ الگ ہوگئے۔

گھر پہنچنے کے بعد سوفی نے پہلا کام یہ کیا کہ ہرمیز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں ۔ وہ واقعی وہاں موجود تھا اور سیب کے درختوں میں یہاں وہاں سونگھتا پھر رہا تھا۔

"ہرمیز!"

کتا ایک سیکنڈ کے لیے بالکل ساکت کھڑا ہوگیا ۔ سوفی کو صحیح صحیح معلوم تھا کہ اس ایک سیکنڈ کے دوران میں کیا ہو رہا ہے ۔ کتا اس کی پکار سن چکا ' آواز پہچان چکا اور یہ دیکھنے کا فیصلہ کرچکا تھا کہ کیا وہ (سوفی) وہاں موجود ہے ۔ جب وہ اس کا پتا لگا چکا ' وہ اس کی طرف بھاگنے لگا ۔ آخر میں اس کی چاروں ٹانگوں سے کچھ اس قسم کی دھمک سنائی دینے لگی جیسی چوب کے طبل پر پڑنے سے آتی ہے۔

ایک سیکنڈ کے دوران میں یہ جو کچھ ہوا ' وہ واقعی بہت کچھ تھا۔

وہ جست لگا کر اس کے پاس پہنچ گیا ' اس نے مجنونانہ انداز سے اپنی دم ہلائی اور اس کا چہرہ چاٹنے کے لیے اوپر کی طرف اچھلا۔

"ہرمیز ' اتنی ہوشیاری نہ دکھاؤ! نیچے! نیچے اترو! ارے 'یہ کیا کررہے ہو ' اپنی رال سے میرے کپڑے گندے مت کرو ۔ بدمعاش! شریر! صبر! بس یہ ٹھیک ہے ۔"

سوفی گھر کے اندر چلی گئی ۔ جھاڑیوں سے تلاطخیں بھرتی شیری کان بھی پہنچ گئی ۔ اسے اجنبی ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے اور وہ ان کے بارے میں بہت محتاط رہتی تھی ۔ سوفی نے اس کی بلیوں کی خوراک باہر رکھ دی ' بجری گار طوطوں کے برتن میں پرندوں کے کھانے کے بیج ڈالے ' کچھوے کے لیے سلاد کا پتا نکالا اور اپنی امی کے نام ایک رقعہ تحریر کیا۔

اس نے لکھا کہ وہ ہرمیز کو اس کے گھر پہنچانے جارہی ہے اور سات بجے تک واپس آجائے گی۔

وہ روانہ ہوگئے اور شہر کے بیچوں بیچ چلنے لگے ۔ اس مرتبہ سوفی نے اپنے ساتھ کچھ رقم لے جانا یاد رکھا ۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کتے کے ساتھ بس میں سوار ہوجانا چاہیے یا نہیں ۔ تاہم اس نے فیصلہ کیا کہ اس معاملے میں انتظار کرنا اور البرٹو سے پوچھ لینا بہتر ہوگا۔

جب وہ آگے ہی آگے جارہے تھے ' وہ سوچ رہی تھی کہ جانور اصل میں ہے کیا۔

کتے اور انسان کے مابین فرق کیا ہے؟ اسے ارسطو کے الفاظ یاد آ گئے ۔ اس نے کہا تھا کہ انسان اور حیوان دونوں فطری جان دار مخلوق ہیں اور دونوں میں بے شمار مشترک خصائص ہیں ۔ لیکن انسانوں اور حیوانوں کے مابین ایک بڑا واضح فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ حیوان کے برعکس انسان استدلال کر سکتا ہے ۔

وہ یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتا تھا؟

اس کے برعکس ڈیموکری توس کا خیال تھا کہ انسان اور حیوان حقیقتاً ایک دوسرے سے تقریباً مشابہ ہیں کیونکہ دونوں کی ساخت ایٹموں سے ہوئی ہے ۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ انسانوں اور حیوانوں دونوں میں کوئی غیر فانی روح نہیں ہوتی ۔ اس کے خیال کے مطابق روحیں (souls) ایٹموں سے تشکیل پاتی ہیں جو لوگوں کی موت کے بعد ادھر ادھر بکھر جاتی ہیں ۔ یہی وہ شخص تھا جو کہتا تھا کہ انسان کی روح لانیفک طور پر اس کے دماغ کے ساتھ پیوست ہوتی ہے ۔

لیکن روح ایٹموں سے کیسے بنائی جا سکتی ہے؟ روح کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں جسے جسم کے دیگر اعضا کی طرح چھوا جا سکتا ہو ۔ یہ تو کوئی "روحانی" (spiritual) یا "غیر مادی" چیز ہے ۔

وہ پہلے ہی مین سکوائر کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب پرانے شہر کے قریب پہنچ رہے تھے ۔ جب سوفی نے اس فٹ پاتھ پر قدم رکھا جہاں سے اسے دس کراؤن کا سکہ ملا تھا ' بے اختیار اس کی نظر نیچے پتھروں کی طرف چلی گئی ۔ اور عین اسی جگہ ' جہاں وہ نیچے جھکی اور جہاں سے اس نے دس کراؤن کا سکہ اٹھایا تھا ' ایک پوسٹ کارڈ پڑا تھا ۔ اس کے جس رخ پر تصویر تھی ' وہ اوپر کی طرف تھا ۔ تصویر میں کوئی باغ دکھایا گیا تھا جس میں پام اور مالٹے کے درخت کھڑے تھے ۔

سوفی نیچے جھکی اور اس نے پوسٹ کارڈ اٹھا لیا ۔ ہرمیز یوں غرانے لگا جیسے اسے سوفی کا کارڈ کو ہاتھ لگانا پسند نہ آیا ہو ۔

کارڈ پر تحریر تھا:

ڈیر ہلڈے ' زندگی بیک وقت اتفاق سے پیش آنے والے واقعات کی لمبی زنجیر پر مشتمل ہے ۔ یہ بالکل ہی ناممکن امر نہیں کہ تم نے دس کراؤن کا جو سکہ کھویا تھا ' وہ غیر متوقع طور پر

یہاں آپہنچا ہو ۔ ممکن ہے کہ یہ ٹلےسینڈ کے چوک میں کسی بڑھیا
کو مل گیا ہو جو کرسچین سینڈ جانے والی بس کا انتظار کر رہی ہو ۔
کرسچین سینڈ سے اس نے اپنے پوتے پوتیوں یا نواسے نواسیوں
سے ملنے کے لیے گاڑی پکڑی ہو اور کئی گھنٹوں کی مسافت کے
بعد اس سے یہ سکہ یہاں نیوسکوائر میں کھو گیا ہو ۔ پھر یہ ممکن ہے
کہ اسی روز یہ کسی لڑکی نے اٹھا لیا ہو جسے گھر پہنچنے کے لیے بس
پکڑنا تھا اور یوں جسے واقعی اسؔ کی ضرورت تھی ۔ ہلڈے ' کوئی کچھ
نہیں کہہ سکتا کہ دراصل ہوا کیا تھا لیکن اگر صحیح صورت حال یہی
تھی پھر آدمی کو پوچھنا چاہیے کہ کیا ہر چیز کے پیچھے مشیت ایزدی
تو کار فرما نہیں ؟ بابا کی طرف پیار جسے محسوس ہو رہا ہے کہ اس کا
جسم نہ سہی اس کی روح وطن میں ٹلےسینڈ کے گھاٹ پر بیٹھی
ہے ۔ پس نوشت : میں کہہ چکا ہوں کہ میں دس کراؤن کا سکہ
تلاش کرنے میں تمہاری مدد کروں گا ۔

پوسٹ کارڈ کے جس رخ پر پتا درج ہوتا ہے ' اس پر لکھا ہوا تھا : "ہلڈے مولر
کنیگ بتوسط اتفاقیہ طور پر پہنچنے والی راہ گیر ... " اس پر 15/6/90 کی
تاریخ ثبت تھی ۔

سوفی ہرمیز کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں پھلانگنے لگی ۔ جونہی البرٹو نے دروازہ کھولا '
وہ بولی : "میرے راستے سے ہٹ جائیں ۔ ڈاکیا آگیا ہے ۔"

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پاس غصہ کھانے کی ہر وجہ موجود ہے ۔ جب
وہ بے ہنگم انداز سے دھکم دھکا کرتی اندر داخل ہوئی ' البرٹو ایک طرف ہٹ گیا ۔ ہرمیز
پہلے کی طرح کوٹوں کی کھونٹیوں کے نیچے لیٹ گیا ۔

"بیٹی ' میجر نے کوئی مزید وزیٹنگ کارڈ بھیج دیا ہے ؟"

سوفی نے اس کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور اس نے دیکھا کہ اس مرتبہ اس نے
کسی اور عہد کے ملبوسات زیب تن کر رکھے ہیں ۔ اس کے سر پر لمبے اور گھونگریالے
بالوں کی وگ (wig) تھی اور اس کے جسم پر خاصا کھلا اور ڈھیلا ڈھالا سوٹ تھا جس پر
ڈھیروں لیس لگی ہوئی تھی ۔ اس کے گلے میں بھڑکیلا ریشمی سکارف تھا اور اس نے اپنے
سوٹ کے اوپر بے آستین کا چغہ پہن رکھا تھا جس کا گلا بند تھا ۔ اس نے اپنے پاؤں میں

سفید لمبی جرابیں اور چمڑے کے پھندنے دار پیٹنٹ شو پہن رکھے تھے۔ ان تمام ملبوسات کو دیکھ کر سوفی کو لوئی چہاردہم (2) کے دربار کی تصویریں یاد آ گئیں جو اس نے کبھی دیکھی تھیں۔

"مسخرے!" اس نے کہا اور کارڈ اسے تھما دیا۔

"ہونہہ!... تو تمہیں دس کراؤن عین اسی جگہ ملے تھے جہاں اس نے بعد میں کارڈ رکھ دیا۔"

"بالکل۔"

"یہ شخص روز بروز گستاخ تر ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ اس میں خوش قسمتی کا کوئی پہلو نکل آئے۔"

"کیوں؟"

"اس سے اس کا بھانڈا پھوڑنا آسان ہو جائے گا۔ لیکن اس کا یہ داؤ بالکل ہی نمائشی اور بد ذوقی کا مظہر ہے۔ اس سے تقریباً گھٹیا پرفیوم کی بو آتی ہے۔"

"پرفیوم؟"

"گھٹیا پرفیوم دیکھنے میں تو بہت نفیس معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ہوتا نقلی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ جس گھٹیا انداز سے ہماری نگرانی کر رہا ہے، اس نے اس کا موازنہ مشیت ایزدی سے کر دیا ہے؟"

اس نے کارڈ ذرا اوپر اٹھایا اور پھر اسے پرزے پرزے کر ڈالا۔ اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں وہ اس کا مزاج مزید برہم نہ کر دے، وہ اس کارڈ کا ذکر کرنے سے محترز رہی جو سکول میں اس کی کاپی سے نکل کر نیچے گر پڑا تھا۔

"آؤ، اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ وقت کیا ہوا ہے؟"

"چار بج چکے ہیں۔"

"آج ہم سترھویں صدی کے متعلق گفتگو کریں گے۔"

وہ نشستی کمرے میں چلے گئے جس کی دیواریں ترچھی تھیں اور جس کی ایک دیوار میں روشن دان تھا۔ سوفی نے دیکھا کہ اس نے پچھلی مرتبہ جو اشیا باہر رکھی ہوئی تھیں، وہ اٹھالی گئی تھیں اور اب ان کی جگہ وہاں بالکل ہی مختلف اشیا پڑی تھیں۔

کافی کی میز پر ایک چھوٹا سا ڈبا پڑا تھا۔ اس کا شمار نوادرات میں کیا جا سکتا تھا اور اس میں عینکوں کے طرح طرح کے شیشے (lenses) تھے۔ ڈبے کے قریب ایک کتاب

رکھی ہوئی تھی ۔ یہ کتاب کھلی تھی اور واقعی بہت پرانی معلوم ہوتی تھی ۔

"وہ کیا ہے ؟"

"یہ دیکارت (Descartes) کے فلسفیانہ مضامین پر مشتمل کتاب کا پہلا ایڈیشن (3) ہے ۔ یہ ایڈیشن 1637ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا ۔ اس میں اس کا مشہور مقالہ "طریق کار پر گفتگو" (Discourse on Method) پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا ۔ یہ کتاب میری خاص الخاص اور انتہائی قیمتی املاک میں شامل ہے اور میں اسے حرز جان بنا کر رکھتا ہوں ۔"

"اور یہ ڈبا؟"

"اس میں لینزوں (عدسوں) ــــــ دیکھنے کے شیشوں ــــــ کا ذخیرہ ہے ۔ اس قسم کے لینز صرف میرے پاس ہیں ، کسی اور کے پاس نہیں ۔ انہیں ولندیزی فلسفی سپینوزا نے لگ بھگ سترھویں صدی کے وسط میں صیقل کیا تھا ۔ یہ بے انتہا قیمتی تھے اور آج بھی میری بیش بہا املاک میں شمار ہو سکتے ہیں ۔"

"اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ سپینوزا اور دیکارت کون تھے ، پھر میں شاید بہتر طور پر اندازہ لگا سکوں گی کہ یہ اشیا کتنی قیمتی ہیں ۔"

"بالکل ۔ لیکن پہلے ہمیں اس عہد کو جان لینا اور سمجھ لینا چاہیے جس میں یہ رہتے تھے ۔ بیٹھ جاؤ ۔"

وہ انہی نشستوں پر بیٹھ گئے جن پر وہ گزشتہ ملاقات کے دوران میں بیٹھے تھے ۔ سوفی نے بازوؤں والی بڑی کرسی سنبھال لی اور البرٹو کنوکس صوفے پر متمکن ہو گیا ۔ دونوں کے درمیان میں کافی کی میز پڑی تھی ۔ کتاب اور ڈبا اسی میز پر دھرے ہوئے تھے ۔ البرٹو نے اپنی وگ اتار دی اور اس نے اسے لکھنے کی ڈیسک پر رکھ دیا ۔

"ہم سترھویں صدی کے ــــــ یا جسے ہم عام طور پر بیروق عہد کہتے ہیں ــــــ بارے میں گفتگو کریں گے ۔"

"بیروق عہد ؟ کیسا عجیب نام ہے !"

"لفظ بیروق (baroque) (4) جس لفظ سے مشتق ہے ، اسے پہلے بے قاعدہ شکل کے موتی (pearl) کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ۔ بے قاعدگی بیروق آرٹ کا خاص الخاص وصف ہے ۔ نشاۃ ثانیہ کے دور کا آرٹ نسبتاً کہیں سیدھا سادھا اور آسانی سے سمجھنے میں آنے والا تھا اور ہم آہنگی اس کی خاص خوبی تھی ۔ اس کے مقابلے

میں بیروق آرٹ تقابلی یا متبائن شکلوں (contrastive forms) پر مشتمل ہوتا تھا۔ مجموعی طور پر سترھویں صدی کا نمایاں وصف ایسے تضادات (contrasts) کے مابین کشمکش ہے جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنا خاصا ٹیڑھا کام تھا۔ ایک طرف تو نشاۃ ثانیہ کی دائمی رجائیت تھی ـــــ اور دوسری طرف ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو رہبانیت اور نفس کشی کے پردے میں دنیا کی تمام نعمتوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے کر دوسری انتہا پر چلے جاتے تھے۔ لیکن آرٹ اور حقیقی زندگی میں بھی ہمیں بظاہر طرح دار، مرصع اور پر جلال لیکن حقیقتاً نمائشی شکلیں ملتی ہیں، جب کہ اسی زمانے میں ایک ایسی خانقاہی تحریک نے پر پرزے نکالے جس نے دنیا سے بالکل ہی منہ موڑ لیا۔"

"دوسرے الفاظ میں عظیم الشان فلک بوس محلات اور دور دراز واقع خانقاہیں دونوں ہی۔"

"ہاں۔ تم یقیناً یہ کہہ سکتی ہو۔ بیروق عہد کی ایک مقبول عام کہاوت لاطینی ترکیب 'carpe diem' ـــــ 'دن کو اپنے قبضے میں لے لو' ـــــ تھی۔ ایک اور لاطینی ترکیب، جس کا بکثرت حوالہ دیا جاتا تھا، 'memento mori' تھی۔ اس کا مطلب ہے: 'یاد رکھو تم نے ایک روز مرنا ہے۔' آرٹ میں تصویر اس طرح بنائی جاتی تھی کہ ایک طرف انتہائی پرتعیش طرز زندگی دکھائی جاتی اور دوسری طرف کسی کونے میں چھوٹی سی کھوپڑی کی شکل بھی بنا دی جاتی۔

"کئی اعتبار سے بیروق عہد کی خاص الخاص خصوصیت خود نمائی اور تصنع تھی۔ لیکن اس کے ساتھ بے شمار لوگوں کو سکے کے دوسرے رخ کی بھی بڑی فکر رہتی تھی، انہیں اشیا کی بے ثباتی فطرت سے بہت تشویش ہوتی تھی۔ یعنی وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہمارے گرد و پیش جو حسن و جمال ہے، وہ چند روزہ ہے اور ایک روز فنا ہو جائے گا۔"

"یہ بالکل صحیح ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ کسی چیز کو ثبات حاصل نہیں۔"

"تم بالکل اسی طرح سوچتی ہو جس طرح سترھویں صدی کے بہت سے لوگ سوچتے تھے۔ بیروق عہد ایک لحاظ سے سیاسی معنوں میں بھی کشمکش کا زمانہ تھا۔ یورپ کو جنگوں نے تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ بدترین تیس سالہ (5) جنگ تھی جو 1618 سے

1648 تک بھڑکتی رہی ۔ درحقیقت یہ ایک جنگ نہیں تھی ' بلکہ جنگوں کا سلسلہ تھا جس نے جرمنی کا خاص طور پر بھرکس نکال دیا ۔ اس تیس سالہ جنگ کا ایک اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ فرانس بتدریج یورپ کی غالب قوت بن گیا۔"

"یہ جنگیں کیوں ہوئیں؟"

"بڑی حد تک تو یہ جنگیں پروٹسٹنوں اور رومن کیتھولکوں کے درمیان تھیں ۔ لیکن ان کا ایک پہلو سیاسی قوت کا حصول بھی تھا۔"

"کم و بیش لبنان کی طرح ۔"

"جنگوں کے علاوہ سترھویں صدی عظیم طبقاتی اختلافات کا بھی زمانہ تھا ۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے ورسائی (6) دربار اور فرانسیسی امرا کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ سنا ہوگا ۔ لیکن یہ مجھے معلوم نہیں کہ تم نے فرانسیسی عوام کی غربت کے بارے میں بھی کچھ پڑھا سنا ہے یا نہیں ۔ لیکن جمال و جلال کی ہر نمائش سے پہلے قوت کی نمائش لازماً ہوتی ہے ۔ اکثر کہا گیا ہے کہ بیروق عہد کی سیاسی صورت حال اس کے آرٹ اور فن تعمیر سے مختلف نہیں تھی ۔ بیروق عہد کی عمارتوں کا نمایاں وصف کثیر تعداد میں ان کے مرصع اور زیبائشی کونے اور طاقچے تھے ۔ اس سے قدرے ملتے جلتے انداز سے سیاسی صورت حال کا نمایاں وصف سازشیں 'ریشہ دوانیاں اور اعلیٰ شخصیتوں کے قتل تھے ۔"

" کیا سویڈن کے ایک بادشاہ کو تھیئٹر میں قتل نہیں کیا گیا تھا؟"

" تم گستاف سوم (7) (Gustav III) کے متعلق سوچ رہی ہو ۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں ' یہ اس کی اچھی مثال ہے ۔ گستاف سوم کا قتل 1792 سے پہلے نہیں ہوا لیکن حالات بالکل بیروق عہد کے تھے ۔ جب اس کا قتل ہوا ' وہ ایک بہت بڑے بال (ball) میں شریک تھا ۔ یہ وہ بال تھا جس کے شرکا نقاب پہن کر آتے تھے (اور یوں کسی کو پہچاننا آسان نہیں ہوتا تھا) ۔"

"میرا خیال تھا کہ اس کا قتل تھیئٹر میں ہوا تھا۔"

" نقاب پوش شرکا کا یہ عظیم بال اوپیرا ہاؤس میں منعقد ہوا تھا ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سویڈن میں بیروق عہد کا خاتمہ گستاف سوم کے قتل کے ساتھ ہوا ۔ اس کے عہد میں ' روشن خیال استبدادیت ' کی حکومت تھی ' بالکل اسی طرح جس طرح تقریباً سو سال قبل لوئی چہاردہم کی حکومت تھی ۔ گستاف سوم بھی خودستائی کا مارا ہوا تھا اور فرانسیسی دربار کے کروفر 'رسوم و تکلفات اور آداب پر جان چھڑکتا تھا ۔ اسے تھیئٹر بھی بہت بھاتا

تھا۔۔۔"

"۔۔۔اور یہی چیز اسے لے ڈوبی اور اس کی موت کا سبب بنی۔"

"لیکن بیروق عہد کا تھیئٹر آرٹ فارم سے بڑھ کر تھا۔ اسے عہد کی علامت کے طور پر بکثرت استعمال کیا جاتا تھا۔"

"کس چیز کی علامت؟"

"سوفی، زندگی کی۔ مجھے معلوم نہیں کہ سترھویں صدی میں کتنی مرتبہ کہا گیا کہ 'زندگی تھیئٹر ہے۔' بہرحال کہا یہ اکثر جاتا تھا۔ بیروق عہد نے جدید تھیئٹر کو ـــــ اپنی سینری کی تمام شکلوں اور تھیئٹر کی مشینری کے ساتھ ـــــ جنم دیا۔ تھیئٹر میں ایک قسم کا التباس یا سراب (illusion) پیدا کیا جاتا تھا ـــــ اس کا آخری مقصد یہ دکھانا ہوتا تھا کہ تھیئٹر محض سراب ہے۔ یوں تھیئٹر عمومی اعتبار سے انسانی زندگی کا عکاس بن گیا۔ تھیئٹر میں یہ دکھایا جاسکتا تھا کہ 'غرور زوال کا پیش رو' ہوتا ہے اور اس طرح وہ انسانی کمزوریوں کا بے رحم خاکہ پیش کردیتا تھا۔"

"شیکسپیئر بھی بیروق عہد میں رہتا تھا؟"

"اس نے اپنے عظیم ترین ڈرامے سن 1600 کے آس پاس لکھے تھے، چنانچہ اس کا ایک قدم نشاۃ ثانیہ کے دور میں اور دوسرا بیروق عہد میں ہے۔ زندگی بطور تھیئٹر کے موضوع پر شیکسپیئر کے ڈراموں میں باربار خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ان کے چند اقتباسات سننا چاہو گی؟"

"جی ہاں۔"

"As you Like It" میں وہ کہتا ہے:

All the world's stage,

And all the men and women merely players :

They have their exits and their entrances ;

And one man in his time plays many parts. (8)

اور "میکبتھ" میں وہ کہتا ہے:

Life's but a walking shadow, a poor player
That struts and frets his hour upon the stage,
And then is heard no more; it is a tale
Told by an idiot , full of sound and fury,
Signifying nothing (9).

"اف ، کتنی قنوطی باتیں ہیں!"

"وہ اکثر سوچتا رہتا تھا کہ زندگی کتنی مختصر ہے ۔ تم نے شیکسپیئر کا مشہور ترین مصرعہ تو سنا ہی ہو گا؟"

"To be or not to be _ that is the question (10)."

"ہاں ۔ یہ ہیملٹ کی زبان سے ادا ہوا تھا ۔ ایک روز ہم دھرتی پر چل پھر رہے ہوتے ہیں ـــــ اور اگلے روز ہم مر چکے اور یہاں سے جا چکے ہوتے ہیں ۔"

"شکریہ ۔ مجھے نکتہ سمجھ میں آگیا ہے ۔"

"جب بیروق عہد کے شاعر زندگی کا موازنہ سٹیج سے نہیں کر رہے ہوتے تھے ، وہ اس کا موازنہ خوابوں سے کرنے لگتے ۔ مثلاً شیکسپیئر کہتا ہے : ہم وہ چیزیں ہیں جن سے خواب بنے جاتے ہیں اور ہماری مختصر زندگی کا انجام نیند پر ہوتا ہے . . ."

"یہ تو بڑی شاعرانہ بات ہے ۔"

"ہسپانوی ڈرامہ نگار کالدے راں دلا بارکا (Calderon de la Barca) نے ، جو سن 1600 میں پیدا ہوا تھا ، ایک ڈرامہ 'زندگی خواب ہے' (Life is a Dream) کے عنوان سے لکھا تھا ۔ اس میں وہ کہتا ہے : 'زندگی کیا ہے ؟ جنون ۔ زندگی کیا ہے ؟ سراب' سایہ ' کہانی ' اور عظیم ترین اچھائی بالکل ناکافی ہوتی ہے کیونکہ زندگی خواب ہے . . .'"

"شاید وہ صحیح کہتا ہو ۔ ہم نے سکول میں ایک ڈرامہ پڑھا تھا ۔ اس کا نام 'Jepp on the Mount' تھا ۔"

"ہاں ۔ لڈوگ ہول برگ (11) کا ۔ ہاں ' وہ سکنڈے نیویا کی قد آور شخصیت تھا ۔ بیروق عہد جس طرح روشن خیالی کے عہد میں تبدیل ہوا ' اس کا اس کی تحریروں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔"

"جیپ بیٹھا بیٹھا کسی کھائی میں سو جاتا ہے . . . اور جب اس کی آنکھ کھلتی

ہے، وہ بیرن (نواب) کے پلنگ پر دراز ہوتا ہے ۔ چنانچہ وہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ جو اپنے آپ کو زرعی کارندہ سمجھتا رہا تھا، محض خواب ہوگا ۔ اور پھر جب اسے دوبارہ نیند آتی ہے، بیرن کے ملازم اسے ایک بار پھر کھائی میں پہنچا دیتے ہیں ۔ جب اس مرتبہ اس کی آنکھ کھلتی ہے، وہ سوچنے لگتا ہے کہ اس نے بیرن کے پلنگ پر سونے کا محض خواب دیکھا ہوگا ۔"

"ہول برگ نے یہ موضوع کالدے راں سے اور کالدے راں نے اسے عربی قصوں کی پرانی کتاب 'الف لیلہ ولیلہ (12) ' سے مستعار لیا تھا ۔ تاہم زندگی کو خواب سے تشبیہ دینا ایک ایسا موضوع ہے جس پر اس سے بھی کہیں پہلے خامہ فرسائی ہوچکی تھی اور اس معاملے میں برصغیر اور چین کسی سے پیچھے نہیں تھے ۔ مثلاً زمانہ قدیم کے سرد و گرم چشیدہ اور جہاں دیدہ عالم و عارف چوانگ تسو نے کہا تھا: 'ایک مرتبہ میں نے خواب دیکھا کہ میں تتلی ہوں اور اب مجھے معلوم نہیں کہ میں چوانگ تسو (13) ہوں جس نے خواب دیکھا تھا کہ وہ تتلی ہے یا یہ کہ میں تتلی ہوں جو خواب دیکھ رہی ہے کہ وہ چوانگ تسو ہے ۔'"

"خیر، دونوں میں سے کسی ایک بات کو بھی ثابت کرنا ناممکن تھا ۔"

"یہاں ناروے میں ہمارا ایک صحیح معنوں میں بیروق شاعر تھا ۔ اس کا نام پیٹر ڈاس (Petter Dass) تھا ۔ وہ 1647 سے 1707 تک زندہ رہا ۔ ایک طرف تو اسے یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ وہ کسی طرح اس زندگی کو جیسی یہاں اور اب ہے، بیان کرسکے اور دوسری طرف اس کا زور اس بات پر ہوتا تھا کہ صرف خدا الباقی (eternal) والقائم (constant) ہے ۔"

"' خدا خدا (14) ہی رہے گا خواہ زمین کا چپہ چپہ ویران ہوجائے، خدا خدا ہی رہے گا خواہ ہر شخص کو موت آجائے ۔'"

"لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس نے شمالی ناروے کی دیہاتی زندگی ــــ بحر اوقیانوس کی بوم مچھلیوں (bump fish)، کوڈ (cod) مچھلیوں اور سیاہ کام مچھلیوں (coal fish) ــــ کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ خاص الخاص بیروق وصف ہے کہ ایک ہی سانس میں زمینی، یہاں کی اور اب کی اشیا ــــ اور سماوی اور اخروی اشیا ــــ کا بیان کردیا جاتا ہے ۔ اس سے وہ تفریق یاد آجاتی ہے جو افلاطون نے حواس کی ٹھوس دنیا اور امثال کی ناقابل تغیر دنیا کے مابین قائم کی تھی ۔"

"ان لوگوں کا فلسفہ کیا تھا؟"

"ان کے فلسفے کی نمایاں خصوصیت بھی ایک دوسرے سے کلیتہً متضاد فکری اسالیب کے مابین زبردست کشمکش ہے ۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ بعض فلسفیوں کا ایقان تھا کہ جو کچھ موجود ہے ، وہ فطرت کے اعتبار سے اصلاً روحانی ہے ۔ اس نقطہ نظر کو عینیت (idealism) کہا جاتا ہے ۔ اس سے متضاد نقطہ نظر کو مادیت (materialism) کا نام دیا جاتا ہے ۔ اس سے مراد وہ فلسفہ ہے جس کا دعویٰ ہے کہ تمام حقیقی اشیا ٹھوس مادی مادوں (concrete material substances) سے تشکیل پاتی ہیں ۔ سترھویں صدی میں بھی مادیت کے بے شمار حمایتی اور قصیدہ خواں موجود تھے ۔ ان میں غالباً سب سے زیادہ بااثر انگریز فلسفی ٹامس ہوبز (15) تھا ۔ اس کا عقیدہ تھا کہ تمام مظاہر ، جن میں انسان اور حیوان بھی شامل ہیں ، محض اور محض مادے کے ذرات (particles) پر مشتمل ہیں ، بلکہ انسانی شعور ـــــ یا روح (soul) ـــــ بھی دماغ میں موجود ننھے ننھے ذرات کی حرکت سے متشکل ہوتی ہے ۔"

"تو دیموکری توس نے جو کچھ دو ہزار سال قبل کہا تھا ، وہ اس سے متفق تھا؟ ۔"

"عینیت اور مادیت دونوں ایسے موضوع ہیں جو فلسفے کی تاریخ میں ہمیشہ موجود رہے ہیں ۔ لیکن ان دونوں موضوعات کا ذکر اتنے واضح انداز سے کبھی نہیں ہوا تھا جتنا کہ بیروق عہد میں ہوا ۔ مادیت کو مستقل نئی سائنسوں سے غذا ملتی رہی ۔ نیوٹن ثابت کر چکا تھا کہ حرکت کے یکساں قوانین کا ساری کائنات پر اطلاق ہوتا ہے اور یہ کہ دنیائے فطرت کی ـــــ خواہ ان کا تعلق زمین سے ہو یا خلا سے ـــــ تمام تبدیلیوں کی توضیح اجسام کی آفاقی کشش ثقل اور حرکت (کے قوانین کی مدد) سے کی جا سکتی ہے ۔

"ہر چیز پر یکساں ناقابل شکست قوانین ـــــ یا یکساں میکانیات (mechanisms) حاوی ہیں ۔ چنانچہ اصولی طور پر تمام قدرتی تبدیلیوں کو ریاضیاتی صحت (precision) کے ساتھ ماپنا ممکن ہے ۔ اور یوں نیوٹن نے اس چیز کو جسے ہم عالم کا میکانکی نظریہ (Mechanistic world view) کہتے ہیں ، مکمل کر دیا ۔"

"کیا وہ دنیا کو کوئی بڑی مشین تصور کرتا تھا؟"

"وہ واقعی یہی سمجھتا تھا ۔ لفظ مکینک (mechanic) یونانی لفظ 'mechane' سے مشتق ہے جس کا مطلب مشین (machine) ہے ۔ یہ بات قابل غور ہے کہ نہ ہوبز

کو اور نہ نیوٹن کو عالم کے میکانکی نقطہ نظر اور خدا پر ایمان کے درمیان کوئی تضاد نظر آتا تھا۔ لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تمام مادیت پسندوں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ فرانسیسی طبیب اور فلسفی لامیتنی (La Mettrie) نے اٹھارھویں صدی میں ایک کتاب بعنوان 'L' homme machine'، جس کا مطلب 'انسان ـــــ مشین' ہے، لکھی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جس طرح چلنے کے لیے ٹانگ کے عضلات ہوتے ہیں، اسی طرح سوچنے کے لیے دماغ کے 'عضلات' ہوتے ہیں۔ بعد ازاں فرانسیسی ریاضی دان لاپلاس (16) نے ایک انتہا پسندانہ میکانکی نقطہ نظر پیش کردیا۔ اس نے کہا تھا: 'اگر کسی معینہ وقت پر ذہانت کو مادے کے تمام ذرات کی پوزیشن کا علم ہوجاتا، کوئی چیز بھی نامعلوم (unknown) نہ رہتی اور مستقبل اور ماضی دونوں کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے موجود ہوتے۔' یہاں جو خیال پیش کیا گیا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے وہ پہلے سے مقدر ہوتا ہے۔ 'ستاروں میں لکھ دیا گیا ہے' کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ اسے (فلسفہ) جبریت (determinism) کہتے ہیں۔"

"تو (ان کے خیال کے مطابق) آزاد منشا (free will) نام کی کوئی چیز نہیں؟"

"نہیں۔ (وہ سمجھتے تھے کہ) ہر چیز ـــــ یہاں تک کہ ہمارے خیالات اور خواب بھی ـــــ مشینی عمل (process) کی پیداوار ہے۔ انیسویں صدی کے جرمن مادیت پسندوں نے دعویٰ کیا تھا کہ خیال کا دماغ کے ساتھ وہی رشتہ ہوتا ہے جو پیشاب کا گردوں سے یا جو پتے کا جگر سے ہوتا ہے۔"

"لیکن پیشاب اور پتا تو مادی اشیا ہیں، جب کہ خیالات نہیں۔"

"یہاں تمہاری گرفت میں بنیادی نوعیت کی چیز آگئی ہے۔ میں اسی چیز کے متعلق تمہیں ایک کہانی سنا سکتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک روسی خلا نورد اور ایک روسی نیورو سرجن (امراض دماغ کا سرجن) کے مابین مذہب پر بحث ہو رہی تھی۔ نیورو سرجن عیسائیت میں ایمان رکھتا تھا جب کہ خلا نورد نہیں۔ خلا نورد نے کہا: 'میں کئی مرتبہ خلا میں جاچکا ہوں لیکن مجھے کبھی خدا نظر آیا نہ فرشتے۔' نیورو سرجن نے جواب دیا 'میں بے شمار لائق فائق دماغوں کے آپریشن کرچکا ہوں لیکن مجھے خیال نام کی کبھی ایک چیز بھی نظر نہیں آئی۔'"

"لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خیالات موجود ہی نہیں ہوتے۔"

"نہیں ۔ تاہم اس سے اس حقیقت کی اہمیت ضرور اجاگر ہوتی ہے کہ خیالات ان اشیا میں شامل نہیں جن کا آپریشن کیا جاسکتا یا جنہیں مہین اجزا میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ مثلاً سراب (delusion) ہی کو لو ۔ جراحی کے ذریعے اس کا اخراج آسان نہیں ۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ یہ اتنا گہرائی میں چلا جاتا ہے کہ جراح کے ہاتھ نہیں آسکتا ۔ سترھویں صدی کے ایک اہم فلسفی لائب نٹس (Leibniz) (17) نے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ مادی اور روحانی (اشیا) کے مابین صحیح صحیح فرق یہ ہے کہ مادی اشیا کو مہین سے مہین ترین اجزا میں منقسم کیا جاسکتا ہے لیکن روح (soul) کو تو دو حصوں میں بھی تقسیم نہیں کیا جاسکتا ۔"

"نہیں ۔ اس مقصد کے لیے آپ کس قسم کا نشتر استعمال کریں گے ؟"

البرٹو نے نفی میں محض سر ہلا دیا ۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے دونوں کے بیچ میز کی طرف اشارہ کیا اور کہا :

"سترھویں صدی کے دو عظیم ترین فلسفی دیکارت اور سپینوزا تھے ۔ وہ بھی 'روح' اور 'جسم' کے مابین تعلق جیسے سوالات سے نبرد آزما رہے ' اور اب ہم ان کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کریں گے ۔"

"پھر شروع ہو جائیں ۔ لیکن اتنا یاد رکھیں کہ مجھے سات بجے تک گھر پہنچنا ہے ۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی ۔"

18۔ دیکارت

* * *

...وہ موقع سے ہر قسم کا ملبا صاف کر دینا چاہتا تھا...

البرٹو اٹھا' اس نے اپنا سرخ چغہ اتارا اور کرسی پر رکھ دیا۔ تب اس نے ایک بار پھر صوفے کے کونے میں اپنی نشست سنبھال لی۔

"رینے دیکارت (Rene Descartes) 1596 میں پیدا ہوا تھا اور وہ اپنی زندگی کے مختلف ادوار کے دوران میں یورپ کے متعدد ممالک میں سکونت پذیر رہا۔ ابھی وہ اوائل شباب کے عہد میں گزر رہا تھا کہ اس میں انسان اور کائنات کے سربستہ رازوں کا ادراک حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہوگئی۔ لیکن فلسفے کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے روز افزوں اپنی جہالت اور لاعلمی کا یقین ہونے لگا۔"

"سقراط کی طرح؟"

"ہاں' کم و بیش اسی کی طرح۔ سقراط کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ یقینی علم کا حصول صرف عقل کے ذریعے ممکن ہے۔ جو کچھ پرانی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں' ہم اس پر کبھی اعتماد نہیں کر سکتے۔ جو کچھ ہمارے حواس ہمیں بتاتے ہیں' ہم اس پر بھی اعتماد نہیں کر سکتے۔"

"افلاطون کا بھی یہی خیال تھا۔ اس کا ایقان تھا کہ صرف عقل ہی یقینی علم تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔ سقراط اور افلاطون سے براستہ سینٹ آگسٹین دیکارت تک میراث

کا طویل لیکن سیدھا سلسلہ پہنچتا ہے ۔ وہ سب کے سب مثالی عقلیت پسند تھے اور انہیں یقین تھا کہ صرف عقل کے ذریعے علم تک رسائی ہوسکتی ہے ۔ وسیع مطالعے کے بعد دیکارت اس نتیجے پر پہنچا کہ علم کا جو ذخیرہ قرون وسطیٰ سے اگلی نسلوں کو منتقل ہوا ہے ، ضروری نہیں کہ وہ سارے کا سارا ناقابل اعتبار ہو ۔ اس کا موازنہ تم سقراط کے ساتھ کرسکتی ہو جو ان عام آرا پر اعتماد نہیں کرتا تھا جن سے اس کا واسطہ ایتھنز کے وسطی چوک میں پڑتا تھا ۔ چنانچہ ان حالات میں ، سوفی ، آدمی کو کیا کرنا چاہیے ؟ تم مجھے بتا سکتی ہو ؟"

"آپ اپنے فلسفے کے خدوخال خود سوچنا شروع کردیں گے ۔"

"بالکل صحیح ۔ جس طرح سقراط نے ایتھنز کے لوگوں کے ساتھ باتیں کرکے اپنی زندگی گزار دی ، بعینہٖ دیکارت نے یورپ کے مختلف ممالک میں گھومنے پھرنے کا فیصلہ کرلیا ۔ وہ بتاتا ہے کہ تب اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دانش کی تلاش تک محدود رکھے گا اور اس کا خیال تھا کہ اسے یہ دانش یا تو اپنے باطن میں اور یا پھر 'دنیا کی عظیم کتاب ' سے دستیاب ہوسکے گی ۔ چنانچہ وہ فوج میں بھرتی ہوگیا اور جنگوں میں داد شجاعت دینے لگا ۔ ان جنگوں میں شرکت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسے یورپ کے وسطی علاقوں میں طویل اوقات گزارنے کا موقع مل گیا ۔ بعد ازاں وہ چند سال پیرس میں مقیم رہا لیکن 1629 میں وہ ہالینڈ چلا گیا ۔ وہاں وہ تقریباً بیس سال تک اپنی ریاضیاتی اور فلسفیانہ تحریریں رقم کرنے میں مصروف رہا ۔

" 1649 میں ملکہ کرسٹینا (1) نے اسے سویڈن آنے کی دعوت دی لیکن اس ملک میں ، جسے وہ ' ریچھوں ' برفوں اور چٹانوں کی سرزمین ' کہا کرتا تھا ، مختصر قیام کے دوران میں اس پر نمونیا کا حملہ ہوا اور وہیں 1650 کے موسم سرما میں اس کا انتقال ہوگیا۔

"تو جب اس کا انتقال ہوا ، اس کی عمر صرف چون برس تھی ۔"

"ہاں ۔ لیکن اپنے انتقال کے بعد بھی اس نے فلسفے پر زبردست اثر ڈالنا تھا ۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ دیکارت جدید فلسفے کا جد اعلیٰ تھا ۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں انسان اور فطرت کی مخمور کن دریافت نو کے بعد معاصر فکر کو مربوط فلسفیانہ نظام میں ڈھالنے کی دوبارہ ضرورت پیش آگئی تھی ۔ اس نظام کی تشکیل کرنے والوں میں قابل قدر اولیت کا سہرا دیکارت کے سر بندھتا ہے ۔ سپینوزا ، لائب نٹس ، لاک ، بارکلی ، ہیوم اور کانٹ اس

کے بعد آئے۔"

"فلسفیانہ نظام سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"اس سے میری مراد وہ فلسفہ ہے جس کی بنیادیں زمین سے اٹھائی جاتی ہیں اور جس کی دردسری فلسفے کے تمام مرکزی سوالوں کی توضیح تلاش کرنا ہے۔ عہد عتیق کو اپنے فلسفیانہ نظام کی تشکیل کرنے کے لیے افلاطون اور ارسطو جیسے عظیم مفکر مل گئے تھے۔ قرون وسطی میں یہ کام سینٹ ٹامس ایکوائی نیس نے سرانجام دیا جس نے ارسطو کے فلسفے اور عیسائی الہیات کے مابین پل تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر فطرت اور سائنس، خدا اور انسان کے متعلق اپنے پرانے اور نئے عقیدوں کے بے ترتیب، ژولیدہ اور آپس میں گڈمڈ انبار کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کا دور آیا۔ اس دور میں کسی بھی فلسفی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس انبار کی مدد سے کوئی منظم فلسفیانہ نظام تشکیل دیتا۔ یہ صرف سترھویں صدی میں ممکن ہوا اور اس سلسلے میں جس شخص نے سب سے پہلے کوشش کی وہ دیکارت تھا۔ اگلی نسلوں کی نظروں میں جس چیز نے فلسفے کا اہم ترین پراجیکٹ بننا تھا، وہ اس کا پیش رو تھا۔ عمارت بھلے دوسروں نے تعمیر کی ہو لیکن بنیادیں اسی نے اٹھائی تھیں۔ اس کی بڑی دردسری یہ تھی کہ ہم کیا جان سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں یقینی علم کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ دوسرا عظیم سوال، جس میں وہ مستغرق رہا، یہ تھا کہ جسم اور دماغ کے مابین تعلق کیا ہے۔ یہ دونوں سوال اگلے ڈیڑھ سو سال کے لیے فلسفیانہ استدلال کا موضوع بنے رہے۔"

"وہ لازماً اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوگیا ہوگا۔"

"واہ! لیکن سوال کا تعلق اس کے (اپنے) عہد سے تھا۔ جب معاملہ یقینی علم کے حصول کا آیا، اس کے متعدد معاصرین نے کامل فلسفیانہ تشکیک (skepticism) کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ لیکن دیکارت ان سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو وہ صحیح معنوں میں فلسفی نہ ہوتا۔ ہم یہاں ایک بار پھر سقراط کے ساتھ موازنہ کرسکتے ہیں جو سوفسطائیوں کی تشکیک کو بہ نگاہ تحسین نہیں دیکھتا تھا۔ اور یہ دیکارت کی زندگی ہی کے دوران میں ہوا کہ نئے طبعی علوم نے ایک ایسے طریق کار کو پروان چڑھانا شروع کردیا جس کے ذریعے فطرت کی عمل کاریوں (processes) کو یقینی اور بالکل صحیح انداز میں بیان کیا جاسکتا تھا۔

"اس پر دیکارت اپنے آپ سے پوچھنے پر مجبور ہوگیا کہ کیا فلسفیانہ سوچ بچار کا

اس سے ملتا جلتا کوئی یقینی اور بالکل صحیح طریقہ موجود ہے۔"

"یہ بات میری سمجھ میں آرہی ہے۔"

لیکن یہ بات مسئلے کا محض ایک جزو تھی۔ نئی فزکس نے مادے کی نوعیت کا سوال بھی اٹھا دیا تھا اور یوں یہ مسئلہ بھی سامنے آگیا تھا کہ فطرت کی طبعی عمل کاریوں کا تعین کون کرتا ہے۔ وہ لوگ، جو فطرت کے میکانکی نظریے کی حمایت میں دلائل کے انبار لگا رہے تھے، ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ لیکن طبعی دنیا جتنی زیادہ میکانکی نظر آرہی تھی، جسم اور روح کے مابین تعلق کا سوال اتنی ہی فوری اہمیت کا حامل بنتا جارہا تھا۔ سترھویں صدی تک روح (soul) (2) کو ایک قسم کا 'تنفس حیات' یا 'دم زندگی' (breath of life) سمجھا جاتا رہا تھا جو تمام ذی حیات مخلوق میں جاری وساری ہے۔ درحقیقت 'soul' اور 'spirit' کے اصل اور ابتدائی معانی 'سانس' اور 'سانس لینا' ہیں۔ تقریباً ساری یورپی زبانوں میں اس کا یہی مفہوم ہے۔ ارسطو کے نزدیک روح (soul) ایک ایسی چیز ہے جو نامیاتی جسم (organism) میں ہر جگہ اس کے 'اصول حیات' (life principle) کی حیثیت سے موجود ہے ـــــ اور چنانچہ اسے جسم سے کوئی علیحدہ چیز تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یوں وہ پودے کی روح (soul) اور حیوان کی روح کا ذکر کرنے کے قابل ہوگیا۔ سترھویں صدی تک فلسفیوں نے روح (soul) اور جسم کے مابین کوئی انقلابی (radical) تقسیم متعارف نہیں کرائی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام مادی اشیا کی ـــــ جن میں جسم بھی شامل ہے، انسان کا ہو یا حیوان کا ـــــ حرکات کی یہ توضیح کی جاتی تھی کہ یہ میکانکی عمل کاریوں (processes) کی پیداوار ہیں۔ لیکن انسان کی روح اس جسمانی مشینری کا حصہ متصور نہیں کی جاسکتی تھی، کی بھی کیسے جاسکتی تھی؟ پھر روح (soul) کیا ہے؟ اس کی تشریح کی ضرورت تھی اور یہ تصریح اس لیے بھی ضروری تھی کیونکہ سوال یہ پیدا ہوگیا تھا کہ کوئی 'روحانی' چیز کسی مشینی عمل (process) کو مہمیز کیسے دے سکتی ہے۔"

"واقعی یہ بڑی عجیب سوچ ہے۔"

"عجیب کیا؟"

"میں اپنا بازو اٹھانے کا فیصلہ کرتی ہوں ـــــ اور پھر، خیر، بازو خود بخود اٹھ جاتا ہے۔ یا میں بھاگ کر کوئی بس پکڑنے کا فیصلہ کرتی ہوں اور اگلے سیکنڈ کے دوران میں میری ٹانگیں متحرک ہوجاتی ہیں۔ یا پھر میں کسی پرملال چیز کے بارے میں سوچے

لگتی ہوں اور اچانک میرے آنسو چھلکنے لگتے ہیں - چنانچہ جسم اور شعور کے مابین کوئی پراسرار تعلق ضرور ہو گا۔"

"بالکل یہی وہ مسئلہ ہے جس نے دیکارت کی سوچوں کو پٹری پر چڑھا دیا۔ افلاطون کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ 'روح' (spirit) اور 'مادے' (matter) کے مابین واضح تقسیم موجود ہے - لیکن دماغ کس طرح جسم کو ـــــ یا روح (soul) جسم کو ـــــ متاثر کرتی ہے' افلاطون اس کا کوئی جواب مہیا نہ کر سکا۔"

"مجھے بھی کوئی جواب نہیں سوجھ رہا - چنانچہ میں یہ سننے کے لیے بے چین ہوں کہ دیکارت کا اس بارے میں کیا نظریہ تھا۔"

"وہ کن خطوط پر استدلال کر رہا تھا' آؤ' ان کا جائزہ لیتے ہیں۔"

ان دونوں کے مابین میز پر جو کتاب پڑی تھی ' البرٹو نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"اپنے مقالے 'طریقے پر گفتگو' میں دیکارت نے اس طریقے کا سوال اٹھایا تھا جو فلسفی کو کوئی فلسفیانہ مسئلہ حل کرنے کے سلسلے میں لازماً استعمال کرنا چاہیے - سائنس پہلے ہی یہ نیا طریقہ استعمال کر چکی تھی. . ."

"یہ بات آپ پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔"

"دیکارت کا دعویٰ تھا کہ ہم کسی چیز کو اس وقت تک صحیح (true) تسلیم نہیں کر سکتے جب تک ہم اس کا واضح اور بین انداز سے ادراک نہیں کر لیتے - اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بعض اوقات یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مرکب (compound) مسئلے کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ مفرد (single) عناصر (یا اجزا) میں تقسیم کر دیا جائے - پھر ان تمام اجزا میں جو آسان ترین خیال ہے ' اسے ہم اپنا نقطہ آغاز بنا سکتے ہیں - تم کہہ سکتی ہو کہ جس انداز سے گلیلیو ہر چیز کو ماپنا اور تولنا اور ہر ناقابل ماپ و تول کو قابل ماپ اور قابل تول بنانا چاہتا تھا ' تقریباً اسی انداز سے ہر خیال کو بھی لازماً ماپا اور تولا جانا چاہیے - دیکارت کا عقیدہ تھا کہ فلسفہ آسان سے مشکل اور پیچیدہ کی طرف جانا چاہیے - صرف تبھی کسی نئی بصیرت (insight) کی تشکیل ممکن ہو گی - اور آخر میں اس بات کی ضرورت پیش آئے گی کہ مسلسل گنتی (enumeration) اور نظم و ضبط کے ساتھ یہ یقینی بنا لیا جائے کہ کوئی چیز چھوٹ تو نہیں گئی - صرف تبھی کسی فلسفیانہ نتیجے تک ہماری رسائی ممکن ہو گی۔"

"یہ تو تقریباً ریاضی کا پرچہ معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ دیکارت ریاضی دان تھا۔ اسے تحلیلی جیومیٹری (analytical geome-try) کا جد اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔یہی نہیں، اس نے الجبرے کے علم میں بھی قابل قدر اضافے کئے تھے۔ وہ فلسفہ کاری (philosophizing) میں بھی ریاضیاتی طریقہ آزمانا چاہتا تھا۔ وہ بالکل اسی طرح فلسفیانہ صداقتیں (truths) ثابت کرنے میں جت گیا جس طرح کوئی دوسرا آدمی کوئی ریاضیاتی قضیہ (theorem) ثابت کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ بالکل وہی اوزار استعمال کرنا چاہتا تھا جسے ہم تب استعمال کرتے ہیں جب ہم اعداد (figures) پر کام کر رہے ہوتے ہیں یعنی وہ عقل (reason) کو بروئے کار لانا چاہتا تھا کیونکہ حرف عقل ہی سے ہمیں تیقن حاصل ہوسکتا ہے۔ رہے ہمارے حواس، تو یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم ان پر انحصار کرسکتے ہیں یا نہیں۔ہم پہلے ہی ذکر کرچکے ہیں کہ دیکارت کی افلاطون سے گاڑھی چھنتی تھی۔ افلاطون نے بھی تو یہی کہا تھا کہ ہمارے حواس کی شہادت کی نسبت ریاضی اور عددی نسبتیں (numerical ratios) ہمیں زیادہ پر اعتماد بناتی ہیں۔"

"کیا اس طریقے سے فلسفیانہ مسائل حل کئے جاسکتے ہیں؟"

"(اس سلسلے میں) ہمارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ ہم دیکارت کے استدلالی انداز کی طرف رجوع کریں۔ اس کا مقصد زندگی کی فطرت کے متعلق کسی یقینی بات تک پہنچنا ہے، اور وہ اپنی بات کا آغاز اس دعوے سے کرتا ہے کہ ابتدا میں آدمی کو ہر چیز کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا چاہیے۔تم سمجھ گئی ہوگی کہ وہ ریت پر (عمارت) تعمیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"جی۔ کیونکہ اگر بنیاد ہی بیٹھ جائے ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ گرے گی۔"

"ہاں بیٹی، تم نے اس معاملے کو بہت خوبصورتی سے پیش کردیا ہے۔ تاہم دیکارت ہر بات کو شبے کی نگاہوں سے دیکھنے کے عمل کو معقول تصور نہیں کرتا تھا، پھر بھی اس کا خیال تھا کہ اصولی اعتبار سے ہر چیز پر شبہ کرنا ممکن ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ہم یہ قطعاً یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ افلاطون یا ارسطو (کے افکار) کا مطالعہ کرنے کے بعد ہماری فلسفیانہ جستجو میں کوئی پیش رفت ہوجاتی ہے۔ اس سے ہمارے تاریخ کے علم میں تو اضافہ ہوجاتا ہے لیکن دنیا کے متعلق علم میں نہیں۔ دیکارت کے

نزدیک یہ بات بہت اہم تھی کہ اس نے اپنے پیش روؤں سے جو کچھ سیکھا ہے یا دوسروں سے جو کچھ حاصل کیا ہے ' وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرے اور پھر اپنی فلسفیانہ تعمیر کے کام میں جت جائے ۔"

"وہ اپنا نیا مکان تعمیر کرنے سے پہلے موقع سے تمام ملبا اور کوڑا کرکٹ صاف کر دینا چاہتا تھا. . ."

"شکریہ ۔ وہ بالکل تازہ نئی اشیا استعمال کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے یقین ہو سکے کہ اس کی نئی نکری عمارت کھڑی رہ سکے گی (اور طوفانوں کا مقابلہ کرسکے گی) ۔ لیکن دیکارت کے شکوک اس سے کہیں زیادہ گہرے تھے ۔ اس کا کہنا تھا : ' جو کچھ ہمارے حواس بتاتے ہیں ' ہم ان پر اعتبار تک نہیں کرسکتے ۔ ممکن ہے وہ ہمیں دھوکا دے رہے ہوں ۔' "

"یہ کیسے ؟"

"جب ہم خواب دیکھتے ہیں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں حقیقت کا تجربہ ہو رہا ہے ۔ ہمارے بیداری کے احساسات کو ہمارے خواب کے احساسات سے کیا چیز جدا کرتی ہے ؟

"(اس سلسلے میں) دیکارت رقم طراز ہے : ' جب میں اس بات پر توجہ سے غور کرتا ہوں مجھے ایک چیز بھی ایسی نظر نہیں آتی جو قطعیت کے ساتھ حالت بیداری کو خواب سے جدا کرتی ہو ۔ ' اور وہ مزید لکھتا ہے : ' آپ یہ کیسے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی ساری زندگی کوئی خواب نہیں ؟ ' "

"اگرچہ جیپ جاگیردار کے بستر پر سو چکا تھا ' اس کا خیال تھا کہ اس نے محض خواب دیکھا ہے ۔"

"اور جب وہ جاگیردار کے بستر پر لیٹا ہوا تھا ' اس کا خیال تھا کہ اس نے غریب مزارع کی حیثیت سے جو زندگی گزاری تھی ، محض خواب کی بات تھی ۔ اسی طریقے سے دیکارت انجام کار چار و ناچار ہر چیز کو مطلقاً شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے ۔ اس سے پہلے متعدد فلسفی اس مقام پر پہنچ کر مزید آگے جانے میں ناکام ہو چکے تھے ۔"

"چنانچہ وہ زیادہ پیش رفت نہ کرسکے ۔"

"لیکن دیکارت نے اس نقطہ صفر (یا مقام صفر) (Zero point) سے آگے بڑھنے کی کوشش کی ۔ وہ ہر چیز پر شک کرتا تھا اور یہ واحد چیز تھی جس کے متعلق وہ

پر یقین تھا ۔ پھر اسے اچانک کچھ سوجھا اور اس نے کچھ یوں استدلال کیا : ' ایک چیز لازماً صحیح ہونا چاہیے ۔ اور وہ چیز یہ ہے کہ میں شک کرتا ہوں ۔ جب میں شک کرتا ہوں ' مجھے سوچنا پڑتا ہے اور چونکہ میں سوچتا ہوں ' یہ بات یقینی ہونا چاہیے کہ میں سوچنے والی ہستی ہوں ۔ ' یا جیسا کہ اس نے خود بیان کیا تھا : 'Cogito ergo sum'. ۔"

"اس کا مطلب ؟"

"میں سوچتا ہوں ' چنانچہ میں موجود ہوں ۔"

"مجھے یہ جان کر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ وہ یہ بات سمجھ گیا ۔"

"تمہاری بات خاصی معقول ہے ۔ لیکن اس وجدانی تیقن پر دھیان دو جس کے ساتھ وہ اپنا ادراک ایک سوچنے والی ہستی کی حیثیت سے کرتا ہے ۔ شاید تمہیں یاد آجائے کہ افلاطون نے کیا کہا تھا ' یہی کہ جو کچھ ہم اپنی عقل کی مدد سے سمجھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ حقیقی (real) ہے جس کا ادراک ہم اپنے حواس کی مدد سے کرتے ہیں ۔ ڈیکارٹ کا بھی یہی طریق کار تھا ۔ اس نے نہ صرف یہ ادراک کیا کہ وہ سوچنے والا ' میں ' ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ یہ سوچنے والا ' میں ' مادی دنیا سے زیادہ حقیقی ہے جس کا ادراک ہم اپنے حواس کی مدد سے کرتے ہیں ۔ اور وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا ۔ اس کی فلسفیانہ جستجو کسی اعتبار سے بھی ختم نہیں ہوئی تھی ۔"

"اس کے بعد کیا ہوا ؟"

"اب ڈیکارٹ نے اپنے آپ سے پوچھا : ' کیا کوئی مزید ایسی چیز ہے جس کا میں اسی وجدانی تیقن کے ساتھ ادراک کر سکتا ہوں ؟ ' وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے ذہن میں کامل ذات (perfect entity) کا واضح اور بین تصور موجود ہے ۔ یہ وہ خیال تھا جو ہمیشہ اس کے دماغ میں موجود رہا تھا اور چنانچہ ڈیکارٹ پر یہ بات خود آشکار تھی کہ اس قسم کا خیال امکانی طور پر خود اس کے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتا ۔ اس کا دعویٰ تھا کہ کامل ذات کا تصور کسی ایسے شخص کی تخلیق ہو ہی نہیں سکتا جو خود غیر کامل یا ناقص (imperfect) ہو ۔ چنانچہ کامل ذات کا تصور لازماً خود اس کامل ذات یا بہ الفاظ دیگر خدا کی تخلیق ہو گا ۔ چنانچہ یہ امر کہ خدا موجود ہے ' اسی طرح ڈیکارٹ کے لیے از خود آشکار تھا جس طرح کہ یہ بات کہ کوئی سوچنے والی ہستی لازماً موجود ہو گی ۔"

"یہاں اس نے نتیجہ اخذ کرنے میں بڑی جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے ۔ شروع میں وہ زیادہ محتاط تھا ۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ بہت سے لوگوں نے اسے اس کا کمزور نکتہ قرار دیا ہے۔
تم نے لفظ 'نتیجہ' (conclusion) استعمال کیا ہے۔ دراصل یہ ثبوت کا مسئلہ نہیں تھا۔
دیکارت کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہم سب کسی کامل ذات کے تصور کے مالک ہیں اور اس
تصور میں یہ بات خلقی طور پر موجود ہے کہ اس کامل ذات کا کوئی نہ کوئی وجود ہونا چاہیے۔
کیونکہ اگر کوئی کامل ذات موجود نہیں، پھر وہ کامل ہو ہی نہیں سکتی۔ اور اگر کوئی کامل
ذات موجود نہ ہو، پھر کسی کامل ذات کا تصور ہمارے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔
چونکہ ہم غیر کامل ہیں، چنانچہ کاملیت کا تصور ہمارے ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتا۔
دیکارت کے خیال کے مطابق خدا کا تصور خلقی (innate) ہوتا ہے۔ 'جس طرح کاریگر کا
نشان اس کی ساختہ چیز پر ثبت ہوتا ہے' اسی طرح یہ (تصور) بوقت پیدائش ہی ہم پر
ثبت کر دیا جاتا ہے۔'"

"جی بجا فرمایا، مگر یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ میرے ذہن میں 'مگرہتھ'
(crocophant : مگرمچھ اور ہاتھی کے ملاپ سے جو جانور پیدا ہوگا) کا تصور موجود ہے،
اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ 'مگرہتھ' واقعی وجود ہے۔"

"دیکارت اس کا جواب یہ دیتا کہ 'مگرہتھ' کے تصور میں یہ بات خلقی طور پر
موجود نہیں کہ ایسے جانور کا کوئی وجود ہے۔ اس کے برعکس کامل ذات کے تصور میں یہ
بات خلقی طور پر موجود ہے کہ ایسی ذات کا کوئی نہ کوئی وجود ہے۔ دیکارت کے مطابق یہ
بات اتنی ہی یقینی ہے جتنی کہ یہ بات کسی دائرے کے تصور میں خلقی طور پر موجود ہوتی
ہے کہ دائرے کے تمام نقطے مرکز سے مساوی فاصلے پر واقع ہوتے ہیں۔ تم کوئی ایسا
دائرہ بنا ہی نہیں سکتیں جو اس قانون کی پابندی نہ کرتا ہو۔ چنانچہ تم کسی ایسی کامل
ذات کا تصور بھی نہیں باندھ سکتیں جس میں اس کے اہم ترین وصف یعنی وجود کا
فقدان ہو۔"

"یہ تو سوچنے کا عجیب و غریب طریقہ ہے۔"

"سوچنے کا یہ انداز لاریب تعقل پسندانہ ہے۔ سقراط اور افلاطون کی طرح دیکارت
کو بھی یقین تھا کہ عقل اور وجود کے مابین کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔ آدمی کی عقل پر
کوئی چیز جتنی زیادہ خود آشکار ہوگی، اتنی ہی یہ بات زیادہ یقینی ہو جاتی ہے کہ یہ چیز موجود
ہے۔"

"اب تک وہ اس حقیقت پر پہنچا ہے کہ وہ سوچنے والا شخص ہے اور یہ کہ کوئی

کامل ذات موجود ہے۔"

"ہاں ' اور اسے وہ اپنا نقطہ آغاز بنا کر آگے چلتا ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ جہاں تک ان خیالات کا تعلق ہے جو خارجی حقیقت ـــــ مثلاً چاند اور سورج ـــــ کے بارے میں ہمارے اذہان میں پائے جاتے ہیں ' خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو ' ممکن ہے کہ وہ واہمے (fantasies) ہوں ۔لیکن خارجی حقیقت کی بعض ایسی خصوصیات بھی ہوتی ہیں جن کا ادراک ہم اپنی عقل کی مدد سے کرسکتے ہیں ۔ یہ ریاضیاتی خاصیتیں ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ اس قسم کی اشیا ہیں جن کا طول ' عرض اور عمق وغیرہ ماپا جاسکتا ہے ۔ اس قسم کی ' مقداری ' (quantitative) خاصیتیں میری عقل پر اتنی ہی واضح اور اس کے لیے اتنی ہی ممیز ہیں جتنی کہ یہ حقیقت کہ میں سوچنے والی ہستی ہوں ۔ اس کے برعکس رنگ ' بو اور ذائقے جیسی ' کیفیتی ' (qualitative) خاصیتوں کا تعلق ہمارے حسی ادراک (sense perception) سے ہے اوریوں وہ خارجی حقیقت کو بیان نہیں کرپاتیں ۔"

"چنانچہ فطرت محض خواب نہ ہوئی ۔"

"نہیں ۔ اور اس نکتے کے سلسلے میں وہ ایک بار پھر کامل ذات کے متعلق ہمارے تصور کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے ۔ جب ہماری عقل کسی چیز کی واضح اور بین انداز سے شناخت کرلیتی ہے ـــــ جیسا کہ خارجی حقیقت کی ریاضیاتی خاصیتوں کے سلسلے میں ہوتا ہے ـــــ تو یہ لازماً ایسی ہی ہوگی (جیسا کہ ہماری عقل نے اس کی شناخت کی ہے) ۔ کیونکہ کوئی کامل خدا (a perfect God) ہمیں دھوکا نہیں دے گا ۔ دیکارت کا دعوٰی ہے کہ خدا اس امر کی ' ضمانت ' (guarantee) دیتا ہے کہ جو کچھ ہم عقل کے ذریعے ادراک کرتے ہیں وہ حقیقت کے مماثل ہوتا ہے ۔"

"بہت اچھا ۔ چنانچہ اب اسے معلوم ہوگیا کہ وہ سوچنے والی ہستی ہے ' خدا موجود ہے اور ایک خارجی حقیقت کا وجود ہے ۔"

"اخ ! لیکن خارجی حقیقت (outer reality) سوچ کی حقیقت (reality of thought) سے بنیادی طور پر مختلف ہوتی ہے ۔ اب دیکارت دعوٰی کرتا ہے کہ حقیقت کی دو مختلف ہیئتیں (forms) ـــــ یا دو ' مادے ' (substances) ـــــ ہوتے ہیں ۔ ایک مادا سوچ (thought) یا دماغ ہے اور دوسرا ' جسامت یا وسعت مکانی (3) (extension) یا مادہ (matter) ہے ۔ ذہن خالصتاً شعور (conscious) ہے ' یہ طلا

(space) میں کوئی جگہ نہیں گھیرتا اور یوں اس کی مہین اجزا میں ذیلی تقسیم نہیں ہوسکتی ۔ تاہم مادہ خالصتاً جسامت ہے ' یہ خلا میں جگہ گھیرتا ہے ' چنانچہ اسے جب جی چاہے ' مہین سے مہین ترین اجزا میں منقسم کیا جاسکتا ہے ـــــ لیکن یہ شعور سے معرّیٰ ہوتا ہے ۔ دیکارت کا دعویٰ تھا کہ دونوں مادوں کی تخلیق خدا نے کی ہے کیونکہ خود خدا کسی دوسری چیز کے سہارے نہیں بلکہ اپنے طور پر موجود ہے ۔ اگرچہ سوچ اور جسامت دونوں خدا کی دین ہیں ' تاہم ان دونوں مادوں کا آپس میں کوئی اتصال نہیں ہوتا ۔ سوچ مادے سے بالکل آزاد ہے اور دوسری طرف مادی عمل کاریاں (processes) سوچ سے بالکل آزاد ہوتی ہیں ۔"

"چنانچہ اس نے خدا کی تخلیق کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ۔"

"بالکل صحیح ۔ ہم کہتے ہیں کہ دیکارت ' دوئی پسند ' (dualist) تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سوچ کی حقیقت اور توسیعی حقیقت (extended reality) کے مابین فرق کی بین لکیر کھینچ دیتا ہے ۔ مثلاً دماغ صرف انسان کے پاس ہے ۔ رہے جانور ' تو ان کا تعلق سراسر توسیعی حقیقت کے ساتھ ہے ۔ وہ مشینی انداز سے جیتے اور گھومتے پھرتے ہیں ۔ دیکارت جانور کو ایک قسم کی پیچیدہ خودکار مشین (automaton) تصور کرتا تھا ۔ جہاں تک توسیعی حقیقت کا تعلق ہے ' مادیت پرستوں کی طرح وہ کاملاً میکانکی نقطہ نظر کا حامی ہے ۔"

"مجھے بالکل یقین نہیں آتا کہ ہر میز مشین یا آٹومیٹن ہے ۔ دیکارت کو جانوروں سے کوئی خاص انس نہیں ہوگا ۔ اور ہمارے بارے میں کیا خیال ہے ؟ کیا ہم بھی خودکار مشینیں ہیں ؟"

"ہم ہیں بھی اور نہیں بھی ۔ دیکارت اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انسان دوہری (dual) مخلوق ہے کیونکہ وہ سوچتا بھی ہے اور خلا میں جگہ بھی گھیرتا ہے ۔ یوں انسان کے پاس دماغ اور توسیعی جسم دونوں چیزیں ہیں ۔ سینٹ آگسٹین اور ٹامس ایکوائی نس دونوں ازیں پیشتر اس سے ملتی جلتی بات کہہ چکے تھے یعنی انسان کا حیوانوں کی طرح جسم اور ملائکہ کی طرح روح ہوتی ہے ۔ دیکارت کے مطابق انسانی جسم کامل مشین ہے ' لیکن انسان کا ایک عدد دماغ بھی ہے جو جسم سے بالکل آزادانہ طور پر کام کرسکتا ہے ۔ جسمانی عمل کاریوں کو یہ آزادی حاصل نہیں ' انہیں اپنے قوانین کی اطاعت کرنا پڑتی ہے ۔ لیکن جو کچھ ہم اپنی عقل کی مدد سے سوچتے ہیں اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں

ہوتا ـــــ جو کچھ ہوتا ہے ' دماغ میں ہوتا ہے جو توسیعی حقیقت سے کاملاً آزاد ہے۔
پہلے پہلے مجھے اس بات کا اضافہ کر دینا چاہیے کہ دیکارت نے اس بات کو مسترد نہیں کیا تھا
کہ حیوان سوچ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں یہ صلاحیت موجود ہے ' پھر سوچ اور جسامت
کے مابین اس ثنویت کا اطلاق ان پر بھی ہو گا۔"

"ہم اس کے متعلق پہلے گفتگو کر چکے ہیں۔ اگر میں کسی بس کے پیچھے بھاگنے
کا فیصلہ کروں ' پوری ' خودکار مشین ' یا ' مشینی عورت ' مصروف عمل ہو جائے گی۔ اور
اگر میں بس پکڑنے میں ناکام رہوں ' تو میں رونے بیٹھ جاؤں گی۔"

"دیکارت بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکا تھا کہ جسم اور دماغ مسلسل باہمی
عمل (interaction) میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جب تک جسم میں دماغ
(mind) موجود ہے ' وہ ایک خاص مغزی عضو (brain organ) کے ذریعے ' جسے وہ
صنوبری غدہ (pineal gland) کہتا تھا ' مغز کے ساتھ منسلک رہے گا جہاں ' روح '(spirit)
اور ' مادے ' (matter) کے مابین تعامل مسلسل جاری رہتا ہے۔ چنانچہ دماغ متواتر ان
احساسات اور (سفلی) جذبات سے اثرات قبول کرتا رہتا ہے جن کا تعلق جسمانی ضروریات
سے ہوتا ہے۔ لیکن دماغ اپنے آپ کو ان ' سفلی ' مہیجات (impulses) سے علیحدہ کر سکتا
اور جسم سے آزاد رہ کر مصروف کار ہو سکتا ہے۔ مقصد عقل کی مدد کرنا ہوتا ہے تاکہ
کمان وہ سنبھال سکے۔ میرے پیٹ میں خواہ کتنا ہی شدید ترین درد کیوں نہ ہونے لگے
تکون کے زاویوں کے مجموعے میں کوئی فرق نہیں آئے گا ' وہ حسب دستور ایک سو اسی
درجے ہی رہے گا۔ چنانچہ انسانوں میں جسمانی ضروریات سے اوپر اٹھنے اور تعقلانہ رویہ
اختیار کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ان معنوں میں دماغ جسم سے برتر ہے۔ ہماری
ٹانگیں بوڑھی اور کمزور ہو سکتی ہیں ' کمر کمان کی طرح جھک سکتی ہے اور ہمارے دانت گر
سکتے ہیں ـــــ (لیکن جب تک ہم میں عقل کی رمق باقی ہے ' دو اور دو چار ہی رہیں گے
گے۔) عقل کمان کی طرح جھکتی ہے نہ کمزور پڑتی ہے۔ بوڑھا صرف جسم ہوتا ہے۔
دیکارت کے نزدیک دماغ بنیادی طور پر سوچ کا نام ہے۔ خواہش اور نفرت جیسے سفلی
جذبات اور احساسات قریبی طور پر ہمارے جسمانی وظائف ـــــ اور یوں توسیعی
حقیقت ـــــ کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔"

"مجھ سے یہ حقیقت فراموش نہیں ہو رہی کہ دیکارت نے انسانی جسم کا موازنہ
مشین یا آٹومیٹن سے کیا تھا۔"

"یہ موازنہ اس حقیقت پر مبنی تھا کہ اس کے عہد کے لوگ مشینوں اور گھڑیوں کے طریق کار سے بے حد مسحور ہو چکے تھے۔ انہیں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ چیزیں اپنی مرضی سے کام کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ لفظ 'آٹومیٹن' کا صحیح مطلب بالکل یہی ہے ــــــ یعنی ایک ایسی چیز جو اپنی مرضی سے حرکت کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کہنا یا سوچنا کہ کوئی چیز اپنی مرضی سے حرکت کر سکتی ہے، التباس (illusion) کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ مثلاً کلاک کو لے لو۔ یہ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اسے بہرحال بناتے انسانی ہاتھ ہی ہیں اور وہی اسے چابی دیتے ہیں۔ دیکارت نے ارادتاً اس حقیقت پر بڑا زور دیا ہے کہ ہڈیوں، عضلات، اعصاب، وریدوں اور شریانوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں، جن پر کوئی انسانی یا حیوانی جسم مشتمل ہوتا ہے، اس قسم کی پرجودت ایجادوں کو دراصل پرزوں کی نسبتاً حقیر تعداد کو سیدھے سادے انداز سے جوڑ کر بنایا جاتا ہے۔ (اگر یہ بات ہے پھر) خدا میکانکی قوانین کی اساس پر حیوانی یا انسانی جسم کیوں نہیں بنا سکتا؟"

"آج کل 'مصنوعی ذہانت' (artificial intelligence) کے بارے میں بڑی باتیں ہو رہی ہیں۔"

"ہاں، یہ ہمارے زمانے کی خودکار مشین (automaton) ہے۔ ہم نے ایسی مشینیں بنا لی ہیں جن سے دھوکا کھا کر ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ ذہین ہیں۔ اگر دیکارت اس قسم کی مشین دیکھ لیتا، اس کے ہوش و حواس اڑ جاتے۔ اسے شک گزرنے لگتا کہ آیا انسانی عقل واقعی اتنی ہی آزاد اور خود مختار ہے جتنی کہ اس نے فرض کی تھی۔ اور ایسے فلسفی بھی موجود ہیں جن کا یہ ایمان ہے کہ جس طرح انسان کے جسمانی افعال کو کوئی آزادی حاصل نہیں، اسی طرح اس کی روحانی زندگی بھی خود مختار نہیں۔ فطری طور پر انسانی روح کسی بھی ڈیٹا پروگرام (data program) کی نسبت لامحدود طور پر پیچیدہ ہے، لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم اصولی طور پر اتنے ہی ناآزاد (unfree) ہیں جتنے کہ یہ ڈیٹا پروگرام۔ سنو، سوفی ــــــ میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔"

البرٹو نے کمرے کے دوسرے سرے پر دھری لکھنے کی بڑی میز کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر ایک چھوٹا کمپیوٹر پڑا تھا۔ وہ اس کی طرف چل پڑا۔ سوفی نے اس کی پیروی کی۔

البرٹو نے کمپیوٹر کو چلانے کا بٹن دبا دیا اور کچھ ہی دیر میں سکرین کے اوپر

کے حصے پر :C نمودار ہوا ۔ اس نے لفظ "Laila" (لیلیٰ) تحریر کیا اور سوفی کو بتایا کہ یہ مشکل موضوعات پر گفتگو کرنے کے طریقوں پر مشتمل پروگرام ہے ۔

بہت جلد سکرین کے بالائی حصے پر مندرجہ ذیل جملے نمودار ہوئے :

"ہائی (Hi) ' میرا نام لیلیٰ ہے ۔ تم آرام سے تو بیٹھی ہو ؟"

"سوفی نے تین حروف ٹائپ کر دئے :

"yes (ہاں) ۔ " یہ حروف اس نے یونہی ٹائپ کر دئے تھے کیونکہ وہ ابھی تک کھڑی تھی ۔ البرٹو اس کے لیے کرسی لے آیا ۔

"تمہارا نام کیا ہے ؟" سکرین پر جملہ نمودار ہوا ۔

"سوفی امنڈسین ۔ "سوفی نے لکھا اور کمپیوٹر نے جواب دیا ۔

"نمبر 3 کلوور کلوز ۔ سوفی ' تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ۔ کیا تم اپنی پندرھویں سالگرہ کا انتظار کر رہی ہو ؟"

سوفی چونک گئی ۔ البرٹو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا : "میں نے صرف تمہارے نام ' پتے اور تاریخ پیدائش کا اندراج کیا تھا ۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے ہم کسی نئے دوست کے ساتھ متعارف ہوتے وقت کرتے ہیں ۔ ان کے متعلق پہلے سے کچھ جان لینا بہتر ہوتا ہے ۔"

"برا نہیں ۔ "سوفی نے کہا ۔

"اف ڈیر ' سوفی ' مجھے امید ہے کہ تمہاری طبیعت خراب نہیں ۔ تمہیں مکمل جملوں میں گفتگو کرنا چاہیے ۔"

شکریہ ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں ۔ کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتی ہوں ؟"

"مجھے خوشی ہے کہ تم ٹھیک ہو ۔ اچھا ' چلو ' پوچھو ' کیا پوچھنا چاہتی ہو ؟"

"تمہاری عمر کتنی ہے ؟" سوفی نے لکھا ۔

"مجھے آٹھ اگست 1988 کو امریکی ریاست جارجیا کے صدر مقام اٹلانٹا میں ' جہاں 1996 میں اولمپک کھیلیں ہوں گی ' بنایا گیا تھا لیکن ناروی زبان میں میرا ترجمہ اٹھائیس مارچ 1990 کو نارویجئن پولی ٹیکنیک میں ہوا تھا ۔"

"Gosh !"

"میں نے ابھی کہا تھا کہ تمہیں مکمل جملوں میں گفتگو کرنا چاہیے ۔"

"میں نے صرف 'gosh' کہا تھا !"

"مجھے اس قسم کی سیلنگ زبان نہیں آتی - میرا ذخیرہ الفاظ ایک لاکھ ہے - Gosh اس میں شامل نہیں - مجھے gosh کے قریب ترین جو لفظ مل سکا ' وہ gospel ہے -"

"اس کا مطلب 'یسوع کی کہانی ' ہے -"

"سوفی ' تم عیسائی ہو ؟"

"مجھے معلوم نہیں -"

"اصولی طور پر نہ معلوم ہونا نئے علم کی طرف ایک قدم بڑھانا ہے -"

"سقراط بھی شاید بالکل یہی کہتا - اگر سچ پوچھو تو دیکارت بھی -"

"سقراط یونانی فلسفی تھا - وہ 470 ق م سے 399 ق م تک زندہ رہا - اگر تم اس کے متعلق مزید جاننا چاہتی ہو تو بٹن نمبر F 7 دبا دو - دیکارت فرانسیسی فلسفی تھا - وہ 1596 سے 1650 تک زندہ رہا - اگر تم اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی متمنی ہو تو بھی بٹن نمبر F 7 دبا دو -"

"شکریہ - اتنا ہی کافی ہے - کچھ اور پوچھ سکتی ہوں ؟"

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ یہ کافی - ہے - اچھا ' پوچھو کیا پوچھنا ہے !"

البرٹو کی ہلکی سی ہنسی نکل گئی - سوفی نے لکھا :

"ہلڈے مولرکنیگ کون ہے ؟"

"ہلڈے مولرکنیگ للے سینڈ میں رہتی ہے اور اس کی بالکل وہی عمر ہے جو سوفی امنڈسین کی ہے -"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا ؟"

"کیسے کا مجھے علم نہیں - مجھے اس کے متعلق معلومات ہارڈ ڈسک (Hard disk) (4) پر ملی ہیں -"

سوفی کو اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا -

"ہمیں ہلڈے کے متعلق جو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہیں ' وہ میں نے ڈیٹا پروگرام میں شامل کی ہیں -" البرٹو نے کہا -

"اس کے علاوہ تمہیں ہلڈے کے متعلق کیا معلوم ہے ؟" سوفی نے لکھا -

"ہلڈے کا باپ لبنان میں اقوام متحدہ کا مبصر ہے - رتبے کے اعتبار سے وہ میجر ہے اور وہ اپنی بیٹی کو وقفے وقفے سے پوسٹ کارڈ بھیجتا رہتا ہے -"

"میں چاہتی ہوں کہ تم اسے (ہلڈے کے باپ کو) تلاش کرو!"

"مجھ سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔ وہ میری کسی بھی فائل پر نہیں اور میں کسی بھی دوسرے کمپیوٹر کے ساتھ منسلک نہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ اسے تلاش کرو!!!!!!"

"سوفی، تم غصہ کھا رہی ہو؟ اتنے زیادہ ندائیہ نشانات شدید غصیلے جذبات کی علامت ہیں۔"

"میں ہلڈے کے باپ سے بات کرنا چاہتی ہوں!"

"تمہیں اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے میں دقت پیش آرہی ہے۔ اگر تم اپنے بچپن کے متعلق گفتگو کرنا چاہتی ہو پھر بٹن نمبر F 9 دبا دو۔"

البرٹو نے دوبارہ سوفی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"وہ ٹھیک کہتی ہے۔ یہ کرسٹل بال (بلوری گیند) (5) نہیں۔ لیلیٰ محض ڈیٹا پروگرام ہے۔"

"بس کرو!" سوفی نے لکھا۔

"سوفی، جیسے تمہاری مرضی۔ ہماری ملاقات صرف تیرہ منٹ اور باون سیکنڈ جاری رہی۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کی ایک ایک بات مجھے یاد رہے گی۔ میں اب یہ پروگرام ختم کر رہی ہوں۔"

حرف: C ایک بار پھر سکون پر نمودار ہو گیا۔

"اب ہم دوبارہ بیٹھ سکتے ہیں۔" البرٹو نے کہا۔

لیکن سوفی پہلے ہی چند دوسرے بٹن دبا چکی تھی۔

کنیگ۔" اس نے لکھا۔

پلک جھپکنے میں کمپیوٹر کی سکرین پر مندرجہ ذیل پیغام نمودار ہوا:

"میں یہاں ہوں۔"

اس مرتبہ اپنی نشست سے اچھلنے کی باری البرٹو کی تھی۔

"تم کون ہو؟" سوفی نے تحریر کیا۔

"میجر البرٹ کنیگ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ میں سیدھا لبنان سے یہاں آیا ہوں۔ میرے لائق کیا حکم ہے؟"

"معاملہ بالکل ہی بگڑ گیا ہے!" البرٹو نے زیرلب کہا۔ "چوہے کا بچہ ہارڈ ڈسک

ہی میں گھس آیا ہے۔"

البرٹو نے سوئی کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کیا اور خود کلیدی تختے (Keyboard) کے سامنے بیٹھ گیا۔

"تم میرے PC (پرسنل کمپیوٹر) میں کیسے گھس آئے؟" اس نے لکھا۔

"میرے عزیز رفیق کار - یہ بالکل معمولی بات ہے - میرا جہاں جی چاہے' میں وہاں پہنچ جاتا ہوں۔"

"تم ڈیٹا وائرس (6) ہو۔ مجھے تم سے گھن آتی ہے!"

"دھیرے! دھیرے! اتنا جوش نہ کھائیں - فی الحال میں یہاں سالگرہ کا وائرس بن کر آیا ہوں - میں خصوصی تہنیتی پیغام دے سکتا ہوں؟"

"کوئی ضرورت نہیں - شکریہ - ہمارے پاس پہلے ہی ان کا ڈھیر لگ چکا ہے۔"

"لیکن میں یہ پیغام پہنچانے میں دیر نہیں لگاؤں گا: ڈیر ہلڈے' یہ سب کچھ تمہارے اعزاز میں ہے - میں ایک بار پھر تمہیں تمہاری پندرھویں سالگرہ پر دلی مبارک باد دیتا ہوں - جن حالات میں یہ تہنیتی پیغام پہنچایا جارہا ہے' میں ان کے لیے معذرت خواہ ہوں - لیکن کیا بھی کیا جاسکتا ہے؟ میری تو صرف یہی تمنا ہے کہ تم جہاں بھی جاؤ' ہر جگہ یہ پیغام تمہیں یکایک مل جایا کرے - پاپا کی طرف سے سلام جو گرم جوشی سے تمہارے ساتھ بغل گیر ہونے کی آرزو میں مرا جارہا ہے۔"

پیشتر اس کے کہ البرٹو دوبارہ کچھ لکھ پاتا' ایک بار پھر علامت : C سکرین پر نمودار ہوئی۔

البرٹو نے "dir Knag" ("کنیگ کو بلاؤ") لکھا - اس سے یہ ہوا کہ سکرین پر مندرجہ ذیل معلومات نمودار ہوگئیں۔

Knag lib	147,643	15-06-90	12 : 47
Knag lil	326,439	23-06-90	22 : 34

البرٹو نے "erase Knag" ("کنیگ کو مٹا دو") لکھا اور کمپیوٹر بند کر دیا۔

"وہ مارا ـــــ میں نے اسے مٹا دیا ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ اگلی مرتبہ کہاں آ ٹپکے گا۔"

وہ اپنی نشست پر بیٹھا رہا اور سکرین کو گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مزید کہا:

"بدترین بات اس کا نام تھی۔ 'البرٹ کنیگ'۔ ۔"

پہلی مرتبہ سوفی کو دونوں ناموں کی مشابہت ـــــ البرٹ کنیگ اور البرٹو کنیگ ـــــ کا شدت سے احساس ہوا۔ لیکن البرٹو غصے سے اس قدر کھول رہا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی کہنے کا حوصلہ نہ کر سکی۔ وہ اٹھے اور دوبارہ کافی کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔

19 _ سپینوزا

* * *

... خدا پتلیوں کا تماشا گر نہیں ...

وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔ پھر جو کچھ ہوا تھا ' اس سے البرٹو کا دھیان ہٹانے کی کوشش میں سوفی گویا ہوئی :

"ڈیکارت نرالی قسم کا آدمی ہو گا ۔ اس نے کوئی شہرت پائی ؟"

البرٹو جواب دینے سے پہلے دو سیکنڈ گہری سانس لیتا رہا ۔ "اس کے کام کی بڑی اہمیت تھی ۔ شاید سب سے بڑھ کر ایک اور عظیم فلسفی کے لیے ۔ اس فلسفی کا نام باروخ سپینوزا (Baruch Spinoza) تھا ۔ وہ 1632 سے 1677 تک زندہ رہا ۔"

"آپ اس کے بارے میں مجھے کچھ بتا رہے ہیں ؟"

"ارادہ تو میرا یہی ہے ۔ اب عسکری اشتعال انگیزیاں بھی ہمیں اس کام سے نہیں روک سکتیں ۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں ۔"

"سپینوزا کا تعلق ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈیم کے یہودی طبقے سے تھا ۔ اسے بدعت کے الزام میں مردود قرار دے دیا گیا اور مذہب سے نکال دیا گیا ۔ اپنے خیالات کی وجہ سے اس شخص کی جتنی توہین کی گئی اور اسے جتنی ذہنی ایذا پہنچائی گئی ' حالیہ فلسفے کا شاید ہی کوئی ایسا فلسفی ہو گا جس کے ساتھ اس قسم کا سلوک روا رکھا گیا ہو گا ۔ اس کے ساتھ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کیونکہ وہ روایتی اور راسخ مذہب کو اپنی تنقید کا

نشانہ بناتا تھا ۔ اس کا عقیدہ تھا (اور وہ اس کا برملا اعلان کرتا تھا) کہ یہودی اور عیسائی مذاہب محض بے لوچ کٹر عقاید اور خارجی رسوم (کی ادائیگی) کے سہارے اپنی زندگی کے دن گزار رہے ہیں ۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اس چیز کا ' جسے ہم انجیل کی تاریخیاتی / تنقیدی (historico-critical) تشریح و تفسیر کہتے ہیں ' اطلاق کیا ۔ "

" محترم ' اپنی بات کی ذرا کھل کر تشریح فرمائیں ۔ "

" وہ اس بات سے منکر تھا کہ بائبل کا ایک ایک لفظ خدا کی طرف سے الہام کردہ ہے ۔ وہ کہتا تھا : ' جب ہم انجیل کا مطالعہ کرتے ہیں ہمیں مسلسل یہ بات دھیان میں رکھنا چاہیے کہ یہ کس عہد میں تحریر کی گئی تھی ۔ ' جس قسم کے ' تنقیدی ' مطالعے کی اس نے تجویز پیش کی تھی ' اس سے متون (texts) میں متعدد تناقضات (inconsis-tencies) کا انکشاف ہوا ۔ لیکن نئے عہد نامے میں شامل مقدس صحائف کی سطح کے نیچے ہر جگہ یسوع جلوہ گر نظر آتے ہیں جنہیں خداوند کا ترجمان کہا جاسکتا ہے ۔ چنانچہ یسوع کی تعلیمات یہودی مذہب کی راسخ العقیدگی (orthodoxy) سے نجات کی امید دلاتی تھیں ۔ یسوع ' مذہب عقل ' ('a religion of reason') کی تبلیغ کرتے تھے جس میں محبت کو باقی تمام چیزوں پر کہیں زیادہ فوقیت حاصل ہے ۔ سپینوزا اس کی تشریح یوں کرتا تھا کہ اس میں خدا کی محبت اور بنی نوع انسان کی محبت دونوں ہی شامل ہیں ۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ عیسائیت بھی اپنے بندھے ٹکے بے لوچ کٹر عقاید اور خارجی رسوم میں پھنس چکی ہے ۔ "

" میرا خیال ہے کہ عیسائی یا یہودی مذہبی رہنماؤں کے لیے اس قسم کے خیالات ہضم کرنا آسان نہیں رہا ہو گا ۔ "

" جب حالات واقعی دگرگوں ہو گئے ' سپینوزا کو اس کے اپنے گھر والوں نے بھی تیاگ دیا ' بلکہ وہ اس حد تک چلے گئے کہ انہوں نے بدعت کے الزام میں اسے اس کے آبائی ورثے سے محروم کرانے کی کوششیں بھی شروع کر دیں ۔ یہاں مزے کی لیکن متناقض بات یہ ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جنہوں نے سپینوزا سے بڑھ کر آزادی گفتار اور مذہبی رواداری کے حق میں زور قلم صرف کیا ہو گا ۔ اسے جس چوکھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اس نے اسے دوسروں سے الگ تھلگ گوشہ تنہائی میں پناہ لینے اور پرسکوت زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ۔ اب اس کی زندگی سراسر فلسفے کے لیے وقف تھی ۔ وہ اپنے گزارے کے لیے عینکوں کے شیشے صیقل کر کے تھوڑی بہت کمائی

کرلیتا تھا۔ ان میں سے چند ایک شیشے میری ملکیت میں آگئے ہیں۔"

"بہت متاثر کن!"

"یہ حقیقت کہ وہ اپنی روزی عدسے صیقل کرکے کماتا تھا، بذات خود قدرے علامتی اہمیت اختیار کرگئی ہے۔ فلسفی کی لازماً یہ کوشش ہونا چاہیے کہ وہ زندگی کو نئے تناظر میں دیکھنے میں لوگوں کی مدد کرے۔ سپنوزا کے فلسفے کا ایک اہم جزو واقعی اشیا کو ابدیت کے تناظر میں رکھ کر دیکھنا ہے۔"

"ابدیت کا تناظر؟"

ہاں، سوفی، کیا تم سمجھتی ہو کہ تم اپنی زندگی کا تصور کسی کائناتی سیاق و سباق (cosmic context) میں کرسکتی ہو؟ تمہیں کوشش کرنا ہوگی اور تمہیں اپنے آپ کا اور اپنی زندگی کا یہاں اور اب تصور کرنا ہوگا۔۔۔"

"ہونہہ۔۔۔ یہ کام اتنا آسان نہیں۔"

"اپنے آپ کو یاد دلاؤ کہ تم ساری فطرت کی زندگی کا محض انتہائی قلیل (minuscule) حصہ گزار رہی ہو۔ تم انتہائی جسیم کل (whole) کا حصہ ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔۔۔"

"(سمجھنا ہی کافی نہیں)، کیا تم ایسا محسوس بھی کرسکتی ہو؟ کیا تم ایک ہی وقت میں، ایک ہی جھلک میں ساری فطرت ـــــ درحقیقت پوری کائنات ـــــ کا ادراک کرسکتی ہو؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ شاید مجھے چند عدد عدسوں (lenses) کی ضرورت پیش آجائے۔"

"میرا مطلب صرف خلائے بسیط کی لا متناہیت (infinity) ہی نہیں، میں اس میں وقت کی ابدیت (eternity) بھی شامل کر رہا ہوں۔ کوئی تیس ہزار سال قبل (جرمنی کی) وادی رائن میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ وہ فطرت کا انتہائی قلیل جزو تھا، بحرِ بے کنار کی حقیر لہر تھا۔ تم بھی، سوفی، فطرت کی زندگی کا انتہائی قلیل حصہ گزار رہی ہو۔ تمہارے اور اس لڑکے کے مابین کوئی فرق نہیں۔"

"سوائے اس کے کہ میں اب زندہ ہوں۔"

"ہاں، بالکل یہی بات ہے جس کے متعلق میں چاہتا تھا کہ تم اس کا تصور باندھنے کی کوشش کرو۔ تیس ہزار سال میں تم کیا بن جاؤ گی؟"

"کیا یہی بدعت تھی (جس کا الزام سپینوزا پر لگایا گیا)؟"

"پوری طرح نہیں ... سپینوزا نے صرف یہی نہیں کہا تھا کہ ہر چیز فطرت ہے۔ وہ فطرت کی خدا کے ساتھ تطبیق (identification) کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ خدا ہی سب کچھ ہے اور سب کچھ خدا میں ہے۔"

"تو وہ ہمہ اوست (pantheism) کا قائل تھا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ سپینوزا کے مطابق خدا نے دنیا اس لیے تخلیق نہیں کی تھی کہ وہ اس کے باہر ایستادہ رہے۔ نہیں، (خدا ہی) دنیا ھے۔ بعض اوقات سپینوزا اس بات کو ذرا مختلف انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا خدا میں ہے۔ اس معاملے میں وہ اریوپگس پہاڑی پر اہل ایتھنز کے سامنے سینٹ پال کی تقریر کا حوالہ دے رہا ہے: 'اسی میں ہم رہتے ہیں اور حرکت کرتے ہیں اور اپنا وجود رکھتے ہیں۔' لیکن آؤ، ہم سپینوزا کے اپنے استدلال پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس کی اہم ترین کتاب کا نام 'اخلاقیات کی ہندسی انداز سے عملی تشریح' ('Ethics Geometrically Demonstrated') ہے۔"

"اخلاقیات ــــــ ہندسی انداز سے عملی تشریح؟"

"شاید ہمیں یہ عنوان کچھ عجیب سا معلوم ہو۔ اچھی زندگی گزارنے کے لیے جس اخلاقی رویے (moral conduct) کی ضرورت پیش آتی ہے، اس کے مطالعے کو فلسفے کی اصطلاح میں 'اخلاقیات' (ethics) کہتے ہیں۔ مثلاً جب ہم سقراط یا ارسطو کی اخلاقیات کا ذکر کرتے ہیں، تب بھی ہمارا یہی مطلب ہوتا ہے۔ یہ صرف ہمارے زمانے میں ہوا ہے کہ اخلاقیات کا رتبہ اتنا نیچے گرا دیا گیا ہے کہ اب اس کا مفہوم یہ لیا جانے لگا ہے کہ آپ جو چاہیں کریں، جس طرح رہنا چاہیں، رہیں، بس اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے کسی فعل سے دوسروں کے حقوق پر کوئی زد نہ پڑتی ہو۔"

"کیونکہ اپنے بارے میں سوچنے کو انا پرستی کے مترادف قرار دے دیا گیا ہے؟"

"ہاں، کچھ اسی قسم کی بات۔ جب سپینوزا لفظ 'اخلاقیات' استعمال کرتا ہے تو اس سے اس کا مطلب زندہ رہنے کا فن اور اخلاقی رویہ دونوں ہوتے ہیں۔"

"پھر بھی یہ کیا... اخلاقیات کی ہندسی انداز سے عملی تشریح؟"

"ہندسی انداز یا طریقہ ان اصطلاحات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس نے اپنے

خیالات کو منظم انداز سے پیش کرنے کے لیے استعمال کیں ۔ تمہیں شاید یاد ہوگا کہ ڈیکارٹ اپنے فلسفیانہ تفکر کے لیے ریاضیاتی طریق کار استعمال کرنا چاہتا تھا ۔ اس سے اس کا مطلب فلسفیانہ تفکر کی ایک ایسی صورت تھی جو سختی سے منطقی نتائج سے تشکیل پاتی ہے ۔ سپینوزا اسی تعقل پسند روایت کا علم بردار تھا ۔ وہ اپنی اخلاقیات کے ذریعے دکھانا چاہتا تھا کہ انسانی زندگی فطرت کے آفاقی قوانین کے تابع ہے ۔ چنانچہ ہمیں لازماً اپنے آپ کو اپنے احساسات اور (سطحی) جذبات سے آزاد کرلینا چاہیے ۔ اس کا ایقان تھا کہ صرف اسی صورت میں ہم اطمینان (قلب) پاسکتے اور خوش رہ سکتے ہیں ۔"

"یقیناً ہم محض قوانین فطرت کے تابع نہیں ۔"

"خیر ، سپینوزا آسانی سے گرفت میں آنے والا فلسفی نہیں ۔ آؤ ، ہم اس کا جزواً جزواً مطالعہ کرتے ہیں ۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ڈیکارٹ کا ایمان تھا کہ حقیقت دو مکمل طور پر مختلف ماووں (substances) ـــــ یعنی سوچ اور (مکانی) وسعت ـــــ پر مشتمل ہے ۔"

"میں اسے کیسے بھلا سکتی ہوں ؟"

لفظ ' ماوے ' (substance) کی یوں تشریح کی جاسکتی ہے کہ یہ وہ (شے) ہے جس پر کوئی چیز مشتمل ہوتی ہے یا یہ وہ (شے) ہے جو کوئی چیز اصلاً ہوتی ہے یا جسے کوئی مختصر یا نسبتاً کم پیچیدہ شکل دے کر کسی حقیقی چیز میں تبدیل کیا جاسکتا ہے ۔ ڈیکارٹ ان ماووں میں سے دو کے ساتھ مصروف عمل رہا ۔ (اس کے خیال کے مطابق) ہر چیز یا سوچ (thought) تھی یا (مکانی) وسعت ۔

" تاہم سپینوزا نے اس نصفا نصفی (split) کو ماننے سے انکار کردیا ۔ اس کا ایقان تھا کہ ماوا صرف ایک ہے ۔ ہر چیز جو موجود ہے ' اسے مختصر یا کم پیچیدہ صورت دے کر واحد حقیقت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے جسے وہ ماوا (substance) کہتا ہے ۔ بعض اوقات وہ اسے خدا یا فطرت کہتا ہے ۔ چنانچہ ڈیکارٹ کے برعکس اس کا حقیقت کے متعلق نظریہ ثنوی (dualistic) نہیں ۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ احدیت پسند (monist) تھا ۔ یعنی وہ فطرت اور تمام اشیا کی کیفیت کو مختصر ترین اور کم پیچیدہ صورت میں ڈھال کر ایک واحد ماوے میں تبدیل کردیتا ہے (مطلب یہ کہ سب اشیا کی اصل ایک ہی ہے) ۔"

"اس سے بڑھ کر انہیں ایک دوسرے سے اور کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا

تھا۔"

"لیکن دیکارت اور سپینوزا کے مابین اختلاف اتنا گہرا نہیں جیسا کہ اکثر لوگوں نے دعویٰ کیا ہے۔ دیکارت نے بھی اس طرف توجہ دلائی تھی کہ صرف خدا اپنے طور پر آزاد حیثیت سے موجود ہے۔ صرف تب جب سپینوزا خدا کی فطرت کے ساتھ ——— یا خدا کی تخلیق کے ساتھ ——— تطبیق کرتا ہے وہ دونوں یعنی دیکارت کے نظریات اور یہودیوں اور عیسائیوں کے عقاید سے خاصا دور چلا جاتا ہے۔"

"چنانچہ فطرت ہی خدا ٹھہری اور قصہ ختم۔"

"لیکن جب سپینوزا لفظ 'فطرت' استعمال کرتا ہے' اس کا مطلب محض توسیعی (extended) فطرت نہیں ہوتا۔ مادے 'خدا یا فطرت' سے اس کی مراد ہر وہ چیز ہے جو موجود ہے (اور اس میں تمام روحانی اشیا بھی شامل ہیں)۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ سوچ اور (مکانی) وسعت دونوں ہی؟"

"تم نے میرے منہ سے بات چھین لی! سپینوزا کے مطابق ہم خدا کی صرف دو صفات (qualities) یا جلوے (manifeslations) پہچانتے ہیں۔ سپینوزا خدا کی ان صفات کو attributes (صفات الٰہی) کہتا ہے۔ اور یہ دونوں صفات دیکارت کی 'سوچ' اور 'مکانی وسعت' کے متماثل (identical) ہیں۔ خدا ——— یا فطرت ——— اپنا جلوہ 'سوچ' ہو یا 'مکانی وسعت' ہو' دونوں صورتوں میں دکھاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ خدا کی صفات 'سوچ' یا 'مکانی وسعت' تک محدود نہ ہوں۔ بلکہ اتنی زیادہ ہوں کہ ان کا شمار ہی ممکن نہ ہو لیکن انسان کو صرف ان دو کا علم ہے۔"

"بجا فرمایا' لیکن کہنے کا انداز کتنا پیچیدہ ہے!"

"ہاں۔ آدمی کو سپینوزا کی زبان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تقریباً ہتھوڑی اور چھینی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن انجام کار صلہ یہ ملتا ہے کہ آدمی ایک ایسی فکر (thought) برآمد کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو نگینے کی طرف شفاف ہے۔"

"آپ میرے صبر کا امتحان نہ لیں' جلدی بتائیں۔"

"تو پھر فطرت میں ہر چیز یا تو سوچ ہے یا (مکانی) وسعت۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہماری جن مختلف مظاہر سے ——— مثلاً کوئی قدرتی پھول یا ورڈز ورتھ کی کوئی نظم ——— مڈبھیڑ ہوتی ہے' وہ سوچ کے یا پھر (مکانی) وسعت کی صفت (attribute) کے اسالیب (modes) ہیں۔ 'اسلوب' وہ خاص انداز ہے جو مادہ' خدا یا

فطرت اختیار کرلیتی ہے ۔ پھول (مکانی) وسعت کی صفت کا اسلوب ہے اور اسی پھول کے متعلق کوئی نظم سوچ کی صفت کا اسلوب ہے ۔ لیکن دونوں بنیادی طور پر مادے ، خدا یا فطرت کا اظہار (expression) ہیں ۔"

" آپ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں !"

" لیکن بات اتنی پیچیدہ نہیں جتنی کہ وہ اسے بنا رہا ہے ۔ اس نے اپنے خیالات کو جس بے لوچ نظم و ضبط کے ساتھ پیش کیا ہے ' اس کی تہہ میں زبردست آگہی پائی جاتی ہے جو فی الواقع اتنی سہل ہے کہ روزمرہ کی زبان میں اس کا اظہار ممکن ہی نہیں ۔"

"میرا خیال ہے کہ میں روزمرہ کی زبان کو ترجیح دوں گی بشرطیکہ اس سے آپ کو کوئی فرق نہ پڑتا ہو ۔"

"اچھا ' پھر بہتر یہی ہے کہ میں خود تم سے ابتدا کروں ۔ جب تمہارے پیٹ میں درد اٹھتا ہے ' یہ درد کسے ہوتا ہے ؟"

"جیسا کہ آپ نے کہا ہے ' مجھے ' اور کسے ؟"

" درست ۔ لیکن بعد میں جب تمہیں یاد آتا ہے کہ تمہیں کبھی درد ہوا تھا ' یہ سوچ کس کی ہوتی ہے ؟"

" یہ بھی میری ۔"

" تو وہ شخص جسے ایک لمحے پیٹ درد ہوتا ہے اور اگلے لمحے اس پر سوچ کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے ' ایک ہی ہوا ؟ اور یہ ایک شخص تم ہو ۔ سپینوزا کا دعویٰ تھا کہ تمام مادی اشیا اور وہ تمام اشیا جو ہمارے ارد گرد وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں ' ذات خداوندی یا فطرت کا اظہار ہیں ۔ چنانچہ اس سے ثابت یہ ہوا کہ ہماری تمام سوچیں جو ہم سوچتے ہیں خدا کی اور فطرت کی بھی سوچیں ہیں ۔ کیونکہ ہر چیز ایک (one) ہے ۔ خدا صرف ایک ہے ' فطرت ایک ہے اور مادہ (substance) ایک ہے ۔"

" لیکن ذرا ٹھہریں ۔ جب میں کچھ سوچتی ہوں ' تو جو سوچنے کا کام کر رہا ہوتا ہے ' وہ میں ہوتی ہوں ۔ جب میں حرکت کرتی ہوں ' تو جو حرکت کر رہا ہوتا ہے ' وہ میں ہوتی ہوں ۔ آپ اس میں خدا کو کیوں گھسیٹ رہے ہیں ؟"

" مجھے (ان کاموں میں) تمہاری فعال شرکت (involvement) پسند آئی ہے ۔ لیکن تم کون ہو ؟ درست ' تم سوفی امنڈسین ہو لیکن تم کسی لامتناہی طور پر عظیم چیز کا اظہار بھی ہو ۔ اگر تم چاہو تو تم کہہ سکتی ہو کہ سوچ تم رہی ہو یا حرکت تم کر رہی ہو لیکن

کیا تم اس کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتیں کہ تمہاری سوچیں فطرت سوچ رہی ہے یا یہ فطرت ہے جو تمہارے ذریعے حرکت کر رہی ہے ؟ دراصل مسئلہ صرف اتنا ہے کہ دیکھنے کے لیے تم کون سا عدسہ منتخب کرتی ہو؟"

"تو آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ میں خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی؟"

"اس کا جواب ہاں اور نہ دونوں میں ہو سکتا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ تم جس طرح چاہو اس طرح تمہیں انگلی گھمانے کا حق حاصل ہو ۔ لیکن تمہاری انگلی اپنی فطرت کے مطابق ہی گھوم سکتی ہے ۔ یہ تمہارے ہاتھ سے چھلانگ لگا کر علیحدہ نہیں ہو سکتی اور نہ کمرے میں ادھر ادھر رقص کر سکتی ہے ۔ تو مائی ڈیر ' تمہارا بھی زندگی کے ڈھانچے میں اسی طرح کا مقام ہے ۔ تم سوفی امنڈسین ہو لیکن تم خدا کے جسم کی انگلی بھی ہو ۔"

"چنانچہ جو کچھ میں کرتی ہوں 'اس کا فیصلہ خدا کرتا ہے ۔"

"فطرت یا فطرت کے قوانین ۔ سپینوزا کا عقیدہ تھا کہ ہر چیز ' جو وقوع پذیر ہوتی ہے ' اس کی داخلی علت (inner cause) خدا —— —— یا فطرت کے قوانین —— ہیں ۔ وہ (خدا) خارجی علت نہیں کیونکہ خدا فطرت کے قوانین اور صرف انہی کے ذریعے اپنا اظہار کرتا ہے ۔"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے یہ فرق نظر آرہا ہے ۔"

"خدا کوئی پتلیوں کا تماشا گر نہیں کہ ساری رسیاں اس کے ہاتھ میں ہیں اور جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہو ' اس کی مرضی سے ہوتا ہو ۔ پتلیاں نچانے کا سچا ماہر پتلیوں کو باہر سے کنٹرول کرتا ہے ' چنانچہ وہ پتلیوں کی حرکات کا ' خارجی علت ' ہے ۔ لیکن خدا اس طریقے سے دنیا کو کنٹرول نہیں کرتا ۔ خدا دنیا کو فطری قوانین کے ذریعے کنٹرول کرتا ہے ۔ چنانچہ خدا —— یا فطرت —— ہر اس چیز کی ' جو وقوع پذیر ہوتی ہے ' ' داخلی علت ' ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مادی دنیا میں ہر چیز تقدیر (جبر) کے ذریعے وقوع پذیر ہوتی ہے ۔ مادی یا فطری دنیا کے متعلق سپینوزا جبریت (determinism) کے نظریے کا قائل تھا ۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ نے پہلے بھی اس قسم کی بات کہی تھی ۔"

"تم شاید رواقیوں کے بارے میں سوچ رہی ہو ۔ ان کا بھی دعویٰ تھا کہ ہر چیز تقدیر سے وقوع پذیر ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک ہر چیز سے ' رواقی طریق ' (stoicism) یعنی صبر شکر کے ساتھ یا ' سر تسلیم خم ہے ' کے انداز سے نپٹنا ضروری تھا ۔

انسان کو اپنے جذبات کی رو میں نہیں بہنا چاہیے ۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ سپنوزا کی اخلاقیات بھی یہی تھی ۔"

"آپ کا مطلب کیا ہے ' میرا خیال ہے کہ میں وہ سمجھ گئی ہوں لیکن پھر بھی مجھے یہ تصور پسند نہیں کہ میں اپنے فیصلے خود نہیں کرتی ۔"

"بہت اچھا ۔ آؤ ' ایک بار پھر پتھر کے زمانے کے اس لڑکے کی طرف واپس چلیں جو تیس ہزار سال پہلے اس دنیا میں اپنی زندگی کے ایام گزار رہا تھا ۔ جب وہ سن بلوغت کو پہنچا ہو گا ' وہ جنگلی جانوروں پر برچھی پھینکتا ہو گا ' اس نے کسی دوشیزہ سے محبت کی ہو گی جو اس کے بچوں کی ماں بنی ہو گی اور وہ یقیناً قبائلی خداؤں کی پوجا کرتا ہو گا ۔ تم واقعی سمجھتی ہو کہ ان سب کاموں کے فیصلے وہ خود کرتا ہو گا؟"

"مجھے معلوم نہیں ۔"

"یا افریقہ کے کسی شیر کو اپنے دھیان میں لاؤ ۔ تمہارا خیال ہے کہ وہ شکاری درندہ بننے کا تہیہ خود کرتا ہے ؟ اسی وجہ سے وہ لنگڑاتے آہو پر حملہ کر دیتا ہے ؟ کیا وہ شکاری درندہ بننے کی بجائے گھاس خور بننے کا تہیہ کر سکتا تھا؟"

"نہیں ۔ شیر اپنی فطرت کی اطاعت کرتا ہے ۔"

"تمہارا مطلب فطرت کے قوانین ہیں ۔ سوفی ' تم بھی یہی کرتی ہو کیونکہ تم بھی فطرت کی جزو ہو ۔ ٹھیک ہے کہ تم احتجاج کر سکتی ہو اور اس احتجاج میں تمہیں دیکارت کی حمایت حاصل ہو گی کہ شیر حیوان ہے ' آزاد انسان نہیں کہ اس کے پاس آزاد ذہنی صلاحیتیں ہوں ۔ لیکن ذرا کسی نومولود بچی کو اپنے دھیان میں لاؤ جو چیختی ہے ' چلاتی ہے ۔ اگر اسے دودھ نہ ملے ' وہ اپنا انگوٹھا چوسنے لگتی ہے ۔ کیا اس بچی کا کوئی آزاد منشا ہے؟"

"میرا قیاس ہے کہ نہیں ۔"

"پھر یہ بچی اپنا آزاد منشا کب حاصل کرتی ہے ؟ دو سال کی عمر میں وہ ادھر ادھر بھاگنے لگتی ہے اور اسے جو چیز نظر آئے ' اس کی طرف اشارے کرنے لگتی ہے ۔ تین سال کی عمر میں وہ اپنی ماں کو طرح طرح کے سوالوں سے دق کرنے اور ستانے لگتی ہے ۔ اور جب وہ چار سال کی عمر کو پہنچتی ہے ' اسے اچانک اندھیرے سے خوف آنے لگتا ہے ۔ سوفی ' آزادی کہاں ہے ؟"

"مجھے معلوم نہیں ۔"

"جب وہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچتی ہے، اسے آئینے کے سامنے بیٹھنے اور میک اپ کے تجربے کرنے کا شوق چرانے لگتا ہے۔ کیا یہی وہ لمحہ ہے جب وہ اپنے ذاتی فیصلے کرتی اور جو کچھ اسے پسند ہو، اسے عملی جامہ پہنانے لگتی ہے؟"

"میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"وہ یقیناً سوفی امنڈسین ہے۔ لیکن وہ فطرت کے قوانین کے مطابق ہی زندگی بسر کرتی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ اسے اس کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ ہر کام، جو وہ کرتی ہے، اس کے پس پردہ بے شمار پیچیدہ وجوہ کام کر رہی ہوتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں کچھ مزید سننا نہیں چاہتی۔"

"لیکن تم محض ایک آخری سوال کا جواب دے دو۔ ایک ہی عمر کے دو درخت کسی وسیع وعریض باغ میں کھڑے ہیں۔ ایک درخت وہاں لگایا گیا ہے جہاں خوب دھوپ پڑتی ہے، مٹی زرخیز ہے اور پانی بھی فراواں مقدار میں موجود ہے۔ جہاں دوسرا درخت کھڑا ہے، وہاں کی مٹی گھٹیا اور فضا تاریک ہے۔ کون سا درخت زیادہ تناور ہوگا؟ اور ان دونوں میں سے کس پر پھل زیادہ آئیں گے؟"

"ظاہر ہے کہ اس درخت پر جسے بڑھنے پھولنے کے لیے زیادہ سازگار حالات میسر ہیں۔"

"سپنوزا کے مطابق یہ درخت آزاد ہے۔ اسے اپنی فطری صلاحیتوں کو نمو دینے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن اگر یہ سیب کا درخت ہے، اس میں ناشپاتیوں یا آلوچوں کے پھل دینے کی صلاحیت نہیں ہوگی۔ اسی اصول کا ہم انسانوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً سیاسی حالات ہماری ذاتی ترقی اور ذاتی نمو کے لیے رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ خارجی حالات ہمارے راستے کی دیوار بن سکتے ہیں۔ ہم صرف تبھی آزاد انسانوں کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں جب ہمیں اپنی خلقی صلاحیتوں کو جلا دینے کی آزادی میسر ہو۔ لیکن ہم جو کچھ ہیں، اس کے بنانے میں ہماری داخلی امکانی صلاحیتوں اور خارجی مواقع کو اسی طرح عمل دخل حاصل ہے جس طرح کہ رائن وادی میں پتھر کے زمانے کے لڑکے، افریقہ کے شیر یا باغ میں سیب کے درخت کے معاملے میں تھا۔"

"بہت اچھا، میں ہار مان لیتی ہوں، تقریباً۔"

"سپنوزا اس بات پر زور دیتا ہے کہ صرف ایک ہستی ایسی ہے جو مطلق، مکمل اور قطعی طور پر، اپنی علت آپ (its own cause) ہے اور جسے اپنے افعال میں کامل

آزادی حاصل ہے ۔ صرف خدا یا فطرت اس قسم کے آزاد اور ' غیر اتفاقی عمل کاری ' nonaccidental process) کا اظہار ہے ۔ انسان آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مار سکتا ہے تاکہ وہ خارجی پابندیوں یا رکاوٹوں کے بغیر اپنی زندگی گزار سکے لیکن وہ ' آزاد منشا ' (free will) کبھی حاصل نہیں کر پائے گا ۔ جو کچھ ہمارے جسم کے ـــــ جو کہ (مکانی / وسعت کی صفت کا اسلوب ہے ـــــ اندر ہوتا ہے ' اس میں سے ہر چیز پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا ۔ اور تو اور ' ہم تو یہ بھی نہیں کر سکتے کہ ہم نے سوچنا کیا ہے ' اسی کا انتخاب کر سکیں ۔ چنانچہ انسان کسی ' آزاد روح ' کا مالک نہیں ہوتا ' اس کی یہ روح (soul) کم و بیش میکانکی (mechanical) جسم میں مقید ہے ۔ "

" یہ بات سمجھنا قدرے مشکل ہے ۔ "

" سپینوزا کہتا تھا کہ یہ ہمارے سفلی جذبات ـــــ جیسے (بڑا بننے یا کچھ کر گزرنے کی) شدید آرزو اور شہوت نفسانی (lust) ـــــ ہیں جو ہمارے سچی خوشی اور ہم آہنگی حاصل کرنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں ' لیکن اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ ہر وہ چیز جو وقوع پذیر ہوتی ہے ' اس میں تقدیر یا جبر (necessity) کا ہاتھ ہوتا ہے ' ہمیں مجموعی طور پر فطرت کی وجدانی تفہیم ہو سکتی ہے ۔ ہمیں واضح ' وانکشاف اور بین انداز سے احساس ہو سکتا ہے کہ ہر چیز اضافی ہے ' بلکہ یہ بھی کہ ہر چیز ایک (One) ہے ۔ مقصود (goal) ہر اس چیز کو ' جو موجود ہے ' ہمہ گیر (all-embracing) ادراک میں شامل کرنا ہے ۔ صرف تبھی ہمیں سچی خوشی اور اطمینان (قلب) مل سکے گا ۔ یہی وہ بات ہے جسے سپینوزا ہر چیز کو 'subspecie aeternitatis' میں دیکھنا کہتا تھا ۔ "

" اس کا مطلب ؟ "

" ہر چیز کو ابدیت کے تناظر میں دیکھنا ۔ کیا ہم نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی نکتے سے نہیں کیا تھا ؟ "

" ہمیں بھی اسی پر اپنی گفتگو ختم کرنا ہو گی ۔ اب مجھے چلنا ہو گا "

البرٹو اپنی نشست سے اٹھا ' چند قدم آگے بڑھا اور کتابوں کے شیلفوں سے پھلوں کی خاصی بڑی تھال اٹھا لیا ۔ اس نے تھال کافی کی میز پر رکھ دی ۔

" جانے سے پہلے کم از کم ایک آدھ پھل تو کھا لو ۔ "

سوفی نے ایک کیلا اٹھا لیا ۔ البرٹو نے سبز سیب پسند کیا ۔

سوفی نے کیلے کی ٹوپی توڑی اور پھر اس کا چھلکا اتارنے لگی ۔

"یہاں کچھ لکھا ہوا ہے۔" اس نے اچانک کہا۔

"کہاں؟"

"یہاں ___ کیلے کے چھلکے کے اندر۔ ایسے نظر آتا ہے جیسے یہ سیاہی کے برش سے لکھا گیا ہو۔"

سوفی میز کے اوپر جھک گئی اور اس نے البرٹو کو کیلا دکھایا۔ وہ بلند آواز سے پڑھنے لگا:

"ہلڈے، میں پھر آگیا ہوں۔ میں ہر جگہ موجود ہوتا ہوں۔ سال گرہ مبارک۔"

"بہت مضحکہ خیز۔" سوفی نے کہا۔

"یہ شخص روز بروز عیار سے عیار تر ہوتا جا رہا ہے۔"

"لیکن یہ ناممکن ہے ... آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ بتا سکتے ہیں کہ لبنان میں کیلے اگائے جاتے ہیں؟"

البرٹو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں اسے ہرگز نہیں کھاؤں گی۔"

"پھر چھوڑ دو۔ جو شخص چھلکا اتارے بغیر کیلے کے اندر اپنی بیٹی کے نام سال گرہ کا تہنیتی پیغام لکھتا ہے، وہ یقیناً ذہنی طور پر ماؤف شخص ہو گا۔ مگر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ شخص لازماً اختراع پسند بھی بہت ہو گا۔"

"ہاں، دونوں۔"

"تو کیا ہم یہاں اور ابھی طے کر دیں کہ ہلڈے کا باپ بے حد ذہین و فطین اور اختراع پسند ہے؟ یعنی دوسرے الفاظ میں وہ احمق بالکل نہیں۔"

"یہی تو میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ اور عین ممکن ہے کہ یہ وہی شخص ہو جس نے تب، جب میں پچھلی مرتبہ یہاں آئی تھی، آپ کی زبان سے مجھے ہلڈے کہلوایا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہی وہ شخص ہو جو ہمارے مونہوں میں الفاظ ڈال رہا ہے۔"

"کوئی چیز بھی خارج از امکان قرار نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ہمیں ہر چیز کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا چاہیے۔"

"کون جانے کہ شاید ہماری ساری زندگی محض خواب ہو۔"

"لیکن ہمیں نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔"

اس معاملے کی کوئی نسبتاً آسان وضاحت ہو ۔"

"آسان ہو یا مشکل ' مجھے بہرحال جلد از جلد گھر پہنچنا ہے ۔ امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی ۔"

البرٹو دروازے تک اس کے ساتھ گیا ۔جب وہ رخصت ہو رہی تھی ' اس نے کہا:

"ہلڈے 'ہماری پھر ملاقات ہو گی ۔"

پھر اس کے پیچھے دروازہ دھماکے سے بند ہو گیا۔

20 _ لوک

* * *

... اتنا ھی کورا اور خالی جتنا کہ استاد کی آمد سے پہلے تختہ سیاہ ھوتا ھے ...

سوفی ساڑھے آٹھ بجے گھر پہنچی ۔ یہ معاہدے سے ڈیڑھ گھنٹہ اوپر تھا ـــــ جو درحقیقت کوئی معاہدہ نہیں تھا ۔ وہ محض ڈنر سے دست بردار ہوئی تھی اور اپنی امی کے نام پیغام چھوڑ گئی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ سات بجے تک گھر پہنچ جائے گی۔

"سوفی ' اب یہ قصہ ختم کرنا ہوگا ۔ مجھے مرکزِاطلاعات کو ٹیلی فون کرنا اور ان سے پوچھنا پڑا آیا پرانے شہر میں البرٹو نام کا کوئی شخص رہتا ہے ۔ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا' بلکہ میرا استفسار سن کر ہنسنے لگے ۔"

"میں وہاں سے وقت پر نکل نہ سکی ۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک بہت بڑے راز سے پردہ اٹھانے کے قریب پہنچ گئے ہیں ۔"

"فضول ! بے معنی !"

"یہ صحیح ہے !"

"تم نے اسے اپنی پارٹی پر آنے کی دعوت دی ہے ؟"

"اف ' نہیں ۔ میں بالکل بھول گئی ۔"

"خیر ' اب میں زور دے کر کہہ رہی ہوں کہ اسے ضرور یہاں بلاؤ ۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں ۔ اور یہ ملاقات زیادہ سے زیادہ کل تک ہو جانا چاہیے ۔ کوئی نوجوان لڑکی اس

قسم کے سمر شخص سے ملتی رہے ' یہ فطری بات نہیں ۔"

"آپ کے پاس البرٹو سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ۔ ہلڈے کے باپ کے سلسلے میں بات اس سے بھی زیادہ بگڑ سکتی ہے ۔"

"یہ ہلڈے کون ہے ؟"

"اسی شخص کی بیٹی جو لبنان میں ہے ۔ وہ واقعی برا آدمی ہے ۔ ایسے لگتا ہے جیسے ساری دنیا کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہو ۔"

"اگر تم نے بلا تاخیر البرٹو سے میرا تعارف نہ کرایا ' میں تمہیں اس سے آئندہ ملاقات کی اجازت نہیں دوں گی ۔ مجھے اس کے بارے میں تب تک اطمینان نہیں ہو گا جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ دیکھنے میں کیسا نظر آتا ہے ۔"

سوفی کے ذہن میں کوئی زبردست خیال کوندے کی طرح لپکا اور اس نے اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی ۔

"اب تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟" اس کی ماں نے پیچھے سے آواز دی ۔

سوفی پلک جھپکنے میں واپس آ گئی ۔

"وہ کیسا نظر آتے ہیں ' آپ ایک منٹ میں دیکھ لیں گی ۔ اور پھر مجھے امید ہے کہ آپ کوئی اعتراض نہیں کریں گی ۔"

اس نے وڈیو کیسٹ لہرائی اور وی سی آر کی طرف چل پڑی ۔

"اس نے تمہیں وڈیو کیسٹ دی تھی ؟"

"ایتھنز سے . . ."

کچھ ہی دیر میں سکرین پر ایکروپولس کی تصویریں نمودار ہونے لگیں ۔ جب البرٹو آگے آیا اور براہ راست سوفی سے مخاطب ہوا ' اس کی ماں کی زبان گنگ ہو گئی ۔

اب سوفی کی نگاہوں میں کوئی ایسی چیز آئی جس کے متعلق وہ بھول چکی تھی ۔ ایکروپولس میں سیاحوں کا ازدحام تھا جو اپنے اپنے گروہوں میں ادھر ادھر گھوم پھر رہے اور یوں آپس میں خلط ملط ہو رہے تھے کہ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا کہ کون کس کے ساتھ ہے ۔ ایک گروہ کے عین درمیان میں کسی شخص نے چھوٹا سا پلے کارڈ اٹھا رکھا تھا ۔ اس پر HILDE (ہلڈے) تحریر تھا . . . البرٹو کا ایکروپولس پر ادھر ادھر گھومنا جاری تھا ۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلنے کے راستے سے نیچے اترا اور ایریوپگس پہاڑی پر چڑھ گیا جس کے اوپر کھڑے ہو کر پال نے اہل ایتھنز کے سامنے وعظ کہا تھا ۔ پھر وہ شہر کے چوک میں چلا

گیا اور وہاں سے سوفی کے ساتھ گفتگو کرنے لگا۔

اس کی امی اپنی نشست پر بیٹھی چھوٹے چھوٹے جملوں میں تبصرے کرتی رہی۔

"ناقابل یقین... وہ البرٹو ہے؟ وہ پھر خرگوش کا ذکر کرنے لگا ہے... مگر، ہاں، سوفی، وہ واقعی تمہارے ساتھ گفتگو کر رہا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ پال کبھی ایتھنز گئے تھے..."

وڈیو پر فلم کا وہ حصہ شروع ہو رہا تھا جس میں ایتھنز کو اچانک کھنڈرات میں سے ابھرتے دکھایا گیا تھا۔ سوفی عین وقت پر ٹیپ بند کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب جب کہ وہ اپنی امی کو البرٹو دکھا چکی تھی، افلاطون کے ساتھ بھی اس کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔

کمرے میں خاموشی تھی۔

"آپ کا ان کے متعلق کیا خیال ہے۔ شکل صورت اچھی نظر آ رہی ہے، ہے نا؟" سوفی نے اپنی امی کو چھیڑا۔

"کتنا عجیب شخص ہے! ایتھنز میں محض اس لیے اپنی فلم بنواتا ہے تاکہ وہ اس لڑکی کو بھیج سکے جسے وہ ٹھیک طرح سے جانتا تک نہیں۔ وہ ایتھنز کب گیا تھا؟"

"مجھے بالکل معلوم نہیں۔"

"مگر ایک بات اور بھی ہے..."

"کیا؟"

"اس کی شکل بالکل اس میجر سے ملتی جلتی ہے جو کبھی جنگل کی اس کٹیا میں رہا کرتا تھا۔"

"ممکن ہے، امی، یہ وہی ہوں۔"

"لیکن پندرہ سال سے اوپر ہو چکے ہیں، کسی نے آج تک اس کی دوبارہ شکل نہیں دیکھی۔"

"وہ شاید ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے ہوں... یا شاید ایتھنز چلے گئے ہوں۔"

اس کی امی نے تردید میں سر ہلا دیا: "جب میں نے اسے ستر کی دہائی میں کہیں دیکھا تھا، وہ اس البرٹو سے، جسے میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے، ایک دن بھی چھوٹا

نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا نام بھی غیر ملکی معلوم ہوتا تھا۔ ۔ ۔"

"کنوکس؟"

"ہوسکتا ہے، سوفی۔ ممکن ہے اس کا نام کنوکس ہی ہو۔"

"یا کننگ تھا؟"

"مجھے بالکل یاد نہیں آرہا۔ ۔ ۔ تم کس کنوکس یا کننگ کی بات کر رہی ہو؟"

"ایک تو البرٹو ہیں اور دوسرا ہلڈے کا باپ۔"

"یہ سب کچھ دیکھ اور سن کر میرا تو سر چکرانے لگا ہے۔"

"گھر میں کچھ کھانے کو ہے؟"

"کوفتے گرم کرلو۔"

پورے دو ہفتے گزر گئے لیکن سوفی کو البرٹو کا کوئی پیغام نہ ملا۔ ہاں، اسے ہلڈے کی سال گرہ کا ایک اور تہنیتی کارڈ ضرور وصول ہوگیا۔ جہاں تک اس کی اپنی سال گرہ کا تعلق ہے، اسے کہیں سے بھی کوئی کارڈ موصول نہ ہوا حالانکہ یہ دن اب آیا ہی چاہتا تھا۔

ایک روز وہ پرانے شہر میں نکل گئی۔ اس نے البرٹو کا دروازہ جا کھٹکھٹایا لیکن وہاں کوئی بندہ تھا نہ پرندہ۔ البتہ اس کے دروازے پر ایک چھوٹا سا رقعہ ضرور لٹک رہا تھا۔ اس پر تحریر تھا:

> ہلڈے، سال گرہ مبارک! اب حالات تبدیل ہو رہے ہیں اور اہم موڑ آیا ہی چاہتا ہے۔ میری بچی، یہ اہم موڑ کیا ہے؟ سچائی کا لمحہ! میں جب بھی اس کے متعلق سوچتا ہوں، میری خواہ مخواہ ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ فطری طور پر اس کا کچھ کچھ تعلق بارکلی سے ہے۔ بس، استقامت سے کام لو۔

سوفی نے دروازے سے رقعہ جھپٹ لیا اور واپس پر جاتے جاتے البرٹو کے ڈاک ڈبے میں ٹھونس گئی۔

کیا مصیبت ہے ! وہ یقیناً ایتھنز واپس نہیں چلے گئے ہوں گے ؛ جب ابھی تک اتنے سوال جواب طلب ہیں' وہ مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟

جب وہ چودہ جون کو گھر پہنچی' ہرمیز باغ میں کلیلیں لگاتا پھر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف لپکی اور وہ خوشی سے ناچتا کودتا اس کی طرف بھاگا۔ سوفی نے اس کی گردن میں اپنے بازو یوں حمائل کر دئے جیسے صرف وہی تمام معموں اور پہیلیوں کے جواب ڈھونڈ سکتا ہو۔

اس نے ایک بار پھر اپنی ماں کے نام رقعہ تحریر کیا لیکن اس مرتبہ اس نے اس پر البرٹو کا پتا بھی لکھ دیا۔

جب وہ شہر کے بیچوں بیچ جا رہے تھے' سوفی اگلے روز کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ اپنی سال گرہ کے بارے میں اتنا نہیں سوچ رہی تھی —— اس کی تقریب بہرحال وسط گرما سے ایک روز پہلے تک منعقد نہیں ہونا تھی۔ اس کی سوچوں کا محور ہلڈے کی سال گرہ تھی۔ یہ بھی اگلے ہی روز تھی۔ سوفی کو پکا یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ہو کر رہے گی۔ لبنان سے سال گرہ کے جو پے بہ پے اتنے کارڈ موصول ہو رہے ہیں' کم ازکم ان کی آمد کا سلسلہ تو بند ہو ہی جائے گا۔

جب وہ مین سکوائر عبور کر چکے اور خراماں خراماں پرانے شہر کی طرف رواں دواں تھے کہ ان کے راستے میں کوئی پارک آ گیا جس کے ساتھ کھیل کا میدان بھی تھا۔ ہرمیز ایک بنچ کے قریب کچھ اس انداز سے رک گیا جیسے وہ چاہتا ہو کہ سوفی وہاں بیٹھ جائے۔

سوفی نے اس کی خواہش کا احترام کیا۔ وہ بنچ پر بیٹھ گئی اور کتے کا سر سہلانے لگی۔ جب وہ اس کام میں مصروف تھی' اس نے ہرمیز کی آنکھوں میں جھانکا۔ اچانک کتے کا جسم بری طرح کپکپانے لگا۔ "یہ شاید اب بھونکنے لگے۔" سوفی کے دل میں خیال آیا۔

اب کتے کے جبڑے مرتعش ہونے لگے لیکن وہ بھونکا نہ غرایا۔ اس نے اپنا منہ کھولا اور کہا:

"ہلڈے' سال گرہ مبارک!"

سوفی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ وہ یوں بیٹھی تھی جیسے اس کی

زبان گنگ ہوگئی ہو۔ کیا کتے نے ابھی اس کے ساتھ بات کی تھی؟ ناممکن! کتا کیسے بات کرسکتا ہے؟ یہ ضرور اس کے اپنے تخیل کی کارروائی ہوگی کیونکہ وہ بڈھے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ لیکن اپنے قلب کی گہرائیوں میں اسے یقین ہوچکا تھا کہ ہرمیز نے بات کی تھی اور یوں گونجتی کھنکھناتی آواز سے کی تھی جیسے وہ حلق کے اندر سے نکلی ہو۔

اگلے سیکنڈ ہر چیز یوں کی توں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہرمیز دو مرتبہ اس طرح بھونکا جیسے وہ اس حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہتا ہو کہ اس نے ابھی ابھی انسانی آواز میں بات کی تھی ـــــ اب وہ معتدل رفتار سے سوفی کے آگے آگے البرٹو کے مکان کی طرف بھاگا جارہا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوا چاہتے تھے، سوفی نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ سارا دن موسم خوش گوار رہا تھا لیکن اب ذرا دور بھاری بادل اکٹھا ہونا شروع ہوگئے تھے۔

البرٹو نے دروازہ کھولا اور سوفی کے جھٹ منہ سے نکلا:

"کسی سلام ولام کی ضرورت نہیں۔ آپ بڑے احمق ہیں اور آپ کو اس کا علم ہے۔"

"اب کیا ہوا؟"

"میجر نے ہرمیز کو بولنا سکھا دیا ہے۔"

"تو نوبت بہ اینجا رسید!"

"جی ہاں۔ ذرا تصور کریں!"

"اور اس نے کیا کہا تھا؟"

"میں آپ کو تین مرتبہ قیاس آرائی کرنے کا موقع دیتی ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ اس نے مبارک باد قسم کی کوئی بات کہی ہوگی۔"

"وہ مارا!"

البرٹو نے سوفی کو اندر آنے دیا۔ اس مرتبہ وہ کسی اور زمانے کے ملبوسات پہنے ہوئے تھا۔ پچھلی مرتبہ اس نے جو ملبوسات زیب تن کر رکھے تھے، یہ ان سے کوئی زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن اس مرتبہ آرائشی پٹیاں، پھندنے اور جھالریں تقریباً غائب تھیں۔

"لیکن معاملہ محض اتنا نہیں تھا۔" سوفی نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"آپ کو اپنے ڈاک ڈبے میں کوئی رقعہ نہیں ملا؟"

"ارے، وہ! وہ تو میں نے اسی وقت پھینک دیا تھا۔"

"وہ جب بھی بار کلی کے متعلق سوچتا ہے اور اسے ہنسی آجاتی ہے، تو مجھے کوئی خاص پروا نہیں ہوتی۔ لیکن میں جو پوچھنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ آخر اس خاص فلسفی میں اتنی مضحکہ خیز بات کیا ہے؟"

"ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ پھر دیکھیں گے۔"

"لیکن آپ نے آج ہی کے دن اس کے متعلق گفتگو نہیں کرنا تھی؟"

"ہاں، کرنا تو آج ہی کے روز ہے۔"

البرٹو آرام سے صوفے پر متمکن ہو گیا۔ پھر اس نے کہا:

"پچھلی مرتبہ جب ہم یہاں بیٹھے تھے، میں نے تمہیں دیکارت اور سپینوزا کے متعلق بتایا تھا۔ ہم نے اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ دونوں میں ایک اہم چیز مشترک تھی، یعنی وہ دونوں عقلیت پسند تھے۔"

"اور عقلیت پسند وہ شخص ہوتا ہے جو عقل کو بہت اہمیت دیتا ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ عقلیت پسند کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ علم کا اولین اور اہم ترین سرچشمہ عقل ہوتی ہے اور اس کا یہ ایمان بھی ہوسکتا ہے کہ انسان کے دماغ میں بعض خلقی خیالات موجود ہوتے ہیں اور یہ تب بھی دماغ میں موجود ہوتے ہیں جب آدمی کو ابھی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہوا ہوتا۔ اور یہ خیالات جتنے زیادہ واضح اور غیر مبہم ہوں گے اتنا ہی یہ یقینی ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقت کے متماثل ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ 'کامل ذات' کے بارے میں دیکارت کا تصور کتنا واضح اور غیر مبہم تھا جس کی بنیاد پر وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ خدا موجود ہے۔"

"میں اتنی بھلکڑ نہیں۔"

"اس قسم کی عقلی سوچ سترھویں صدی کے فلسفے کی امتیازی خصوصیت تھی۔ اس کی جڑیں قرون وسطیٰ میں بھی مضبوطی سے پیوست تھیں اور تمہیں یاد ہوگا کہ افلاطون اور سقراط میں بھی یہ موجود تھی۔ لیکن اٹھارویں صدی کی روز افزوں خردہ گیر (in-depth) تنقید کا تو مقصد و مدعا ہی یہی تھا۔ تاہم اس زمانے کے متعدد فلسفیوں کی یہ رائے تھی کہ ہمارے دماغ میں قطعاً کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جس کا ہمیں حواس کے ذریعے تجربہ نہیں ہو چکا ہوتا۔ اس قسم کے نقطہ نظر کو تجربیت (empiricism) کہا

جاتا ہے۔"

"تو آج آپ ان تجربیت پسندوں کے متعلق گفتگو کریں گے؟"

"ہاں، میں کوشش کروں گا۔ اہم ترین تجربیت پسند ـــــ یا تجربے (experience) کے فلسفی ـــــ لوک (Locke)، بارکلی (Berkeley) اور ہیوم (Hume) تھے اور اتفاق سے وہ تینوں کے تینوں برطانوی تھے۔ سترھویں صدی کے سرکردہ عقلیت پسند دیکارت (وہ فرانسیسی تھا)، سپینوزا (وہ ولندیزی تھا) اور لائب نٹس (وہ جرمن تھا) تھے۔ چنانچہ ہم عام طور پر برطانوی تجربیت اور براعظمی عقلیت پسندی کے مابین خط امتیاز کھینچ دیتے ہیں۔"

"آپ نے کتنے مشکل الفاظ کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ کیا آپ تجربیت کے معانی دہرا سکتے ہیں؟"

"تجربیت پسند دنیا کے متعلق اپنا سارا علم اس چیز سے حاصل کرتے ہیں جو انہیں ان کے حواس بتاتے ہیں۔ تجربیتی انداز فکر کی کلاسیکی ترتیب و تسوید ارسطو سے آئی تھی۔ اس نے کہا تھا: 'دماغ میں کچھ نہیں ہوتا سوائے اس کے جو پہلے ہی ہمارے حواس میں (موجود) ہوتا ہے۔' یہ نظریہ ڈھکے چھپے انداز سے افلاطون کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتا تھا جس نے کہا تھا کہ انسان دنیائے امثال سے خلقی 'امثال' لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لوک ارسطو کے الفاظ دہراتا ہے اور جب لوک انہیں استعمال کرتا ہے تو اس کا نشانہ دیکارت ہوتا ہے۔"

"دماغ میں کچھ نہیں ہوتا . . . سوائے اس کے جو پہلے ہی ہمارے حواس میں موجود ہوتا ہے؟"

"جب تک ہم اس دنیا کو، جس میں ہمیں لایا جاتا ہے، دیکھ نہ لیں، (ہمارے ذہنوں میں) کوئی خلقی خیالات / امثال یا تصورات پیدا نہیں ہوتے۔ اگر (ہمارے ذہن میں) کوئی تصور یا مثال ہے بھی جس کا تجربہ شدہ حقائق سے کوئی تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا، پھر یہ کاذب تصور ہو گا۔ مثلاً جب ہم 'خدا' 'ابدیت' یا 'مادا' (substance) جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں، تو ہم عقل کا غلط استعمال کرتے ہیں کیونکہ کسی شخص کو بھی خدا 'ابدیت' یا جسے فلسفی مادا کا نام دیتے ہیں، تجربہ نہیں ہوا ہوتا۔ چنانچہ اس قسم کے متعدد عالمانہ مقالے لکھے جا سکتے ہیں جن میں درحقیقت کوئی ایسا تصور پیش نہیں کیا جاتا جسے صحیح معنوں میں نیا تصور کہا جا سکے۔ اس طرح کی جودت اور کاریگری سے

تراشیدہ فلسفیانہ نظام بظاہر تو خیرہ کن ہو سکتا ہے لیکن اصلاً یہ ہوتا خالص تخیلاتی (fantasy) ہی ہے۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی کے فلسفیوں کو اس نوعیت کے سوالوں کی ابھی خاصی تعداد ورثے میں ملی تھی۔ اب ان کا غور و بینی سے جائزہ لیا جانا تھا۔ انہیں تمام کھوکھلے تصورات سے پاک کیا جانا تھا۔ اس ضمن میں جو کچھ ہوا، ہم اس کا موازنہ سونا چھاننے کے عمل سے کر سکتے ہیں۔ لوگ ندی نالوں اور دریاؤں سے جو کچھ نکالتے ہیں، وہ زیادہ تر ریت اور گارا ہوتا ہے۔ لیکن جب اسے چھانی میں سے چھانا جاتا ہے تو کہیں کہیں سونے کا ذرہ بھی اپنی چمک دمک دکھا ہی دیتا ہے۔"

"اور سونے کا وہ ذرہ صحیح تجربے کے مترادف ہے؟"

"یا کم از کم ان خیالات کے جن کا تجربے کے ساتھ تعلق قائم کیا جا سکتا ہے۔ برطانوی تجربیت پسندوں کے لیے تمام انسانی تصورات کا دقیق تنقیدی جائزہ لینا بڑا اہم معاملہ بن گیا تھا کیونکہ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ حقیقی تجربے میں ان کے لیے کوئی اساس میسر ہے یا نہیں۔ لیکن ہم ان فلسفیوں کا ایک ایک کر کے مطالعہ کریں گے۔"

"بہت اچھا۔ فرمائیں۔"

"ان میں سے پہلا انگریز فلسفی جون لوک تھا اور وہ 1632 سے 1704 تک بقید حیات رہا۔ اس کی معرکۃ الآرا کتاب 'انسانی تفہیم کے متعلق مقالہ' ('Essay Conce-rning Human Understanding') ہے۔ اس کی اشاعت 1690 میں عمل میں آئی تھی۔ اس میں اس نے دو سوالوں کی صراحت کرنے کی کوشش کی تھی۔ پہلا سوال یہ تھا: ہم اپنے خیالات کہاں سے حاصل کرتے ہیں؟ دوسرا سوال تھا: جو کچھ ہمارے حواس بتاتے ہیں، کیا ہم اس پر اعتبار کر سکتے ہیں؟"

"یہ ہوا نا کوئی پراجیکٹ!"

"ہم ان سوالات سے ایک ایک کر کے نپٹیں گے۔ لوک کا دعویٰ ہے کہ ہمارے تمام خیالات اور افکار اس (چیز) سے برآمد ہوتے ہیں جسے ہم اپنے حواس کی مدد سے سمجھتے ہیں۔ ہمارے کسی شے کا ادراک کرنے سے پہلے دماغ 'tabula rasa' ——— یا خالی سلیٹ ——— ہوتا ہے۔"

"آپ اس لاطینی کا پیچھا چھوڑ نہیں سکتے؟"

"چنانچہ ہمارے کسی شے کا ادراک کرنے سے پہلے دماغ اسی طرح خالی اور کورا ہوتا ہے جس طرح استاد کے کلاس روم میں پہنچنے سے پہلے تختہ سیاہ ہوتا ہے۔ لوک

نے غیر آراستہ اور بلا فرنیچر کمرے سے بھی دماغ کا موازنہ کیا تھا۔ پھر ہمیں اشیا کا ادراک ہونے لگتا ہے۔ہم اپنے گردوپیش کی دنیا دیکھتے ہیں، ہم سونگھتے ہیں، چکھتے ہیں، (ہاتھ لگا کر) محسوس کرتے ہیں اور سنتے ہیں۔ کوئی بھی ان کاموں کو اتنی شدت سے نہیں کرتا جتنا کہ شیرخوار بچے کرتے ہیں۔ اس طریقے سے وہ، جنہیں لوک سادہ حسی خیالات کہتا ہے، وجود میں آتے ہیں۔ لیکن دماغ باہر کی دنیا سے محض مفعولی انداز سے (passively) اطلاعات موصول نہیں کرتا۔ دماغ میں بھی کچھ نہ کچھ ترت پھرت (یا فعالیت) ہوتی ہے۔سوچنے، استدلال کرنے، یقین لانے اور شک کرنے سے یک حسی خیالات (single sense ideas) کی چھان بین ہوتی ہے اور یوں وہ چیز وجود میں آتی ہے جسے وہ تفکر (reflection) کہتا ہے۔یوں اس نے 'تحس' (sensation) اور 'تفکر' کے مابین امتیاز کردیا۔ دماغ محض منفعل یا بے حرکت گیرندہ (passive rec-eiver) نہیں۔ وہ تمام تحسات کی، جو ہجوم در ہجوم چلے آتے ہیں، منظم انداز سے چھان پھٹک اور درجہ بندی کرتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کو چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔"

"چوکس؟"

"لوک اس بات پر زور دیتا تھا کہ واحد اشیا جن کا ہم ادراک کرسکتے ہیں، سادے تحسات ہیں۔ مثلاً جب میں کوئی سیب کھاتا ہوں، میں ایک ہی تحس سے پورے سیب کا ادراک نہیں کرپاتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مجھے تحسات کا ایک پورا سلسلہ وصول ہوتا ہے ـــــ مثلاً یہ کوئی ایسی چیز ہے، جس کا رنگ سبز ہے، اس سے تازگی کی مہک آتی ہے، یہ رسیلا ہے اور اس کا ذائقہ قدرے ترش ہے۔صرف تبھی جب میں کوئی سیب بار بار کھا چکتا ہوں، میں سوچنے لگتا ہوں: اب میں 'سیب' کھا رہا ہوں۔ لوک کے الفاظ میں ہم یوں کہیں گے: میں نے 'سیب' کا مرکب (complex) تصور تشکل کرلیا ہے۔جب ہم دودھ پیتے بچے تھے، پہلی مرتبہ سیب چکھنے کے بعد ہمارے ذہن میں اس قسم کا مرکب تصور نہیں آیا تھا۔ لیکن ہم نے کوئی سبز چیز دیکھی تھی، کوئی تازہ، رسیلی، مزے دار چیز چکھی تھی . . . یہ قدرے ترش بھی تھی۔ تھوڑے تھوڑے کرکے ہم ان سے ملتے جلتے بے شمار تحسات کا پلندا اکٹھا کرلیتے ہیں اور 'سیب'، 'ناشپاتی' اور 'نارنگی' جیسے تصورات تشکیل دے لیتے ہیں۔ لیکن حتمی تجزیے میں دنیا کے متعلق ہمارے تمام علم کا مواد (material) تحسات کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ وہ

علم جس کا سراغ کسی سیدھے سادے تحس تک نہیں پہنچتا ، کاذب علم ہے ، نتیجتاً اسے لازماً مسترد کردینا چاہیے۔"

"بہرحال ہم اتنا یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم جو کچھ دیکھتے ، سنتے ، سونگھتے اور چکھتے ہیں ، وہی اس کے ادراک کا طریقہ ہے۔"

"اس کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی ۔ اس سے ہم دوسرے سوال تک پہنچ جاتے ہیں جو لوک نے پوچھا تھا ۔ اس نے پہلے اس سوال کا جواب دیا تھا کہ ہم اپنے خیالات کہاں سے حاصل کرتے ہیں ۔ اس کے بعد اس نے استفسار کیا : کیا دنیا واقعی ایسی ہی ہے جیسا کہ ہم اس کا ادراک کرتے ہیں ؟ سوفی ، تم سمجھ گئی ہو گی کہ یہ بات اتنی واضح نہیں ۔ ہمیں نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی نہیں دکھانا چاہیے ۔ یہ واحد چیز ہے جو سچے فلسفی کو کبھی نہیں کرنا چاہیے ۔"

"میں نے تو ایک لفظ بھی نہیں کہا ۔"

"لوک جنہیں 'بنیادی' اور 'ثانوی' صفات کہتا ہے ، وہ ان کے درمیان امتیاز کرتا ہے ۔ اور اس معاملے میں وہ اپنے پیش رو فلسفیوں کے ــــــ جن میں دیکارت بھی شامل ہے ــــــ احسان کا اعتراف کرتا ہے ۔

"بنیادی صفات سے اس کی مراد جسامت ، وزن ، حرکت ، تعداد ، علیٰ ہذالقیاس تھی ۔جب اس نوع کی صفات کا سوال اٹھتا ہے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ حواس انہیں معروضی انداز سے پیش کردیتے ہیں ۔ہم اشیا میں دوسری صفات کا ادراک بھی کرتے ہیں ۔ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز ترش یا شیریں ، سبز یا سرخ ، ٹھنڈی یا گرم ہے ۔ لوک انہیں ثانوی صفات کہتا ہے ۔ اس قسم کے تحسات ــــــ رنگ ، بو ، ذائقہ ، آواز ــــــ ان اصل صفات کو پیش نہیں کرتے جو کہ خود اشیا میں خلقی طور پر موجود ہوتی ہیں ۔ وہ ہمارے حواس پر خارجی حقیقت کا محض تاثر (effect) پیدا کرتے ہیں ۔"

"دوسرے الفاظ میں یہ ہر شخص کے اپنے اپنے ذوق کا معاملہ ہے ۔"

"بالکل صحیح ۔ ہر شخص جسامت اور وزن جیسی بنیادی صفات پر متفق ہوسکتا ہے کیونکہ وہ خود اشیا میں موجود ہوتی ہیں ۔لیکن جہاں تک رنگ اور بو جیسی ثانوی صفات کا تعلق ہے ، یہ ہر انسان اور جانور کے لیے مختلف ہوسکتی ہیں کیونکہ ان کا انحصار ہر فرد کے تحسات کی نوعیت پر ہوتا ہے ۔"

"جب جوآنا نارنگی کھاتی ہے اس کے چہرے کی وہی کیفیت ہوجاتی ہے جو

دوسروں کے لیموں کھانے پر ہوتی ہے ۔ وہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ پھانک نہیں کھا سکتی ۔ وہ کہتی ہے کہ اس کا ذائقہ ترش ہوتا ہے ۔ میں عام طور پر اسی نارنگی کو شیریں اور پرلطف گردانتی ہوں ۔"

"اور تم دونوں میں کوئی بھی غلط یا صحیح نہیں ہے ۔ تم صرف یہ بتا رہی ہو کہ نارنگی تمہارے حواس پر کس طرح اثرانداز ہوتی ہے ۔ اسی بات کا رنگت کی حس پر بھی اطلاق ہوتا ہے ۔ ممکن ہے کہ تمہیں سرخ رنگ کا کوئی خاص درجہ (shade) پسند نہ ہو ۔ لیکن اگر جوآنا بالکل اسی رنگ کا کوئی ڈریس خریدتی ہے ' تو تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم اپنی رائے اپنے پاس ہی رکھو (اور نکتہ چینی سے گریز کرو) ۔ تمہیں رنگ کا تجربہ مختلف انداز سے ہوتا ہے لیکن رنگ فی نفسہ نہ خوبصورت ہوتا ھے اور نہ بھدا ۔"

"لیکن ہر شخص اس بات پر تو متفق ہو سکتا ہے کہ نارنگی گول ہوتی ہے ۔"

"ہاں ' اگر تمہارے پاس گول نارنگی ہو ' کوئی شخص بھی اسے مربع ' تصور ' نہیں کرے گا ۔ تم اسے ترش یا شیریں ' تصور ' کر سکتی ہو ' لیکن اگر اس کا وزن محض دو سوگرام ہو تو تم یہ ' تصور ' نہیں باندھ سکتیں کہ اس کا وزن آٹھ کلوگرام ہے ۔ تم یقیناً یہ کہہ سکتی ہو : ' مجھے یقین ہے کہ اس کا وزن کئی کلوگرام ہے ' لیکن اس صورت میں بھی تم خاصی بڑی غلطی کا ارتکاب کرو گی کیونکہ تمہارا قیافہ حقیقت سے بہت دور ہوگا ۔ اگر متعدد اشخاص کو قیافہ لگانا پڑے کہ فلاں چیز کا وزن کتنا ہے ان میں سے کم از کم ایک قیافہ ضرور ایسا ہوگا جو دوسروں کی نسبت زیادہ صحیح ہوگا ۔ اسی چیز کا اطلاق اعداد پر ہوتا ہے ۔ یا تو ڈبے میں مٹر کے 986 دانے ھیں یا پھر نہیں ۔ یہی حال حرکت کا ہے ۔ کار یا تو ساکن ہے یا پھر متحرک ۔"

"میں سمجھ گئی ۔"

"چنانچہ جب ' توسیعی ' حقیقت کا سوال آیا ' لوک نے دیکارت سے اتفاق کیا کہ اس میں بعض ایسی صفات ہوتی ہیں جنہیں انسان اپنی عقل کی مدد سے سمجھ سکتا ہے ۔"

"اس بارے میں متفق ہونے میں کوئی مشکل پیش نہیں آنا چاہیے ۔"

"لوک تسلیم کرتا تھا کہ بعض دوسرے شعبوں میں بھی وہ علم ' جسے وہ ' وجدانی ' یا ' ایضاحی ' علم کا نام دیتا تھا ' موجود ہو سکتا ہے ۔ مثلاً اس کا خیال تھا کہ بعض اخلاقی اصولوں کا اطلاق ہر شخص پر ہوتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں اس کا فطری حق

(natural right) کے تصور پر اعتقاد تھا اور یہ اس کی فکر کا عقلیت پسندانہ پہلو تھا۔ اس کے مساوی عقلیت پسندانہ پہلو یہ تھا کہ لوک کا ایمان تھا کہ انسانی عقل کو یہ وصف فطرتاً ودیعت ہوا ہے کہ وہ یہ جان سکتی ہے کہ خدا موجود ہے۔

"ممکن ہے کہ وہ ٹھیک کہتا ہو۔"

"کس بارے میں؟"

"کہ خدا موجود ہے۔"

"ہاں' یہ ممکن ہے۔ لیکن اس نے اس معاملے کو محض ایمان پر نہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ خدا کا تصور انسانی عقل سے پیدا ہوا ہے۔ اس کی یہ سوچ عقلیت پسندانہ شعار کے مطابق تھی۔ میں اتنا مزید کہوں گا کہ وہ ذہنی آزادی اور رواداری کے حق میں آواز اٹھاتا تھا۔ جہاں تک مساوات جنس کا تعلق ہے' وہ اس مسئلے میں بھی گہری دلچسپی لیتا تھا۔ اس کا دعوٰی تھا کہ عورتوں کو مردوں کی جو محکومی کرنا پڑتا ہے' وہ 'مرد ساختہ' (man-made) ہے۔ چنانچہ اسے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔"

"یہاں میں اختلاف نہیں کر سکتی۔"

"لوک حالیہ زمانوں کے ان اولین فلسفیوں میں شامل ہے جنہوں نے جنسی کرداروں (sexual roles) میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس نے جون سٹوارٹ مل(1) کو شدت سے متاثر کیا جس نے اپنی باری پر مساوات مردوزن کی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کیا۔ بحیثیت مجموعی لوک متعدد لبرل خیالات کا پیش رو تھا جو بعد ازاں اٹھارویں صدی کی فرانسیسی روشن خیالی کے دور میں پوری طرح برگ و بار لائے۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے تقسیم اختیارات کے اصول کی وکالت کی..."

"تقسیم اختیارات کا یہی مطلب ہے نا کہ مملکت کا اختیار مختلف اداروں میں تقسیم کر دیا جائے؟"

"تمہیں یاد ہے کہ یہ ادارے کون کون سے ہیں؟"

"ایک تو قانون سازی کا اختیار یا منتخب نمائندوں کا ایوان ہے' دوسرا عدالتی اختیار یا عدالت ہائے انصاف ہیں اور تیسرا انتظامی اختیار یا حکومت ہے۔"

"اختیارات کی اس تقسیم کا تصور سب سے پہلے فرانسیسی روشن خیالی کے دور کے فلسفی مونٹس کیو (2) نے پیش کیا تھا۔ لوک نے جس بات پر اولین اور زبردست زور دیا' وہ یہ تھی کہ جور و استبداد سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قانون سازی کرنے

اور انتظامی امور چلانے کے اختیارات علیحدہ علیحدہ اداروں کے پاس ہونا چاہئیں۔ وہ لوئی چہار دہم (3) کے عہد کا شخص تھا جس نے تمام اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کر لیے تھے۔ 'میں ہی مملکت ہوں' وہ کہا کرتا تھا۔ آج کل ہم لوئی چہار دہم کے طرز عمل کو لاقانونی اور من مانی حکومت کا نام دیں گے۔ لوک کا نقطہ نظر یہ تھا کہ قانونی مملکت صرف تبھی وجود میں آسکتی ہے جب عوام کے نمائندے قوانین بنائیں اور بادشاہ یا حکومت ان پر عمل در آمد کرائے۔"

21 ۔ ہیوم

* * *

. . . پھر اسے شعلوں کے سپرد کر دیں . . .

البرٹو بیٹھا ٹکٹکی باندھ کر میز کی طرف دیکھتا رہا ۔ آخر کار اس نے گردن گھمائی اور کھڑکی میں باہر کی جانب جھانکنے لگا ۔

" آسمان ابر آلود ہو رہا ہے ۔ " سوفی نے کہا ۔

"ہاں ۔ حبس بڑھ گیا ہے ۔ "

" تو اب آپ بارکلی کے متعلق گفتگو کریں گے ۔ "

" تینوں برطانوی تجربیت پسندوں میں اگلا نمبر اسی کا ہے لیکن چونکہ وہ کئی لحاظ سے اپنی قسم آپ تھا ' ہم اپنی توجہ کا مرکز پہلے ڈیوڈ ہیوم کو بنائیں گے جو 1711 سے 1776 تک زندہ رہا ۔ تجربیت پسندوں میں وہ اہم ترین ہے ۔ وہ اس اعتبار سے بھی نمایاں حیثیت کا مالک ہے کیونکہ اسی نے جرمنی کے عظیم فلسفی عمانویل کانٹ (باب نمبر 25) کو اپنے فلسفے کی راہ سجھائی تھی ۔ "

" کیا آپ کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ مجھے بارکلی کے فلسفے میں زیادہ دلچسپی ہے ؟ "

" یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ۔ ہیوم کی پرورش اور تعلیم و تربیت سکاٹ لینڈ کے شہر ایڈنبرا اور اس کے قرب و جوار میں ہوئی ۔ اس کا خاندان اسے قانون کی تعلیم دلانا چاہتا تھا لیکن خود اس کا اپنا یہ حال تھا کہ کوشش کے باوجود اس کی طبیعت ' فلسفے اور

علم کے ماسوا کسی اور چیز کی طرف مائل ہی نہیں ہوتی تھی ۔' وہ والتیر اور روسو جیسے
عظیم مفکرین کی طرح روشن خیالی کے دور میں رہتا تھا اور اپنی زندگی کے اواخر میں
ایڈنبرا میں مستقل رہائش اختیار کرنے سے قبل وہ یورپی ممالک میں بہت گھوما پھرا تھا۔
اس کی اصل تصنیف ' انسانی فطرت پر مقالہ ' ('A Treatise of Human Nature')
تب شائع ہوئی تھی جب اس کی عمر ابھی اٹھائیس سال تھی لیکن اس کا دعوٰی تھا کہ اسے
کتاب کا خیال پندرہ سال کی عمر میں ہی سوجھ گیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ میرے پاس ضائع کرنے کو کوئی وقت نہیں۔"

"وہ تو تم پہلے ہی شروع کر چکی ہو۔"

"لیکن اگر مجھے اپنا فلسفہ مرتب کرنا پڑا ' تو میں اب تک جو کچھ سن چکی ہوں ' یہ
اس سے خاصا مختلف ہو گا۔"

"کیا کوئی ایسی بات ہے جس کا خاص طور پر ذکر نہ ہو سکا ہو؟"

"خیر ' پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے اب تک جن فلسفیوں کے افکار پر روشنی
ڈالی ہے ' وہ سب کے سب مرد ہیں ۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ سارے مرد اپنی ہی دنیا میں
رہتے تھے ۔ مجھے حقیقی زندگی میں زیادہ دلچسپی ہے جہاں پھول ہیں ' جانور ہیں ' بچے ہیں
جو پیدا ہوتے اور پھلتے پھولتے ہیں ۔ ادھر آپ جیسے فلسفی ہیں جو ہمیشہ ' انسان ' اور
انسانوں ' کی باتیں کرتے رہتے ہیں ۔ اور اب ' انسانی فطرت ' پر ایک اور مقالہ لے کر بیٹھ
گئے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ' انسان ' ادھیڑ عمر کا مرد ہے ۔ میرا مطلب ہے کہ زندگی کا
آغاز حمل اور پیدائش سے ہوتا ہے لیکن میں نے ابھی تک پوتڑوں یا چیختے چلاتے بچوں
کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں سنا ۔ اور محبت اور دوستی کا بھی کوئی خاص ذکر نہیں ہوا ۔"

"ہاں ۔ تم ٹھیک کہتی ہو ۔ مگر ہیوم ایک ایسا فلسفی تھا جو مختلف انداز سے سوچتا
تھا ۔ کسی بھی دوسرے فلسفی کی نسبت وہ روزمرہ کی زندگی کو اپنا زیادہ نقطہ آغاز بناتا
تھا ۔ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ بچوں ــــــ دنیا کے نووارد شہریوں ــــــ کو زندگی
کا جس طرح تجربہ ہوتا ہے ' اس میں اس کے سمجھنے کی زیادہ صلاحیت تھی ۔"

"پھر میں بھی تو سنوں کہ وہ کیا کہتا ہے ۔ میرے حق میں شاید یہی بہتر
ہو گا ۔"

"تجربیت پسند کی حیثیت سے ہیوم نے تمام گنجلک تصورات اور فکری
سانچوں کی صفائی کا ذمہ سنبھال لیا ۔ قرون وسطیٰ کے علوم اور سترھویں صدی کے

عقلیت پسند فلسفے کے پرانے تحریری اور زبانی افکار کے ملبوں کے ڈھیر لگ چکے تھے۔ ہیوم نے تجویز پیش کی کہ ہمیں دنیا کے بارے میں دوبارہ اپنے فطری، برجستہ اور بے ساختہ تجربے (experience) کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کوئی فلسفی، ہم سے روزمرہ کے تجربات نظرانداز نہیں کرا سکے گا اور نہ ہم پر طرز عمل کے ایسے اصول ٹھونس سکے گا جو ان سے مختلف ہوں جو ہمیں روزمرہ کی زندگی پر غور و فکر کرنے کے بعد دستیاب ہوتے ہیں۔' یہ اس کے اپنے الفاظ ہیں۔"

"اب تک تو بات امید افزا معلوم ہوتی ہے۔ آپ کوئی مثال دے سکتے ہیں؟"

"ہیوم کے زمانے میں فرشتوں یعنی پروں والے انسانوں پر عام یقین کیا جاتا تھا۔ سوفی، تم نے کبھی اس قسم کی کوئی مخلوق دیکھی ہے؟"

"نہیں۔"

"لیکن تم نے انسانی شکل تو دیکھی ہے؟"

"بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کا سوال ہے؟"

"تم نے پر (wings) بھی دیکھے ہوں گے؟"

"بالکل۔ لیکن کسی انسانی جسم پر نہیں۔"

"چنانچہ ہیوم کے مطابق 'فرشتہ' مرکب (complex) تصور ہے۔ یہ دو مختلف تجربوں پر مشتمل ہے جن کا درحقیقت ایک دوسرے سے تو کوئی تعلق نہیں بنتا لیکن جو بہرحال انسان کے تخیل سے منسلک ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کاذب خیال ہے جسے بلا تاخیر مسترد کر دینا چاہیے۔ اسی طریقے سے ہمیں اپنے خیالات و تصورات اور اپنے کتابوں کے ذخیروں کی بھی صفائی کرنا چاہیے۔ کیونکہ جیسا کہ ہیوم خود بیان کرتا ہے: اگر ہم اپنے ہاتھ میں کوئی کتاب اٹھاتے ہیں... ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے'' کیا اس میں مقدار یا تعداد کے متعلق کوئی مجرد استدلال (abstract reasoning) پایا جاتا ہے' - نہیں - ' پھر اسے شعلوں کے سپرد کر دیں کیونکہ اس میں سوفسطہ (sophistry = دلیل باطل) اور التباس (illusion) کے ماسوا اور کچھ بھی نہیں۔"

"لیکن یہ تو انتہائی سخت طرز فکر ہے۔"

"مگر دنیا پھر بھی موجود رہتی ہے، پہلے کی نسبت کہیں تر و تازہ اور واضح خطوط والی۔ ہیوم جاننا چاہتا تھا کہ بچے کو زندگی کا کس طرح تجربہ ہوتا ہے۔ کیا تم نے کہا نہیں تھا کہ اکثر فلسفی، جن کے متعلق تم نے باتیں سنی ہیں، اپنی ہی دنیا میں مگن

رہتے تھے، اور یہ کہ تمہیں حقیقی دنیا میں زیادہ دلچسپی ہے؟"

"ہاں۔ کچھ اسی قسم کی بات۔"

"ہیوم بھی اسی طرح کی بات کہہ سکتا تھا۔ آؤ، ہم اس کے خیالات کے منطقی ربط کا ذرا قریب سے جائزہ لیتے ہیں۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"ہیوم اپنی بات کا آغاز یہ ثابت کرنے کے بعد کرتا ہے کہ ادراک (perce-ption) دو مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کو وہ 'تاثرات' (impressions) اور دوسرے کو 'خیالات یا تصورات' (ideas) کا نام دیتا ہے۔ جب وہ لفظ 'تاثرات' استعمال کرتا ہے تو اس کی مراد خارجی (external) حقیقت کا فوری تحس (sensat-ion) ہے۔ 'خیالات یا تصورات' کا مطلب اس کے نزدیک ان تاثرات کی یاد نو یا بازیافت (recollection) ہے۔"

"کیا آپ مجھے کوئی مثال دے سکتے ہیں؟"

"اگر تمہارے جسم کا کوئی حصہ گرم چولہے پر جل جائے، تو تمہیں اس کا فوری 'تاثر' ملتا ہے۔ بعد میں تمہیں یاد آتا ہے کہ تم اپنے جسم کا کوئی عضو جلا بیٹھی تھیں۔ جہاں تک آدمی اس تاثر (کی کیفیت) کو یاد کرسکتا ہے، ہیوم اسے 'خیال' کہتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ (اولین) تاثر اس تاثر کی سوچی ہوئی یاد کی نسبت کہیں زیادہ توانا اور زندگی سے بھرپور ہوتا ہے۔ تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ تحس اصل (orig-inal) چیز ہے جب کہ خیال یا سوچ (reflection) اس کی محض دھندلی نقل ہے۔ دماغ میں جو خیال جمع ہوتا ہے، وہ تاثر ہی ہے جو اس کی براہ راست علت ہوتا ہے۔"

"یہاں تک تو مجھے آپ کی بات کی سمجھ آگئی ہے۔"

"ہیوم زور دے کر مزید کہتا ہے کہ تاثر اور تصور دونوں ہی سادہ بھی ہوسکتے ہیں اور مرکب (پیچیدہ) بھی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے لوک کے سلسلے میں سیب کی بات کی تھی۔ سیب کا براہ راست تجربہ پیچیدہ تاثر کی مثال ہے۔"

"قطع کلامی کی معافی چاہتی ہوں لیکن کیا یہ بات واقعی اتنی زیادہ اہم ہے؟"

"اہم؟ تم یہ سوال کیسے پوچھ سکتی ہو؟ ممکن ہے کہ فلسفی متعدد فرضی مسائل (pseudo problems) سے مغز کھپائی کرتے رہے ہوں، پھر بھی تمہیں اب بات سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے کہ دلیل کس طرح تشکیل پاتی ہے۔ غالباً ہیوم دیکارت سے

اتفاق رائے ظاہر کرتا ہے کہ خیال کاری کے عمل (thought process) کی تشکیل بالکل بنیاد سے شروع کرنا بہت ضروری ہے۔"

"بہت اچھا، بہت اچھا۔"

"ہیوم کا نکتہ یہ ہے کہ ہم بعض اوقات ایسے مرکب خیالات متشکل کر لیتے ہیں جن کے متماثل طبعی دنیا میں کوئی شے نہیں ہوتی۔ ہم فرشتوں کا پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اس سے پہلے ہم نے مگرہتھوں (Crocophants) کا حوالہ دیا تھا۔ ایک اور مثال 'پردار' گھوڑے پگاسس (1) کی ہے۔ ان تمام مثالوں میں ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ دماغ نے مختلف تراشے کاٹ کر اور انہیں آپس میں جوڑ کر خود ہی بالکل ہی نئی چیز تخلیق کر کے بڑا معرکہ سرانجام دیا ہے۔ ہر تراشے (عنصر) کا پہلے ادراک کیا گیا اور پھر 'اصلی' تاثر کی شکل میں دماغ کے تھیٹر میں داخل کر دیا گیا۔ درحقیقت دماغ خود کوئی چیز ایجاد یا تخلیق نہیں کرتا۔ وہ تو بس مختلف چیزوں کو اکٹھا کرتا ہے اور آپس میں جوڑتا رہتا ہے اور یوں کاذب 'خیالات' کی تشکیل کر دیتا ہے۔"

"جی، میں سمجھ گئی۔ یہ اہم نکتہ ہے۔"

"بہت اچھا، پھر۔ ہیوم یہ دیکھنے کے لیے ہر خیال کی تحقیق کرنا اور اس کی جڑ تک پہنچنا چاہتا تھا کہ کہیں یہ دو یا دو سے زیادہ اشیا کے آپس میں مل جانے سے اس طرح تو متشکل نہیں ہو گیا کہ اس کا مماثل حقیقی دنیا میں کہیں موجود ہی نہ ہو۔ وہ پوچھتا تھا: 'اس خیال کا سرچشمہ کون سا تاثر ہے؟' پہلے تو اسے ان 'مفرد' (single) خیالات کی جستجو ہوتی تھی جو کسی پیچیدہ / مرکب خیال کی تشکیل میں استعمال ہونے تھے۔ اس سے اسے وہ تنقیدی طریقہ میسر آجاتا جس سے وہ ہمارے خیالات کا تجزیہ کر سکتا۔ اور یہ وہ طریقہ ہے جسے بروئے کار لا کر وہ ہمارے خیالات اور تصورات کی چھان پھٹک کرنے اور انہیں رطب و یابس سے پاک کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔"

"آپ کوئی ایک دو مثالیں دے سکتے ہیں؟"

"ہیوم کے زمانے میں ایسے بے شمار لوگ موجود تھے جن کے ذہنوں میں 'جنت' یا 'نئے یروشلم' کے متعلق الجھاؤ سے بالکل پاک واضح اور بین تصورات تھے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ دیکارت نے کس طرح یہ عندیہ دیا تھا کہ اگر 'خیالات الجھاؤ سے پاک' بین اور واضح، ہوں تو وہ فی نفسہ اس امر کی ضمانت ہوتے ہیں کہ وہ کسی ایسی چیز کے متماثل ہیں جو حقیقتاً موجود ہے؟"

"میں نے عرض کیا تھا کہ میں کوئی خاص بھلکڑ نہیں ہوں۔"

"(لیکن جب ہم غور کرتے ہیں) ہمیں بہت جلد احساس ہو جاتا ہے کہ جنت کے متعلق ہمارا تصور مختلف عناصر کے آمیزے سے بنا ہے۔ جنت کا نقشہ کچھ یوں کھینچا جاتا ہے کہ اس میں 'مروارید کے دروازے' 'سونے کی سڑکیں' 'بیسیوں ملائکہ' ہوں گے۔ علی ہذالقیاس۔ اور ابھی تک ہم نے ہر چیز کو اس کے مفرد عناصر میں منقسم نہیں کیا کیونکہ مروارید کے دروازے، سونے کی سڑکیں اور ملائکہ سب کے سب فی نفسہ مرکب تصورات ہیں۔ صرف تب جب ہم سمجھ لیتے ہیں کہ جنت کے متعلق ہمارا تصور 'مروارید' 'دروازے' 'سڑک' 'سونا' 'سفید لباس میں ملبوس شکل' اور 'پر' جیسے مفرد تصورات پر مشتمل ہے، ہم اپنے آپ سے پوچھ سکتے ہیں: کیا کبھی واقعی ہمارا ان 'سادہ تاثرات' سے واسطہ پڑا تھا؟"

"پڑتا تو ہے۔ لیکن ہم ان تمام 'سادہ تاثرات' کے تراشے کاٹ لیتے ہیں اور انہیں دماغ کی کاپی پر جوڑ کر واحد خیال کی شکل دے دیتے ہیں۔"

"ہاں، ہم بالکل یہی کرتے ہیں۔ کیونکہ جب ہم انسان ذہن میں کسی چیز کا نقشہ بناتے ہیں، ہمارا دھیان فوراً قینچی اور لئی کی طرف چلا جاتا ہے۔ لیکن ہیوم زور دے کر کہتا ہے کہ ہم خیالات / تصورات میں جن عناصر کو یکجا کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی وقت لازماً ہمارے دماغ میں 'سادہ تاثرات' کی شکل میں داخل ہوئے ہوں گے۔ وہ شخص، جس نے کبھی سونا نہیں دیکھا، اپنے ذہن میں سونے کی سڑکوں کا نقشہ نہیں بنا پائے گا۔"

"بڑا استاد آدمی معلوم ہوتا ہے۔ دیکارت نے خدا کا جو واضح اور بین تصور پیش کیا تھا، اس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"ہیوم کے پاس اس کا بھی جواب تھا۔ چلو، ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک خدا کا تصور یہ ہے کہ وہ 'غیر محدود طور پر ذکی' باحکمت اور احسن ہستی' ہے۔ یوں ہمارے ذہن میں کسی غیر محدود طور پر ذکی چیز، کسی غیر محدود طور پر باحکمت چیز اور کسی غیر محدود طور پر احسن چیز کا 'مرکب خیال' سما جاتا ہے۔ اگر ہم ذکاوت، حکمت اور اچھائی سے کبھی آشنا نہ ہوتے، ہمارے ذہن میں اس قسم کے خدا کا تصور کبھی نہ آتا۔ ہمارے ذہن میں خدا کا یہ تصور بھی ہو سکتا ہے کہ وہ 'سخت گیر لیکن انصاف پسند باپ' ہے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا یہ تصور 'سخت گیری' 'انصاف پسندی' اور 'باپ' پر

مشتمل ہے ۔ ہیوم کے بعد مذہب کے متعدد نقادوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصورات کا رشتہ ان تجربات کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے جو ابتدائی عمر میں ہمیں اپنے باپ کے متعلق ہوتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ باپ کے تصور ہی سے ' آسمانی باپ ' کا تصور ذہنوں میں آیا۔"

"ممکن ہے کہ یہ درست ہو ، لیکن میں نے یہ بات کبھی تسلیم نہیں کی ہے کہ خدا کا مرد ہونا لازمی ہے ۔ کبھی کبھی میری امی حساب برابر کرنے کے لیے God (خدا) کو 'Godiva' (2) کہہ دیتی ہے ۔"

"بہرحال ہیوم ایسے تمام خیالات و افکار کا مخالف تھا جن کا متماثل حسی ادراکات (sense perceptions) میں نہ ڈھونڈا جاسکے ۔ وہ کہتا تھا کہ ' میں ان بے معنی لغویات کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دینا چاہتا ہوں جو اتنے لمبے عرصے سے مابعد الطبیعیاتی فکر پر چھائی رہی ہیں اور جنہوں نے اسے بدنامی کے کنوئیں میں دھکیل دیا ہے ۔'

"لیکن ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی مرکب خیالات استعمال کرتے رہتے ہیں اور ذرا نہیں سوچتے کہ وہ صحیح ہیں بھی یا نہیں ۔مثلاً ' میں ' ــــــ یا انا (ego) ــــــ کا سوال لیں ۔ دیکارت کے فلسفے کی تو بنیاد ہی یہ ' میں ' تھا ۔یہی وہ واضح اور بین ادراک تھا جس پر اس کے سارے فلسفے (کی عمارت) تعمیر ہوئی تھی ۔"

"مجھے امید ہے کہ ہیوم نے اس بات سے انکار کرنے کی کوشش نہیں کی ہو گی کہ میں میں ہوں ۔ اگر اس نے کی تھی ، پھر وہ بلاسوچے سمجھے بات کر رہا ہو گا ۔"

"سوفی ، اگر میں اس نصاب کے ذریعے تمہیں کوئی بات سکھانا چاہتا ہوں تو وہ یہ ہے کہ تم نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا کرو ۔"

"میں معذرت خواہ ہوں ۔ آپ اپنی بات جاری رکھیں ۔"

"نہیں ۔ تم ہیوم کا طریقہ کیوں استعمال نہیں کرتیں اور جسے تم اپنی انا سمجھتی ہو ، اس کا تجزیہ کیوں نہیں کرتیں ؟"

"پہلے تو میں یہ دریافت کرنا چاہوں گی کہ انا مفرد یا مرکب تصور ہے ؟"

"اور تم کس نتیجے پر پہنچی ہو ؟"

"مجھے واقعی تسلیم کرنا ہوگا کہ میں اپنے آپ کو بالکل مرکب محسوس کرتی ہوں ۔ ایک بات تو یہ ہے کہ میں بہت جلد طیش میں آجاتی ہوں ۔ پھر مجھے مختلف چیزوں کے بارے میں کسی فیصلے پر پہنچنے میں دشواری پیش آتی ہے ۔ اور مزید بات یہ ہے کہ

میں جن لوگوں کو پسند کرتی ہوں، انہیں ناپسند بھی کرنے لگتی ہوں۔"

"دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ 'انا کا تصور' 'مرکب خیال' ہے۔"

"بہت اچھا۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ اب مجھے یہ حساب کتاب لگانا ہے کہ آیا میرے ذہن میں اپنی انا کا کوئی ماثل 'مرکب تاثر' ہے۔ اور میرا قیاس ہے کہ ہے۔ درحقیقت یہ ہمیشہ میرے ذہن میں موجود رہا ہے۔"

"اس سے تمہیں کوئی پریشانی ہوتی ہے؟"

"میرا مزاج اکثر بدلتا رہتا ہے۔ آج میں وہ نہیں جو میں تب تھی جب میری عمر چار سال تھی۔ میرا مزاج اور میرا اپنے آپ کو دیکھنے کا انداز لحظہ بہ لحظہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مجھے اچانک محسوس ہو سکتا ہے جیسے میں بالکل ہی 'نئی شخصیت' ہوں۔"

"چنانچہ اگر تمہیں یہ محسوس ہو کہ تمہاری انا ناقابل تبدیل ہے تو تمہارا ادراک کاذب ہوگا۔ درحقیقت انا کا ادراک سادہ تاثرات کی لمبی زنجیر ہے جن کا تمہیں کبھی بیک وقت تجربہ نہیں ہوا ہوتا۔ ہیوم کے الفاظ میں یہ مختلف ادراکات کی پونجی یا ذخیرے کے ماسوا اور کچھ نہیں جو ناقابل تصور تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے وارد ہوتے رہتے ہیں، دائمی طور پر تبدیل اور حرکت پذیر ہوتے رہتے ہیں'۔ ذہن 'ایک قسم کا تھیٹر ہے جہاں متعدد ادراک یکے بعد دیگرے اپنی رونمائی کراتے ہیں، آتے ہیں، گزرتے ہیں، پھر گزرتے ہیں، پھسل کر دور ہو جاتے ہیں اور کیفیتوں اور صورت ہائے حالات کے غیر محدود تنوع میں گھل مل جاتے ہیں'۔ ہیوم نے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ ان ادراکات اور احساسات کے 'جو آتے جاتے رہتے ہیں' نیچے یا پیچھے ہماری کوئی ڈھکی چھپی 'شناخت' موجود نہیں ہوتی۔ وہ مووی سکرین کی شبیہوں کی مانند ہوتے ہیں جو اتنی تیزی سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں کہ ہمیں یہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ انفرادی (single) تصویروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ درحقیقت تصویریں منسلک نہیں ہوتیں، وہ گزرتی اتنی تیزی سے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ فلم انفرادی تصاویر کا مجموعہ ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں ہار مان لیتی ہوں۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم ناقابل تبدیل انا کے تصور سے دست بردار ہو گئی ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ ہاں۔"

"ایک منٹ پہلے تمہاری رائے اس کے متضاد تھی۔ میں یہاں مزید بتاتا چلوں

کہ ہیوم نے انسانی ذہن کا جو تجزیہ کیا ہے اور اس نے ناقابل تبدیل انا کے تصور کو جس طرح ٹھکرایا ہے ' وہ اڑھائی ہزار سال پیشتر دنیا کے دوسرے کونے میں پیش کیا جاچکا تھا۔"

"کس نے؟"

"بدھ نے ۔ یہ بات تقریباً عجیب و غریب اور پراسرار بلکہ مافوق الفطرت معلوم ہوتی ہے کہ دونوں نے اپنے اپنے خیالات کو یکساں طریق سے مرتب کیا۔ بدھ زندگی کو ذہنی اور جسمانی عمل کاریوں (processes) کا غیر شکستہ ترتیب وار سلسلہ تصور کرتے تھے جو لوگوں کو مسلسل تبدیلی و تغیر کی حالت میں رکھتا ہے ۔شیرخوار بچہ وہ نہیں ہوتا جو وہ بلوغت کے عالم میں بنتا ہے ۔میں آج وہ نہیں جو میں کل تھا۔ بدھ کا قول ہے : کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جس کے متعلق میں یہ کہہ سکوں کہ ' یہ میری ہے ' ' اور نہ کوئی ایسی چیز ہے جس کے متعلق میں دعویٰ کرسکوں کہ ' یہ میں ہوں ۔ ' چنانچہ نہ کوئی 'میں' ہے اور نہ کوئی ناقابل تبدیل انا۔"

"یہ تو ہیوم کا مخصوص انداز ہے ۔"

"ناقابل تبدیل انا کے تصور پر گفتگو جاری رکھتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ بہت سے عقلیت پسندوں نے بلاتحقیق اور بلاثبوت یہ بات صحیح تسلیم کرلی تھی کہ انسان غیر فانی روح کا مالک ہے ۔"

"کیا یہ بھی کاذب ادراک ہے؟"

"بدھ اور ہیوم کے مطابق ہاں ۔ تمہیں معلوم ہے کہ بدھ نے اپنے انتقال سے قبل اپنے چیلوں سے کیا کہا تھا؟"

نہیں ۔ مجھے کیسے معلوم ہوسکتا تھا؟"

" ' بوسیدگی ہر مرکب چیز کی سرشت میں شامل ہے ۔ محنت سے اپنی مکتی کا سامان ڈھونڈو ۔ ' ہیوم بھی یہی بات کہہ سکتا تھا ۔ پھر ہیوم ہی کیوں ' دیموکری توس بھی تو اسی زمرے میں آتا ہے ۔ بہرحال ہم اتنا جانتے ہیں کہ ہیوم نے روح کی لافناپذیری یا خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی ہر کوشش مسترد کردی تھی ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے ان دونوں کی یا کسی ایک کی موجودگی سے انکار تھا مگر وہ سمجھتا تھا کہ مذہبی عقیدے کو عقل سے ثابت کرنا عقلیت پسندوں کی بک بک ہے ۔ ہیوم عیسائی نہیں تھا اور نہ وہ پکا دہریہ تھا۔ اسے ہم لاادری (agnostic) کہہ سکتے ہیں۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"لاادری وہ شخص ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ نہ تو خدا یا کسی دیوتا کا وجود ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ان کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ جب ہیوم بستر مرگ پر دراز تھا ' ایک دوست نے اس سے سوال کیا: ' آپ حیات بعد ازممات پر یقین رکھتے ہیں؟ ' کہا جاتا ہے کہ اس نے جواب دیا:

" ' یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوئلے کی ڈلی کو آگ پر رکھ دیا جائے اور اسے آگ نہ لگے۔' "

"میں سمجھی۔"

"یہ جواب اس کی غیر مشروط بے تعصبی اور فراخی ذہن کا آئینہ دار ہے۔ وہ صرف وہی بات تسلیم کرتا تھا جس کا ادراک اسے اپنے حواس کے ذریعے ہوتا تھا۔ باقی تمام امکانات کے سلسلے میں وہ اپنا ذہن کھلا رکھتا تھا۔ اس نے نہ عیسائیت پر اور نہ معجزوں پر ایمان کو مسترد کیا تھا۔ لیکن ان دونوں معاملوں کا تعلق عقیدے سے ہے، علم یا عقل سے نہیں۔ تم کہہ سکتی ہو کہ ہیوم کے فلسفے کے ساتھ علم اور ایمان کے مابین آخری رشتہ منقطع ہو گیا۔"

"آپ کہتے ہیں کہ اس نے یہ انکار نہیں کیا تھا کہ معجزے رونما ہو سکتے ہیں؟"

"اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ انہیں مانتا تھا بلکہ معاملہ اس کے برعکس زیادہ تھا۔ وہ اس حقیقت پر خاص طور پر زور دیتا تھا کہ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لوگوں کو اس چیز کی، جسے ہم آج کل ' مافوق الفطرت ' وقوعے قرار دیں گے ' زبردست ضرورت ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ جن معجزوں کے بارے میں تم پڑھتی یا سنتی ہو ' وہ یا تو کہیں بہت دور دراز مقامات پر ظہور پذیر ہوتے ہیں یا پھر انہیں وقوع پذیر ہوئے مدتیں بیت چکی ہیں۔ درحقیقت ہیوم نے معجزوں کو محض اس لیے درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا کیونکہ خود اسے ان کا کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اسے یہ تجربہ بھی تو نہیں ہوا تھا کہ یہ رونما ہو ہی نہیں سکتے۔"

"آپ کو اس کی وضاحت کرنا ہو گی۔"

"ہیوم کے مطابق معجزہ قوانین فطرت کے خلاف چیز ہے۔ مگر یہ دعویٰ کرنا بے معنی بات ہے کہ ہمیں قوانین فطرت کا کوئی تجربہ ہوا ہے۔ ہم تجربے سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم کسی پتھر کو ہاتھ سے چھوڑ دیں ' تو یہ زمین پر گر پڑے گا اور اگر

یہ نہیں گرتا ـــــ خیر، پھر سمجھو کہ ہمیں اس کے نہ گرنے کا تجربہ ہو گیا۔"

"میں کہوں گی کہ اگر یہ نہیں گرتا، تو پھر یہ معجزہ ـــــ یا کوئی مافوق الفطرت چیز ـــــ ہو گا۔"

"تو تمہارا یہ اعتقاد ہے کہ فطرتیں دو ہیں ـــــ ایک 'فطری' اور دوسری 'مافوق الفطرتی'۔ یہاں تم ایک بار پھر عقلیتی جال میں پھنس گئی ہو۔"

"ممکن ہے کہ آپ درست کہتے ہوں لیکن میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ میں جب بھی پتھر ہاتھ سے چھوڑوں گی، یہ لازماً زمین پر گر پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"اب آپ بڑی زیادتی کر رہے ہیں۔"

"سوفی، میں نہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کر رہا ہوں اور نہ تمہارے جذبات کو کوئی ٹھیس پہنچا رہا ہوں۔ فلسفی جب بھی کوئی سوال پوچھتا ہے وہ کسی غلطی یا زیادتی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ شاید اس مقام پر ہم نے ہیوم کی فکر کے بنیادی یا اصلی نکتے کی طرف قدم بڑھا دیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم کیسے یقین سے کہہ سکتی ہو کہ پتھر ہمیشہ زمین پر گرے گا؟"

"میں اسے اتنی مرتبہ وقوع پذیر ہوتے دیکھ چکی ہوں کہ مجھے اس کا پختہ یقین ہو گیا ہے۔"

ہیوم کہے گا کہ تمہیں پتھر کے کئی مرتبہ زمین پر گرنے کا تجربہ ہوا ہے لیکن تمہیں یہ تجربہ کبھی نہیں ہوا کہ یہ ہمیشہ ہی زمین پر گرتا رہے گا۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ پتھر جو زمین پر گرتا ہے، تو اس کا سبب کشش ثقل کا قانون ہے۔ لیکن ہمیں اس قانون کا کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ ہمیں صرف یہ تجربہ ہوا کہ اشیا (نیچے) گرتی ہیں۔"

"کیا یہ ایک ہی بات نہیں؟"

"پوری طرح نہیں۔ تم کہتی ہو کہ تمہارا یہ ایقان ہے کہ پتھر زمین پر گرے گا کیونکہ تم کئی مرتبہ اسے وقوع پذیر ہوتے دیکھ چکی ہو۔ بالکل یہی ہیوم کا نکتہ ہے۔ تم ایک چیز کے بعد کسی دوسری چیز کے رونما ہونے کے عمل کی اتنی عادی ہو چکی ہو کہ تم یہ توقع باندھنے لگی ہو کہ جونہی تم ہاتھ سے پتھر چھوڑو گی، بار بار وہی عمل دہرایا جائے گا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے اس چیز کا، جسے ہم 'فطرت کے ناقابل شکست قوانین' کہتے ہیں، تصور پیدا ہوتا ہے۔"

"کیا اس کا واقعی یہ مطلب تھا کہ عین ممکن ہے پتھر زمین پر نہ گرے؟"

"غالباً تمہاری طرح اسے بھی یہ یقین تھا کہ جب وہ اس نوعیت کا تجربہ کرنے کی کوشش کرے گا، پتھر لا محالہ زمین پر ہی گرے گا۔ لیکن اس نے توجہ اس بات کی طرف دلائی تھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، اس کا اسے کوئی تجربہ نہیں ہوا۔"

"بات کا آغاز دودھ پیتے بچوں اور پھولوں سے ہوا تھا، یہ ہم کہاں پہنچ گئے ہیں؟"

"نہیں، ہم اپنے موضوع سے بھٹکے نہیں۔ تم اگر چاہو تو ہیوم کے دعووں کی تصدیق و توثیق کے لیے بچوں کا سہارا لے سکتی ہو، تمہیں اس کی پوری اجازت ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ اگر کوئی پتھر ایک دو گھنٹے زمین کے اوپر پیرتا رہے، حیرت کسے زیادہ ہو گی ــــ تمہیں یا ایک سالہ بچے کو؟"

"میرا قیاس ہے کہ مجھے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ بچے کی نسبت مجھے زیادہ بہتر طور پر معلوم ہو گا کہ یہ واقعہ کتنا خلاف فطرت ہے۔"

"اور بچہ اسے خلاف فطرت کیوں نہیں سمجھے گا؟"

"کیونکہ ابھی اس نے سیکھا ہی نہیں ہوتا کہ فطرت کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔"

"یا شاید تم یہ کہہ سکتی ہو کہ ابھی فطرت اس کی عادت نہیں بنی۔"

"میں سمجھ گئی کہ آپ کہاں سے نکتے نکال رہے ہیں۔ ہیوم چاہتا تھا کہ لوگ اپنی آگہی کو جلا دیں۔"

"چنانچہ اب تم یہ مشق (exercise) کرنے کی کوشش کرو: آؤ، ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تم اور کوئی نو عمر بچہ جادو کا مظاہرہ دیکھنے چلے جاتے ہو جہاں اشیا کو فضا میں اڑتے یا تیرتے دکھایا جاتا ہے۔ اس تماشے سے کون زیادہ محظوظ ہو گا ــــ تم یا بچہ؟"

"غالباً میں۔"

"ایسا کیوں کر ہو گا؟"

"کیونکہ مجھے معلوم ہو گا کہ یہ سب کچھ کتنا ناممکن ہے۔"

"چنانچہ . . . بات یہ بنی جب تک بچہ یہ سیکھ نہیں لیتا کہ قوانین فطرت کیا ہیں،

وہ ان کی طاقت ورزی پہ محظوظ نہیں ہو سکتا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ یہ صحیح ہے۔"

"اور ہم ابھی ہیوم کے تجربے پہ مبنی فلسفے کے اہم ترین نکتے سے دوچار ہیں۔ وہ تمہاری بات میں یہ اضافہ کر دیتا کہ ہمیں ان توقعات کی عادت پڑ جاتی ہے، بچہ ابھی تک ان کا غلام نہیں بنا ہوتا۔ یوں وہ ہم دونوں کی نسبت زیادہ کھلے ذہن کا مالک ہے۔ میں تو یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ بچہ کہیں زیادہ بڑا فلسفی تو نہیں؛ جب وہ پیدا ہوتا ہے اس کے ذہن میں پہلے سے گھڑے گھڑائے تصورات بالکل نہیں ہوتے۔ اور یہی، مائی ڈیئر سوفی، فلسفی کا انتہائی امتیازی وصف ہے۔ دنیا جیسی کیسی ہے، بچہ اس کا اسی حیثیت سے ادراک کرتا ہے، اسے جو تجربہ ہوتا ہے وہ اس میں مزید کوئی اضافہ نہیں کرتا۔"

"مجھے جب بھی احساس ہوتا ہے کہ میں تعصب سے کام لے رہی ہوں، میری طبیعت منقبض ہونے لگتی ہے۔"

"ہیوم جب عادت کی قوت کا ذکر کرتا ہے، وہ اپنی توجہ 'قانون علت و معلول' پہ مرکوز کر دیتا ہے۔ یہ قانون طے کرتا ہے کہ جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے، اس کی لازماً کوئی نہ کوئی علت یا سبب ہوگا۔ ہیوم نے اپنی مثال کے لیے بلیئرڈ کے دو بال (گولیاں) استعمال کئے۔ اگر تم بلیرڈ کے سیاہ بال کو سفید بال کی طرف، جو ساکن ہے، لڑھکاؤ، تب سفید بال کیا کرے گا؟"

"اگر سیاہ بال سفید بال کے ساتھ ٹکراتا ہے، سفید بال متحرک ہو جائے گا۔"

"بجا۔ لیکن یہ متحرک کیوں ہوگا؟"

"کیونکہ اس کے ساتھ سیاہ بال ٹکرایا تھا۔"

"چنانچہ ہم عام طور پہ یہ کہتے ہیں کہ سیاہ بال کی ٹکر سفید بال کے تحرک کی علت ہے۔ لیکن اب یاد رکھو کہ ہم صرف ان چیزوں کا ذکر کر سکتے ہیں جن کا ہمیں فی الواقع تجربہ ہوا ہوتا ہے۔"

"مجھے فی الحقیقت اس کا متعدد بار تجربہ ہو چکا ہے۔ جوآنا کے گھر تہہ خانے میں بلیئرڈ کی میز ہے۔"

"ہیوم کہے گا کہ واحد چیز جس کا تمہیں تجربہ ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ سفید بال میز پہ لڑھکنے لگا ہے۔ یہ میز پہ کیوں لڑھکنے لگا، تمہیں اس کے اصل سبب کا کوئی تجربہ

نہیں ہوا۔ تمہیں اتنا تجربہ ہوا ہے کہ ایک واقعے کے بعد دوسرا واقعہ رونما ہوتا ہے، لیکن تمہیں یہ تجربہ نہیں ہوا کہ دوسرا واقعہ کس سبب رونما ہوا ہے۔"

"یہ بال کی کھال ادھیڑنے کے مترادف نہیں؟"

"نہیں - یہ بالکل مرکزی نکتہ ہے - ہیوم نے زور دے کر کہا تھا کہ یہ توقع کہ ایک چیز کے بعد دوسری چیز وقوع پذیر ہوگی، خود اشیا کے اندر نہیں ہوتی بلکہ یہ ہمارے دماغ میں ہوتی ہے - اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ توقع عادت کے ساتھ منسلک ہوتی ہے۔ہم ایک بار پھر بچے کا معاملہ لیتے ہیں ۔جب بلیئرڈ کا ایک بال دوسرے بال کے ساتھ ٹکرایا تھا، اگر دونوں بال بالکل ساکن رہتے، بچہ ہکا بکا ہوکر نہ دیکھتا ۔جب ہم 'قوانین فطرت' یا 'علت و معلول' کا ذکر کرتے ہیں، ہم دراصل کہہ یہ رہے ہوتے ہیں کہ ہماری توقع کیا ہے، نہ کہ یہ کہ 'معقول' کیا ہے ۔ قوانین فطرت نہ معقول ہوتے ہیں اور نہ غیر معقول، وہ محض قوانین ہوتے ہیں - چنانچہ یہ توقع کہ جب بلیئرڈ کا سیاہ بال سفید بال سے ٹکرائے گا، سفید بال متحرک ہوجائے گا، خلقی نہیں ۔ہم یہ توقعات لے کر پیدا نہیں ہوتے کہ دنیا کس قسم کی ہوگی یا یہ کہ اس میں مختلف اشیا کیا رویہ اختیار کریں گی - دنیا بالکل ویسی ہوتی ہے جیسی کہ وہ ہے، اور یہی وہ بات ہے جو ہم سیکھتے ہیں۔"

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ہم دوبارہ پٹڑی سے اترنے لگے ہیں۔"

"اگر ہماری توقعات ہمارے جلد بازی سے نتائج تک پہنچنے کا سبب بن رہی ہوں، پھر نہیں - ہیوم ناقابل شکست 'قوانین فطرت' کی موجودگی سے انکار نہیں کرتا تھا لیکن اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ چونکہ ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ ہم خود 'قوانین فطرت' کا تجربہ (experience) حاصل کر سکیں، ہم آسانی سے غلط نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔"

"کس قسم کے؟"

"خیر، چونکہ میں نے سیاہ گھوڑوں کا پورا لشکر دیکھا ہے، اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ سارے گھوڑے سیاہ ہوتے ہیں۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"اور اگرچہ میں نے اپنی پوری زندگی میں سیاہ کووؤں کے ماسوا کبھی کسی دوسرے رنگ کا کوا نہیں دیکھا، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ سفید کوے کے نام کی مخلوق بالکل ہی ناپید ہے - لیکن آدمی فلسفی ہو یا سائنس دان، دونوں صورتوں میں اس کے لیے لازم ہے کہ وہ سفید کوا دریافت کرنے کا امکان قطعاً مسترد نہ کرے ۔تم تقریباً

یہ کہہ سکتی ہو کہ 'سفید کوے' کی سر توڑ تلاش سائنس کا اہم فریضہ ہے۔"

"جی ہاں۔ میں سمجھ گئی ہوں۔"

"جہاں تک علت اور معلول کے مسئلے کا تعلق ہے ' ایسے بے شمار لوگ موجود ہو سکتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ (بادل کی) کڑک کی علت (بجلی کی) چمک ہے کیونکہ کڑک چمک کے بعد آتی ہے۔ بلیئرڈ کے بالوں کی جو مثال دی گئی تھی ' درحقیقت یہ مثال اس سے کوئی خاص مختلف نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے: کیا کڑک کی علت چمک ہے ؟"

"حقیقتاً نہیں ' کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ کڑک اور چمک بیک وقت رونما ہوتی ہیں۔"

"کڑک اور چمک دونوں برقی ڈسچارج کے سبب رونما ہوتی ہیں۔ چنانچہ درحقیقت ان دونوں کی علت کوئی تیسرا عنصر ہے۔"

"ٹھیک۔"

"ہماری اپنی صدی کے ایک برطانوی تجربیت پسند برٹرینڈ رسل (Russell) نے ایک مضحک مثال پیش کی ہے۔ ایک چوزے کو روزانہ یہ تجربہ ہوتا ہے کہ اسے ہر روز تب خوراک ملتی ہے جب کسان کی بیوی مرغی خانے میں اس کے قریب آتی ہے۔ جب وہ اس معاملے پر غور کرتا ہے ' وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کسان کی بیوی کی آمد اور اس کے پیالے میں خوراک رکھے جانے کے فعل کے مابین کوئی نہ کوئی علتی تعلق ہے۔"

"لیکن جب کسی روز چوزے کو اپنی خوراک نہیں ملتی ' پھر ؟"

"نہیں ' بات یہ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کسان کی بیوی آتی تو ہے لیکن وہ چوزے کو خوراک نہیں کھلاتی ' وہ بس اس کی گردن مروڑ دیتی ہے۔"

"اخوں ' کیا کریہہ بات ہے !"

"اس حقیقت کا کہ ایک چیز دوسری چیز کے بعد رونما ہوتی ہے ' لازماً یہ مطلب نہیں نکلتا کہ دونوں کے مابین کوئی علتی تعلق ہوتا ہے۔ فلسفے کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کسی طرح لوگوں کو جلد بازی سے نتائج اخذ کرنے کے خلاف متنبہ کیا جائے۔ جلد بازی سے نتائج اخذ کرنے سے توہم کی مختلف صورتیں جنم لیتی رہتی ہیں۔"

"کیسے ؟"

"تم کسی کالی بلی کو سڑک پار کرتے دیکھتی ہو۔ اس روز بعد ازاں تم ٹھوکر

کھاتی ہو اور اپنا بازو تڑوا بیٹھتی ہو ۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان دونوں (واقعوں) کے مابین کوئی علتی تعلق ہے ۔ سائنس میں یہ بات خاص طور پر اہم ہے کہ نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی نہ دکھائی جائے ۔ مثلاً بے شمار لوگ کوئی خاص دوا استعمال کرنے کے بعد صحت یاب ہو جاتے ہیں ۔ یہ اپنی جگہ حقیقت سہی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ صحت یاب وہ دوا کی وجہ سے ہوئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ مریضوں کی خاصی بڑی تعداد پر تجربہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے ۔ کچھ لوگوں کو دوا دی جاتی ہے اور کچھ کو محض آٹے اور پانی پر ٹرخا دیا جاتا ہے لیکن سمجھتے وہ بھی یہی ہیں کہ انہیں بھی دوا دی جا رہی ہے ۔ اگر یہ مریض بھی صحت یاب ہو جاتے ہیں، تو اس میں دوا کا کوئی دخل نہیں ہوگا، بلکہ کوئی تیسرا عنصر کارفرما ہوگا ـــــ مثلاً یہ عقیدہ کہ دوا نے اپنا اثر دکھایا ہے اور وہ صحت یاب ہو گئے ہیں ۔"

"میرا خیال ہے کہ میری سمجھ میں آنے لگا ہے کہ تجربیت کیا ہوتی ہے ۔"

"ہیوم نے اخلاقیات کے شعبے میں بھی عقلیت پسندانہ فکر کے خلاف بغاوت کی تھی ۔ عقلیت پسندوں کی ہمیشہ یہ رائے رہی تھی کہ غلط اور صحیح کے مابین امتیاز کرنے کی صلاحیت انسان میں خلقی طور پر موجود ہوتی ہے ۔ سقراط سے لوک تک کتنے ہی فلسفی ہیں جن کے ہاں ہمیں اس نام نہاد فطری صحت سے واسطہ پڑا ہے ۔ لیکن ہیوم کے خیال کے مطابق ہم جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں، اس کا فیصلہ عقل نہیں کرتی ۔"

"پھر کون کرتا ہے؟"

"اس میں ہمارے جذبات (sentiments) کا دخل ہوتا ہے ۔ اگر تم کسی ضرورت مند کی مدد کا فیصلہ کرتی ہو، اس کا سبب تمہارے احساسات ہوتے ہیں، تمہاری عقل نہیں ۔"

"اگر مجھے مدد کرنے پر مجبور نہ کیا جا سکے، پھر؟"

"یہ بھی احساسات کا معاملہ ہوگا ۔ کسی کی مدد کرنا یا نہ کرنا معقولیت کے دائرے میں آتا ہے نہ غیر معقولیت کے لیکن اس سے بے مہری کا ضرور اظہار ہو سکتا ہے ۔"

"لیکن کہیں نہ کہیں تو حد لازماً ہونا چاہیے ۔ ہر شخص جانتا ھے کہ کسی کو ہلاک کرنا غلط ہے ۔"

"ہیوم کے مطابق ہر شخص میں دوسروں کی بھلائی کا جذبہ ہوتا ہے ۔ چنانچہ ہم

سب میں ترس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا عقل سے کوئی تعلق نہیں۔"

"پتا نہیں میں اس سے متفق ہوں یا نہیں۔"

"سوفی، کسی دوسرے شخص سے چھٹکارا حاصل کرنا ہمیشہ ہی غیر عقل مندانہ فعل نہیں ہوتا۔ اگر تم اپنا کوئی مقصد کرنا چاہتی ہو تو یہ اچھا خیال ثابت ہو سکتا ہے۔"

"ہائیں، ایک منٹ ٹھہریں۔ میں احتجاج کرتی ہوں۔"

"اچھا، ذرا یہ تو سمجھاؤ کہ آخر کسی موذی کو کیوں ہلاک نہ کیا جائے؟"

"وہ شخص بھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ آپ کو اسے ہلاک نہیں کرنا چاہیے۔"

"کیا یہ کوئی منطقی وجہ ہے؟"

"پتا نہیں۔"

"تم نے کیا یہ کہ پہلے بیانیہ جملہ (descriptive sentence) ____ 'وہ شخص بھی زندہ رہنا چاہتا ہے' ____ استعمال کیا۔ پھر اس سے نتیجہ اخذ کیا ____ 'چنانچہ آپ کو اسے ہلاک نہیں کرنا چاہیے' ____ اور یوں اسے اس میں جسے ہم معیار بند جملہ (3) (normative sentence) کہتے ہیں، تبدیل کر دیا۔ عقل کے نقطہ نظر سے یہ بے معنی اور لغو بات ہے۔ تم یہ بھی کہہ سکتی ہو،' چونکہ بے شمار لوگ ٹیکسوں کی ادائیگی میں ہیرا پھیری کرتے ہیں، اس لیے مجھے بھی اپنے ٹیکسوں کی ادائیگی میں ہیرا پھیری کرنا چاہیے۔' ہیوم کہتا تھا کہ آدمی ھے (is) کے جملوں سے کبھی نتائج اخذ نہیں کرسکتا اور انہیں چاھیے (ought) کے جملوں میں تبدیل نہیں کرسکتا۔ تاہم یہ حرکت عام کی جاتی ہے اور اس معاملے میں اخباری مضامین، سیاسی جماعتوں کے پروگرام اور تقریریں تو اس کی واضح مثالیں پیش کرتی ہیں۔ چند مثالیں سننا پسند کرو گی؟"

"ضرور۔ مہربانی ہو گی۔"

"' جو لوگ ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کرنا چاہتے ہیں ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ مزید ہوائی اڈے تعمیر کئے جانا چاہئیں'۔"

"تمہارے خیال میں یہ نتیجہ صحیح ہے؟"

"نہیں۔ بالکل لغو ہے۔ (نئے ہوائی اڈے تعمیر کرنے سے پہلے) ہمیں ماحول کے بارے میں سوچنا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ہوائی اڈوں کی بجائے مزید ریل کی پٹڑیاں بچھانا چاہئیں۔"

"یا وہ کہتے ہیں : 'تیل کے نئے کنوؤں کی تعمیر و ترقی سے آبادی کا معیار حیات دس فیصد بلند ہوجائے گا - چنانچہ ہمیں حتی الامکان جلد از جلد نئے کنوئیں دریافت اور تعمیر کرنا چاہئیں -' "

"بالکل نہیں - ہمیں ایک بار پھر ماحول کے بارے میں سوچنا ہوگا - اور ناروے میں ویسے بھی معیار زندگی کافی اونچا ہے - "

"بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے : 'سینیٹ اس قانون کو منظور کرچکی ہے' اس لیے ملک کے تمام شہریوں کو اس کی پابندی کرنا چاہیے - ' لیکن اکثر ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کی روایات پر عمل کرنا لوگوں کے پختہ عقاید کے خلاف ہوتا ہے - "

"ہاں - میں یہ مشکل سمجھتی ہوں - "

"چنانچہ ہم نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ہمیں کس قسم کا طرز عمل اپنانا چاہیے - اس کے لیے عقل کو معیار نہیں بنایا جاسکتا - ذمے دارانہ طرز عمل اختیار کرنا اپنی عقل کو مضبوط بنانے کا معاملہ نہیں بلکہ دوسروں کی بھلائی کی خاطر اپنے جذبات میں گہرائی پیدا کرنا ہے - 'دنیا جائے بھاڑ میں لیکن میری چھنگلیا پر خراش نہ آئے' ہیوم کے خیال میں یہ رویہ خلاف عقل نہیں - "

"یہ تو رونگٹے کھڑے کردینے والا دعوٰی ہے - "

"لیکن اگر تمہیں تاش کے پتے پھینٹنا پڑیں تو تمہارے شاید اس سے بھی زیادہ رونگٹے کھڑے ہوجائیں لیکن اس کے ساتھ تمہیں ایک خاص قسم کا لطف بھی محسوس ہوگا - تمہیں معلوم ہے کہ نازیوں نے لاکھوں یہودیوں کو قتل کردیا تھا - کیا تم یہ کہو گی کہ نازیوں کی عقل میں کوئی خرابی تھی، یا یہ کہ ان کی جذباتی زندگی میں کوئی گڑبڑ تھی؟ "

"صاف ظاہر ہے کہ خرابی ان کے جذبات میں تھی - "

"ان میں سے بہت سے بے حد سمجھ دار تھے اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں - اکثر سنگ دلانہ فیصلوں کے پیچھے سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا پایا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں - جنگ کے بعد بے شمار نازیوں پر مقدمے چلائے گئے ' انہیں خطا وار ٹھہرایا گیا اور انہیں سزائیں دی گئیں لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی یہ الزام نہیں لگایا گیا کہ اس کا طرز عمل 'غیر معقول' یا 'خلاف عقل' (unreasonable) تھا - وہ اس لیے سزا کے مستحق قرار دئے گئے کیونکہ وہ بڑے لرزہ خیز اور ہولناک قتلوں کے

مرتکب ہوئے تھے ۔ اور یہ تو ہوتا رہتا ہے کہ جو لوگ صحیح الدماغ نہ ہوں ' وہ قتل کے الزام سے بری ہوجاتے ہیں ۔ (ان کے متعلق) ہم کہتے ہیں کہ ' وہ اپنے افعال کے لیے جواب دہ نہیں ۔ ' کسی شخص کو کبھی کسی ایسے جرم کا ارتکاب کرنے پر بری نہیں کیا گیا جو اس نے غیر جذباتی کیفیت میں کیا ہو ۔ "

"مجھے امید ہے کہ ایسا نہیں ہوتا ہو گا ۔ "

"لیکن ہمیں محض مضحک اور بھیانک مثالوں کے ساتھ ہی چمٹے نہیں رہنا چاہیے ۔ اگر کہیں سیلاب آجائے اور لاکھوں لوگ بے گھر ہوجائیں تو یہ ہمارے جذبات ہوتے ہیں جو یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمیں ان کی مدد کرنا چاہیے یا نہیں ۔ اگر ہمارے دلوں میں ہمدردی اور رحم نام کی کوئی چیز نہیں اور ہم سارا معاملہ ' سرد مہر عقل ' کے سپرد کردیں تو ہم شاید اس نتیجے پر پہنچیں کہ ان لاکھوں کا مرجانا ہی بہتر ہے کیونکہ کثرت آبادی پہلے ہی دنیا کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے ۔ "

"جب آپ اس قسم کی بات سوچتے بھی ہیں ' میرا خون کھولنے لگتا ہے ۔ "

اور اگر تم ذرا سوچو گی تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کھولتا تمہارا خون ہے ' تمہاری عقل نہیں ۔ "

"بہت اچھا ۔ میں سمجھ گئی ۔ "

22 ۔ بار کلی

* * *

... آتش بار آفتاب کے گرد پریشان کن رفتار کے ساتھ گھومنے والے سیارے کی طرح ...

البرٹو اٹھا اور اس کھڑکی کی جانب چلا گیا جس کا رخ شہر کی طرف تھا ۔ سوفی نے اس کی تقلید کی اور اس کے پیچھے پیچھے آ گئی ۔ جب وہ وہاں کھڑے قدیم الوضع مکانوں کا جائزہ لے رہے تھے ، چھتوں کے اوپر ایک چھوٹا طیارہ اڑتا نظر آیا ۔ اس کی دم کے ساتھ خاصا لمبا پھریرا بندھا ہوا تھا ۔ سوفی کا خیال تھا کہ یہ شاید کسی برائے فروخت چیز یا مقامی تقریب (از قسم راک موسیقی کی محفل) کا اشتہار ہے ۔ لیکن جب طیارہ قریب آیا اور اس نے اپنا رخ تبدیل کیا ، اسے پھریرے پر بالکل ہی مختلف پیغام دکھائی دیا : ہلڈے ، سالگرہ مبارک !

"بن بلایا مہمان ۔ " البرٹو کا واحد تبصرہ تھا ۔

جنوب کی طرف واقع پہاڑیوں سے بھاری سیاہ بادل شہر پر امنڈنے لگے تھے ۔ چھوٹا طیارہ تاریک فضا میں غائب ہو گیا ۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ طوفان باد و باراں آ رہا ہے ۔ " البرٹو نے کہا ۔

"چنانچہ میں بس پکڑتی ہوں اور گھر چلی جاتی ہوں ۔ "

"مجھے یہی امید رکھنا چاہیے کہ اس (طوفان) میں میجر کا ہاتھ نہیں ۔ "

"وہ قادر مطلق نہیں ۔ یا ہے ؟ "

البرٹو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ واپس چل پڑا اور کافی کی میز کے سامنے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

"ہمیں بارکلی کے متعلق گفتگو کرنا ہو گی۔" اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

سوفی پہلے ہی اپنی نشست سنبھال چکی تھی۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ اپنے ناخن چبا رہی ہے۔

"جارج بارکلی (Berkeley) آئرلینڈ کا بشپ تھا۔ وہ 1685 تا 1753 زندہ رہا۔" البرٹو نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ اس کے بعد اس نے چپ سادھ لی اور کافی دیر یونہی بیٹھا رہا۔

"بارکلی آئرش بشپ تھا۔۔۔" سوفی نے لقمہ دیا۔

"لیکن وہ فلسفی بھی تھا۔۔۔"

"جی؟"

"اسے محسوس ہو رہا تھا کہ مروج فلسفہ اور سائنس نصرانی طرز حیات کے لیے خطرہ بن چکے ہیں۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ عیسائیوں کا تمام فطرت کے خالق اور محافظ کی حیثیت سے خداوند کی ذات پر جو ایمان ہے' اس میں دراڑیں ڈالنے میں مادیت پرستی بھی' جو ہر شعبہ حیات میں نفوذ کرنے لگی تھی' ان دونوں سے پیچھے نہیں۔"

"کیا اس کا واقعی یہی خیال تھا؟"

"اس کے باوجود تجربیت پسندوں میں بارکلی سب سے زیادہ اپنی بات پر ثابت قدمی سے قائم رہنے والا شخص تھا۔"

"کیا اس کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ ہم دنیا کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے جو ہمارے حواس ہمیں بتاتے ہیں؟"

"اس سے زیادہ۔ بارکلی کا دعویٰ تھا کہ دنیاوی اشیا واقعی وہی کچھ ہیں جس کا ہم (حواس کے ذریعے) ادراک کرتے ہیں لیکن وہ 'اشیا' نہیں ہیں۔"

"آپ کو اس کی وضاحت کرنا ہو گی۔"

"تمہیں یاد ہو گا کہ لوک نے اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی کہ ہم اشیا کے 'ثانوی خواص' کے بارے میں بیان بازی نہیں کر سکتے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سیب سبز اور ترش ھے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ادراک یہی ہوتا ہے کہ یہ سبز اور ترش

ہے۔ لیکن لوک نے یہ بھی کہا تھا کہ کثافت ، کشش ثقل اور وزن جیسے 'بنیادی خواص ' کا واقعی ہمارے گردوپیش کی دنیا سے تعلق ہے ۔ دراصل خارجی حقیقت مادی ماوا (material substance) ہے ۔"

"ہاں 'یہ مجھے یاد ہے اور میرا خیال ہے کہ لوک نے اشیا کی جو تقسیم کی تھی ، وہ اہم تھی ۔"

"ہاں ،سوفی ،بشرطیکہ معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا ۔"

"اپنی بات جاری رکھیں ۔"

"دیکارت اور سپینوزا کی طرح لوک کا بھی ایمان تھا کہ مادی دنیا حقیقت ہے۔"

"جی؟"

"بالکل یہی وہ بات ہے جس پر بارکلی کو اعتراض تھا اور اس نے یہ کام تجربیت پسندوں کی منطق کی مدد سے ہی کیا ۔ اس کا کہنا تھا کہ واحد اشیا جو موجود ہیں ، صرف وہ ہیں جن کا ادراک ہم حواس سے کرتے ہیں ۔لیکن ہمیں 'مواد ' (material) یا 'مادے ' (matter) کا ادراک نہیں ہو پاتا ۔ہم چیزوں (things) کا ادراک مرئی اشیا (tangible objects) (1) کے طور پر نہیں کرتے ۔ یہ مفروضہ باندھ لینا کہ ہر اس چیز کا جس کا ہم ادراک کرتے ہیں ' اپنا اساسی 'ماوا ' (substance) ہوتا ہے ' جلدبازی سے نتائج اخذ کرنے کے مترادف ہے ۔ہمیں اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا جس پر اس دعوے کی بنیاد رکھی جا سکے ۔"

" کیا احمقانہ بات ہے ! دیکھیں !"سوفی نے اپنی پوری قوت سے میز پر مکا مارا اور کہا: " کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میز واقعی میز ہے اور یہ میز مادے اور مواد دونوں پر مشتمل ہے ۔"

" تمہیں یہ کیسا محسوس ہوا؟"

" مجھے کسی سخت چیز کا احساس ہوا ۔"

" تمہیں اپنے رگ و پے میں کسی سخت چیز کا تحس (sensation) ہوا لیکن تم نے میز میں اصل مادہ (matter) محسوس نہیں کیا ۔ اسی طرح تم خواب بھی دیکھ سکتی ہو کہ تم کسی سخت چیز پر ضرب لگا رہی ہو لیکن خواب میں تو سخت چیز نہیں ہوتی 'یا کہہ دو کہ ہوتی ہے ۔"

"نہیں ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ خواب میں نہیں ہوتی ۔"

"کسی شخص کو عمل تنویم کے ذریعے بھی حرارت اور برودت ' پیار کی تھپتھپاہٹ یا مکے کی ضرب جیسی چیزیں محسوس کرائی جاسکتی ہیں۔"

"لیکن میز اگر سخت نہیں ' پھر مجھے اس کا احساس کیوں ہوا؟"

'بارکلی کسی ' روح ' (a spirit) میں یقین رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہمارے خیالات کی کوئی نہ کوئی علت (cause) ہوتی ہے : یہ علت ہمارے شعور سے ماورا ہے لیکن اس علت کی نوعیت (nature) مادی نہیں ہوتی۔ یہ روحانی (spiritual) ہوتی ہے۔"

سوفی ایک بار پھر اپنے ناخن چبانے لگی تھی۔

البرٹو کی بات جاری رہی : "بارکلی کے مطابق میری روح (soul) میرے خیالات کی علت بن سکتی ہے —— بالکل اسی طرح جب میں کوئی خواب دیکھتا ہوں —— لیکن صرف کوئی دوسرا منشا (will) یا سپرٹ ان خیالات کی علت بن سکتی ہے جو 'corporeal' (مادی یا طبعی) دنیا کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہر چیز اس سپرٹ (روح) کے باعث ہے جو 'ہر چیز میں ہر چیز ' کی علت ہے اور جس پر ' تمام اشیا مشتمل ہوتی ہیں۔' اس نے کہا تھا۔"

"وہ کس 'سپرٹ' (روح) کی بات کر رہا تھا؟"

"بارکلی البتہ خدا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ کہتا تھا : 'ہم مزید برآں دعویٰ کرسکتے ہیں کہ انسان کی موجودگی (existence) کی نسبت ہم خدا کی موجودگی کا کہیں زیادہ بین انداز سے ادراک کرسکتے ہیں۔'"

"گویا یہ بھی یقینی نہیں کہ ہم موجود ہیں۔"

"ہاں اور نہیں۔ ہر وہ چیز جو ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں 'بارکلی کے الفاظ میں ' خدا کی قوت کی تاثیر (effect) ہے ' کیونکہ خدا 'بے تکلفانہ انداز سے (intimat-ely) ہمارے شعور میں موجود (present) ہوتا ہے اور ہمارے ان خیالات اور ادراکات کو بکثرت وجود میں لانے کا سبب بنتا رہتا ہے جن کا ہمیں مسلسل تجربہ ہوتا رہتا ہے۔' ہمارے گردوپیش کی ساری دنیا اور ہماری تمام زندگی کا وجود خدا کی ذات میں ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو موجود (exist) ہے ' اس کی واحد علت وہی ہے۔ ہم صرف خدا کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔"

"اگر میں نرم سے نرم الفاظ استعمال کروں تو بھی میں یہی کہوں گی کہ میں چکرا گئی ہوں۔"

"چنانچہ ' ہونا یا نہ ہونا ' ('to be or not to be') مکمل سوال نہیں ہے ۔
سوال یہ بھی ہے کہ ہم کون ہیں ۔ کیا ہم واقعی گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں ؟ کیا ہماری دنیا حقیقی اشیا پر مشتمل ہے ـــــ یا ہمیں دماغ نے محصور کر رکھا ہے ؟"

سوفی اپنے ناخن چباتی رہی ۔

البرٹو کا سلسلہ کلام جاری رہا ۔ "مادی حقیقت واحد چیز نہیں تھی جس پر بارکلی اعتراض اٹھاتا رہا ۔ وہ یہ استفسار بھی کر رہا تھا آیا ' زمان ' اور ' مکاں ' کا کوئی مطلق یا آزادانہ وجود ہے ؟ زمان و مکاں کا ہمارا اپنا ادراک بھی محض ذہن کی اختراع ہو سکتا ہے ۔ ضروری نہیں کہ ہمارے ایک یا دو ہفتے خدا کے نزدیک بھی ایک یا دو ہفتے ہوں ۔ ۔ ۔"

"آپ نے کہا تھا کہ بارکلی کے نزدیک یہ روح (سپرٹ) جس میں ہر چیز موجود ہے ، نصرانی (کرسچین) خدا ہے ۔"

"ہاں ۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کہا تھا ۔ لیکن ہمارے لیے ۔ ۔ ۔"

"ہمارے ؟"

"ہمارے لیے ـــــ میرے لیے اور تمہارے لیے ـــــ یہ ' منشا ' یا ' روح ' (سپرٹ) ' جو ' ہر چیز میں ہر چیز کی علت ہے ' ہلڈے کا باپ ہو سکتا ہے ۔"

سوفی کی آنکھیں بے یقینی سے کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ تاہم اس کے ساتھ ہی اس پر کوئی حقیقت بھی منکشف ہونے لگی ۔

"کیا آپ واقعی یہی سمجھتے ہیں ؟"

"مجھے کوئی دوسرا امکان نظر نہیں آتا ۔ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے ' اس کی شاید یہی قابل قبول وضاحت ہے ۔ یہ تمام پوسٹ کارڈ اور دیگر علامتیں ' جو یہاں وہاں بلکہ ہر جگہ ملتی رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ہرمیز کا انسانوں کی طرح بات کرنا ۔ ۔ ۔ خود میری زبان کا غیر ارادی طور پر غوطہ کھانا ۔ ۔ ۔"

"میں ۔ ۔ ۔"

"ذرا سوچو ہلڈے ' میں تمہیں سوفی کہتا رہا ہوں ! حالانکہ اس ساری مدت کے دوران میں مجھے بخوبی معلوم تھا کہ تمہارا نام سوفی نہیں ہے ۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ اب آپ یقیناً پراگندہ خیالی کا شکار ہو رہے ہیں ۔"

"ہاں ' بیٹی ' میرا دماغ چکر پر چکر کھا رہا ہے ' بالکل اسی طرح جس طرح کوئی پریشان کن رفتار سے گھومنے والا سیارہ کسی آتش بار آفتاب کے گرد چکر کاٹ رہا ہو ۔"

"اور وہ آفتاب ہلڈے کا باپ ہے؟"

"ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو۔"

"گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ہمارے لیے ایک قسم کا خدا ہے؟"

"اگر میں پوری ایمانداری سے کام لوں تو مجھے ہاں ہی میں جواب دینا ہوگا۔ اسے اپنے آپ پر شرم آنا چاہیے!"

"خود ہلڈے کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"سوفی، وہ تو فرشتہ ہے، فرشتہ۔"

"فرشتہ؟"

"ہلڈے ہی تو ایک ہستی ہے جس کی طرف یہ 'روح' (سپرٹ) رجوع کرتی رہتی ہے۔"

"تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ البرٹ کنیگ ہمارے بارے میں ہلڈے کو بتاتا رہتا ہے؟"

"یا ہمارے متعلق لکھتا رہتا ہے۔ ہم صرف اتنا سیکھ سکے ہیں کہ ہم خود اس مادے کا ادراک نہیں کر سکتے جس سے ہماری حقیقت کی تعمیر ہوئی ہے۔ ہم یہ نہیں جان سکتے کہ ہماری خارجی حقیقت کی تعمیر آوازوں کی لہروں سے ہوئی ہے یا کاغذ اور تحریر سے۔ بارکلی کے مطابق ہم صرف اتنا جان سکتے ہیں کہ ہم روح (سپرٹ) ہیں۔"

"اور ہلڈے فرشتہ ہے..."

"ہاں" ہلڈے فرشتہ ہے۔ بس اسی پر بات ختم ہو جانا چاہیے۔ سال گرہ مبارک، ہلڈے۔"

اچانک کمرا نیلگوں روشنی سے لبریز ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد انہیں رعد کی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور سارا مکان لرز اٹھا۔

"مجھے جانا ہوگا۔" سوفی نے کہا۔ وہ اٹھی اور باہر کی جانب کھلنے والے دروازے کی طرف بھاگ پڑی۔ جب وہ باہر نکل رہی تھی، ہیش دالان میں ہرمیز ہڑبڑا کر جاگ گیا۔ سوفی کے ذہن میں خیال آیا کہ اس نے کتے کو "آپ سے پھر ملاقات ہوگی، ہلڈے" کہتے سنا ہے۔

سوفی سرپٹ سیڑھیاں پھلانگتی باہر گلی میں بھاگ گئی۔ گلی سنسان تھی۔ اور اب چھاجوں پانی برسنے لگا تھا۔

اس موسلا دھار بارش میں ایک دو کاریں زور آزمائی کر رہی تھیں لیکن کسی بس کا دور دور تک نام و نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوفی نے دوڑتے دوڑتے مین سکوائر پار کیا کیا اور اب وہ شہر میں دیوانہ وار بھاگی جا رہی تھی۔ دوڑنے کے دوران میں اس کے ذہن میں ایک ہی خیال بار بار گردش کر رہا تھا: "کل میری سال گرہ ہے! پندرھویں سال گرہ سے ایک روز پہلے یہ احساس کرنے سے کہ زندگی محض خواب ہے، ذہن میں مزید تلخی نہیں بھرتی؟ یہ تو بالکل وہی بات ہوئی کہ آپ نے خواب میں دس لاکھ کا انعام جیتا مگر جب رقم وصول کرنے چلے، آپ کی آنکھ کھل گئی۔"

اس کے جوتوں میں پانی بھر گیا تھا اور ان سے پچر پچر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس نے اسی حالت میں کھیل کا میدان عبور کیا۔ چند منٹ بعد اس نے دیکھا کہ کوئی عورت اس کی جانب بھاگی آ رہی ہے۔ یہ اس کی امی تھی۔ غضبناک بجلی بار بار چمکتی تھی اور آسمان میں دراڑیں پڑ جاتی تھیں۔

جب وہ ایک دوسرے کے قریب پہنچیں، سوفی کی امی نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

"ننھی، یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

"پتا نہیں۔" سوفی کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ "معلوم ہوتا ہے کوئی بھیانک خواب ہے۔"